# زمانہ

جلد ۶۴ — جون ۱۹۳۵ء — نمبر ۶

# سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

(از مسٹر سلیم جعفر)

## اسم آلہ

فارسی میں چند ہی لفظ ایسے ملتے ہیں جو اسم آلہ ہیں اور بذریعہ اشتقاق حاصل کئے گئے ہیں یعنی جو لاحقے لگا کر اسم آلہ بنائے گئے ہیں۔

اس زبان میں اسمائے آلہ دو طرح کے ہیں، (۱) مشتق جنھیں مفرد یا حقیقی کہنا چاہیئے، اور (۲) غیر مشتق جنھیں مرکب یا غیر حقیقی کہنا چاہیئے اور جو اسم و امر کو ترکیب دیکر بنائے گئے ہیں۔

اسم آلہ مشتق میں صرف دو طرح کے لاحقات نظر آتے ہیں، (۱) ہائے ہوز ماقبل مفتوح اور (۲) نون ماقبل مفتوح۔ اِن میں سے پہلی ترکیب سے بنے ہوئے اسمائے آلہ زیادہ ہیں۔ سنسکرت میں کاف ماقبل مفتوح (अक) لگا کر اسم فاعل ترکیبی بنایا جاتا ہے۔ یہ کاف ماقبل مفتوح موجودہ فارسی میں ہائے ہوز ماقبل مفتوح کی شکل میں لفظ "بندہ" میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسم آلہ میں جو ہائے ہوز ہے یہ کاف کی بدلی ہوئی صورت ہے اور اسم آلہ فارسی درحقیقت ایک طرح کا اسم فاعل ترکیبی ہے۔ لیکن اس کا نام اسم آلہ اِس مصلحت سے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ فاعل کا فع[illegible]ر ہوتا ہے۔ سنسکرت میں مادہ تپ (तप) میں ردّ و بدل کرنے کے بعد اسم فاعل ت[illegible] یعنی "تپنے والا" بنتا ہے۔ فارسی میں مصدر کوفتن کا مادّہ "کوپ" (कुप) ہے۔ [illegible] [illegible]ج[illegible] نویک بنتا ہے۔ یہی لفظ تغیر صوتی [illegible]

کو بہ بن گیا۔

اَن اور اِن سے بھی سنسکرت میں اسم فاعل ترکیبی بنتے ہیں۔ پروتیز یدن سے جو پرویزن نکلا ہے اُس میں اِن دونوں لاحقوں میں سے ایک ضرور ہے۔ ورنہ اگرچہ اسم آلۂ حقیقی ہے لیکن یہ عربی کے مادہ وزن سے بنا ہے۔ یہ بھی ایک مزید ثبوت اس امر کا ہے کہ فارسی میں مادہ ہی مخزنِ اشتقاق ہے اور وہ غیر زبان کے لفظ لے لینے کے بعد انھیں بے تکلف اپنے قواعد کے تحت میں لے آتی ہے۔

اسم اور امر سے جو اسم آلہ بنایا جاتا ہے وہ دراصل اسم فاعل ترکیبی ہے اور اسی کے اصول کے مطابق بنا ہے جس کے مطابق کہ قلعہ دار اور عنبر آگیں بنائے گئے ہیں۔

## اسم فاعل ترکیبی

فارسی میں جو طریقے اسم فاعل ترکیبی بنانے کے رائج ہیں وہ ہو بہو سنسکرت کی نقل ہیں۔ لیکن فارسی کا قواعد نویس ان قاعدوں کی اُس تقسیم سے قاصر ہے جو سنسکرت کے قواعد نویس نے کی ہے مضمون کے شروع ہی میں کہا جا چکا ہے کہ سنسکرت میں مادہ ایک مخزن ہے جس سے اسم و فعل وغیرہ سب کچھ بنا سکتے ہیں۔ فارسی قواعد نویس اس کا قائل نہیں۔ وہ ہر لفظ کو ایک قدیم و سالم لفظ مان کر آگے بڑھتا ہے اور جو کچھ اس سالمے میں گھٹایا بڑھایا گیا ہے اُسے بتاتا ہے۔ اگرچہ اس کی اس لاعلمی سے تحصیل زبان کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن طالب علم حقیقت سے دُور رہتا اور ایک ایسی منزل سے ابتدا کرتا ہے جو ابتدائی نہیں بلکہ درمیانی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سنسکرت کے مطابق اسم فاعل ترکیبی کی تقسیم بتائی جائے۔

اسم فاعل ترکیبی بنانے کے دو عام طریقے ہیں:-

(۱) اسم مفرد یعنی وہ اسم جو مادے میں ترمیم کرکے اس کے آخر میں لاحقات لگا کر بنایا جاتا ہے

(۲) اسم مرکب (समास) یعنی وہ اسم جو دو یا دو سے زیادہ اسموں کے ملانے سے بنتا ہے لیکن اس ترکیب سے جو اسم بنتے ہیں وہ ہمیشہ اسم ذات ہی نہیں ہوتے کبھی اسم صفت بھی ہوتے ہیں۔

اسم مفرد دو طرح کے لاحقے لگا کر بنایا جاتا ہے، ایک طرح کے لاحقے (कृत प्रत्यय) وہ ہیں جو مادہ یا اُس کی ترمیم کردہ صورت میں لگائے جاتے ہیں، اور دوسری قسم میں وہ لاحقے داخل ہیں (तद्धित - प्रत्यय) جو مادے یا اُس کی ترمیم کردہ صورت میں قسم اول کے لاحقے لگانے کے بعد آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہنا چاہیئے کہ قسم اول میں صرف ایک لاحقہ لگایا جاتا ہے اور قسم

دوم میں دو۔

اسم مرکب کی چھ قسمیں مانی گئی ہیں، لیکن ان سب کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ آگے جاکر اسم فاعل ترکیبی کے بنانے کے طریقوں کی تقسیم کی جائیگی۔ وہیں یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ کونسا قاعدہ کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

فارسی میں دونوں قسم کے لاحقے موجود ہیں۔

لاحقات قسم اول = آ (आ) - آن (आन) وَر (वर) اُور (ऊर) - آنک[1] (आनक)

آر (आर) = دانا - باران - نامور - گنجور - غمناک - خریدار

لاحقات قسم دوم = وند (वत) - مند - مان (मत) - بد[1] (पति) - م (म) = پولادوند - شتربان - ارجمند - پشیمان - سپہبد - یکم۔

(۱) مرکب اسم جو اسم فاعل ترکیبی کا کام دیتے ہیں ان کی کثیر تعداد مرکب تابع شخصی (तत्पुरुष) کے تحت میں آتی ہیں۔ یہ یعنی مرکب تابع = (۱) اسم اور اسم مفعول اور (۲) دو اسموں کے ملانے سے بنتا ہے لیکن اس قسم کی تقسیم بلحاظ معنی کی گئی ہے۔ مثلاً اسم اور اسم مفعول سے جو مرکب بنتے ہیں۔

(ا) ان میں بعض اوقات تعلق مفعولی ہوتا ہے۔ یہ تابع مفعولی ہیں جیسے (स्वर्ग प्राप्त:) (وہ شخص جسے جنت مل گئی ہو) اس کی فارسی مثالیں زبان بریدہ۔ عناں گسستہ وغیرہ ہیں۔

(ب) بعض کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدور فعل کا اسم باعث و علت ہوا ہے، اس کو تابع سببی کہنا چاہیئے۔ مثلاً (लोभ मोहित) (اسیر حرص یا جس کا دل لالچ نے موہ لیا) قحط زدہ۔ زراندود وغیرہ اس کی مثالیں سمجھنا چاہیئے۔

(ج) غرض و غایت بھی یہی مرکب ظاہر کرتا ہے اور اس کو مرکب غایتی کہہ سکتے ہیں۔ [illegible] (پناہ کے لئے آیا ہوا)۔ یہ مرکب خود سنسکرت میں بہت کم آتا ہے اس لئے اس کی فارسی کی مثالیں الشاذ کالمعدوم کا مصداق ہیں۔

(د) کبھی اس سے انتقال مکان کا کام لیا جاتا ہے۔ اس صورت میں تابع انتقالی اس کا نام ہے

---

[1] میرا خیال ہے کہ فارسی کا "ناک" اسی "آنک" کی مسخ شدہ صورت ہے۔ صرف حرفوں کی تقدیم و تاخیر ہے جس کی مثالیں فارسی میں ناپید نہیں ہیں۔ "بھیانک" اور "ہولناک" دونوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "آنک" اور "ناک" دونوں لفظ ایک ہی معنی میں آتے ہیں

[1] "وت" اور "مت" دونوں میں "ت"۔ "د" سے بدلی ہوئی ہے اور ان کے پہلے "ن" سنسکرت کے قاعدہ کے مطابق بڑھا ہوا ہے۔ ہاں "آن" - "وت" سے "مان" - "مت" سے نکلا ہے۔ سنسکرت میں جن اسموں کے آخر میں "وت" ہوتا ہے بوقت تصریف "وآن" - اور "مان" سے بدل جاتے ہیں۔

[1] اس لاحقہ سے بنے ہوئے لفظوں کو سنسکرت کے قاعدہ کے رو سے اسمائے مرکب میں داخل کرنا چاہیئے۔

موزوں نام ہے۔ مثال:- राज-भ्रष्ट (سلطنت سے گرا ہوا یعنی معزول)۔ فارسی اس قسم کی ترکیبوں سے کام لیتی ہے تو صرف حرف جر۔ "از" بڑھا کر ایک مرکب غیر مفید تیار کرتی ہے مثلاً ہوش از سر پریدہ دل از دست رفتہ وغیرہ۔

(ھ) دو اسموں سے بنتا اور دونوں میں تعلق اضافی ظاہر کرتا ہے، اس لئے اس کا نام تابع اضافی رکھنا چاہیئے۔ سنسکرت میں بکثرت آتا ہے (जन्म स्थान) (جنم کی جگہ۔ جائے پیدائش)۔

(و) تابع ظرفی وہ مرکب اسما ہیں جو زمان و مکان پر دلالت کریں۔ مثلاً - ग्राम वासी (گاؤں میں رہنے والا)۔ درحقیقت اس قسم کے مرکبات میں ایک لفظ ایسا ہوا کرتا ہے جو مکان یا زمان پر دلالت کرتا ہے۔

(ز) اب تک کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکبات ناقص یا توابع صرف دو ہی دو لفظوں سے بنتے ہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ کئی کئی لفظ ملا کر بھی بنائے جاتے ہیں، اور ان میں مذکورہ بالا پانچ تعلقات میں سے کوئی سا تعلق ہو سکتا ہے۔ مثلاً : रथमध्यस्थः (رتھ کے بیچ میں کھڑا ہوا)

۲۔ مرکبات ناقص کی ایک قسم تابع غیر منصرف بھی ہے۔ ( अव्ययी भाव: ) یہ کسی اسم پر لاحقہ لگا کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے प्रतिनिशम् (ہر رات)

۳۔ تابع وصفی ( कर्मधारय ) جو کسی اسم صفت اور اسم کو ملا کر بنایا جائے۔ یہ صفت خواہ کسی ... کی ہو جیسے चिरमित्रम् (پرانا دوست)۔ اس تابع وصفی کی ایک خاص صورت اور ہے اور وہ یہ کہ کبھی کبھی ایک اسم کو دہراتے اور دونوں کو اس طرح ملاتے ہیں کہ پہلے جزو کے حرف آخر کو ممدودہ ( दीर्घ ) کرکے دوسرے جزو کے حرف آخر کے پہلے حرف "اِی" ( इ ) بڑھا دیتے ہیں۔ اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں "آپس کا"۔ ایک دوسرے کا" مقابل جیسے नरवानरिव (ناخن کے مقابل ناخن)۔

۴۔ سنسکرت میں مرکب عددی ( द्विगु ) یوں بنایا جاتا ہے کہ اسم سے پہلے ایک اسم عدد لاتے ہیں جیسے त्रिदिनम् (تین دن)۔

اب فارسی کے اسم فاعل ترکیبی دیکھئے۔

(۱) امر کے آخر میں الف اور نون لگا کر جو اسم فاعل ترکیبی بنائے جاتے ہیں وہ تو اسم حالیہ ہی ہیں اور اسم حالیہ کے تحت میں ان کا ذکر آچکا ہے۔

(۲) وہ مرکب ناقص جو دو اسموں کے ملانے سے بنتا ہے اور جس میں سے لفظ "مثل" اس کی

ترکیب تشبیہی سے محذوف ہوتا ہے جیسے ۔ ماہ رخ ۔ نرگس چشم وغیرہ یہ تابع شخصی کی ایک قسم ہے اس کی مثال سنسکرت میں یہ ہے ۔ चन्द्राकृति (وہ جس کی شکل چاند کی سی ہے ۔)

(۳) فارسی میں سنسکرت کے تابع غیر منصرف کی مثالیں ۔ مالا مال ۔ دوشا دوش ۔ زنگا رنگ ہیں ۔

(۴) سنسکرت میں کار اور کر ۔ دونوں بطور لاحقات استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً घटकार: (گھڑے بنانے والا ۔ کمہار) اور भास्कर: (چمکنے والا یعنی سورج) یہی دونوں لاحقے فارسی میں گار ۔ اور ۔ گر ۔ ہیں جو خدمت گار اور زرگر میں نظر آتے ہیں ۔

(۵) قلعہ دار ۔ جہاندار وغیرہ میں ۔ دار ۔ धार (دھار) کا ہم معنی اور مادہ धृ (بمعنی ۔ رکھنا ۔ پکڑنا ۔) سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ اسم فاعل ترکیبی تابع شخصی کے تحت میں آتا ہے ۔ سنسکرت کی مثال یہ ہے ۔ कर्ण-धार (ملاح)

(۶) ندہ ۔ اسم فاعل کے تحت میں بحث کی جا چکی ہے ۔

(۷) سنسکرت کا "دھان" (धान) جس کے معنی ہیں ظرف ۔ مقام ۔ وغیرہ ۔ فارسی میں آکر دان ہوگیا ۔ سنسکرت کی مثال अंगारधानी (انگیٹھی) فارسی کی مثال ۔ گلدان ہے

(۸) سرلشکر ۔ نبات ریزہ (قلب اضافت سے بنا ہے ۔) شاہ جہاں (فک اضافت سے) یہ تینوں ایک ہی طرح کے لفظ ہیں ۔ قواعد فارسی میں خواہ مخواہ موشگافی کی گئی ہے ۔ یہ حقیقتہً تابع شخصی اضافی ہے ۔

(۹) ہوش از سر پریدہ وغیرہ تابع شخصی انتقالی کی مثالیں ۔ فارسی میں حروف جر کی مدد سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے ۔

(۱۰) کہتے ہیں کہ گمراہ ۔ اور ۔ جگر خون میں اسم مفعول محذوف ہے اور اس کی تشریح و توضیح یوں کی جاتی ہے ۔ گم کردہ راہ ۔ خوں کردہ جگر ۔ لیکن جگر خوں ۔ کو تابع شخصی (तत्पुरुष) کی ایک قسم ماننا چاہئیے ۔ کیونکہ سنسکرت میں चन्द्राकृति: کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں "وہ جس کا حسن مانند ماہ ہے"۔ اس صورت میں جگر خون کے معنی ہوں گے "وہ جس کا جگر مانند خون ہے"۔ گمراہ ۔ تابع وصفی (कर्मधारय) کی قسم میں داخل ہے ۔ अल्प शक्ति: (وہ جس کی قوت کم ہے یعنی کمزور) اسی طرح ۔ گمراہ ۔ کے معنی ہونگے وہ جس کا راستہ گم ہوگیا ۔ یا راہ گم کرنے والا ۔

ہوش از سر پریدہ وغیرہ کو اسم فاعل ترکیبی میں شامل کر لیا گیا ہے لیکن ان کو درحقیقت مرکبات ناقص صفاتی (Adjectival phrases) کہنا چاہئیے ۔

## ترکیب مفعولی یا صفت

کہا جاتا ہے کہ صیغۂ ماضی مطلق کبھی اسم مفعول کے معنی بھی دیتا ہے مگر اتفاقاً ...... جو ماضی کا صیغہ آگیا وہی آگیا۔ اس کے معنی یہ لینا چاہیئے کہ زبان میں ایک اصول موجود ہے جو اب قلیل الاستعمال ہے، ممکن ہے کہ کبھی کثیر الاستعمال ہو۔ اِس بنا پر یہ کہنا جادۂ اعتدال سے تجاوز کرنا نہیں کہ اسم اور ماضی کی ترکیب سے جو صفت بنائی جاتی ہے اُسے یا تو ترکیب مفعولی نہیں کہہ سکتے یا ترکیب مفعولی مانیں تو پھر اس ماضی کو اسم مفعول سمجھیں۔ مثلاً خار بست (کانٹوں کی باڑھ) میں "بست" کو "بستہ" کا مرادف تسلیم کرنا چاہیئے۔ اگر یہ خیال قرین صحت ہے تو ترکیب مفعولی کے جتنے قاعدے بتائے گئے ہیں اُن میں سے ایک کم ہو جائے گا۔ اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ "غبار آلود" وغیرہ کو "غبار آلودہ" مانا گیا ہے، اور "آلودہ" میں سے "ہ" محذوف تصور کی گئی ہے۔

"زباں بریدہ" تلیح مخفی کی مثالوں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ دانستہ کیا گیا ہے کیونکہ اس باب میں قواعد نویس کے خیال میں گنجلک معلوم ہوتی ہے۔ اسم فاعل ترکیبی کے بیان میں کہتا ہے "اسم مفعول کسی جملہ میں ترکیب پایا ہوا مثلاً "مرد جہاں دیدہ" اور ترکیب مفعولی یا صفت کے قاعدوں میں ایک قاعدہ یہ بتاتا ہے کہ ایک مفعول مشتق" یا صفت مشبہ اور ایک اسم کی ترکیب دینے سے مثلاً "تیغ جفا خوردہ" قطع نظر اس سے کہ دونوں عبارتوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں۔ صرف الفاظ اور اسلوب کلام میں تفاوت ہے" مرد جہاں دیدہ" کا آخری لفظ اپنے محل وقوع کی وجہ سے کوئی خاص بات پیدا نہیں کرتا بلکہ ایک لفظ سے ملکر معنی صفت پیدا کرتے ہیں۔ اصلی قاعدہ صرف یہ ہے کہ" ایک اسم مفعول اور ایک اسم کے ملانے سے معنی صفت حاصل ہوتے ہیں" اور بس۔ پہلی مثال میں "اسم مفرد" ہے اور دوسری میں "مرکب" پہلی میں صفت مشبہ اور موصوف دونوں موجود ہیں اور دوسری میں موصوف "محذوف" اور صفت موجود یعنی اسم مرکب مع مفعول۔ اس کے سوا دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

---

### رُباعی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

ہر چند بیدار کو سوتے دیکھا ہنسنے والوں کو تھک کے روتے دیکھا
آخر آخر ہر اک رنگینی کو اپنے ہی لہو میں غرق ہوتے دیکھا

دیکھیے عشق ہی عشق جلوہ گر ہے۔ نیچرل نظمیں یا قومی نظمیں لکھنے والے ہمارے یہاں بہت کم ہیں فارسی مثنویاں اگرچہ زیادہ تر عشقیہ ہیں لیکن ان میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے اور ان میں ہرگز ایسی ہوسناکی نظر نہیں آتی جیسی کہ ہماری مثنویاں جا بجا پیش کرتی ہیں۔ بقول مولانا حالی مثنوی تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے کیونکہ غزل یا قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ مسدس۔ ترجیع بند اور ترکیب بند میں بھی اسی قسم کی دوسری دقتیں سدّ راہ ہوتی ہیں لیکن مثنوی میں مسلسل خیالات ادا کرنے کی بہت گنجایش ہے۔ تاریخ قصہ، اخلاق، تصوف، فلسفہ غرض ہر چیز اس صنف میں ادا ہو سکتی ہے۔ مگر اُردو میں چند چھوٹی چھوٹی عشقیہ مثنویوں کے علاوہ اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں آجتک کوئی چھوٹی بڑی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ ہمارے شعرا نے مثنوی کو بھی غزل کی طرح عشقیہ افسانے لکھنے کے لئے مختص کر دیا ہے ؏

غالباً اُردو زبان میں سب سے پہلی مثنوی میر تقی میر نے لکھی ہے۔ اُنھوں نے کئی مثنویاں تصنیف کی ہیں جو چھوٹی چھوٹی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ دَور اُردو کا ابتدائی زمانہ تھا اس لئے اُس وقت اور آجکل کی زبان میں ایک ما بہ الامتیاز فرق ہو گیا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مثنویاں اب ہم کو زیادہ پسند خاطر نہیں معلوم ہوتیں میر صاحب مثنوی شعلۂ عشق میں لکھتے ہیں۔

کسی چشم نے تجھ کو جادو کیا مرے جامِ عشرت کو "لوہو" کیا

یہاں پر "لوہو" کا لفظ بجائے لہو استعمال ہوا ہے۔ ایک دوسری مثنوی میں اُنھوں نے لکھا ہے:-

کام میں عشق اپنے یکتا ہے ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے

یکّا بجائے یکتا استعمال کیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کے بہت سے الفاظ میر صاحب کی مثنویوں میں موجود ہیں جو آجکل غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مثنویوں میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔

میر صاحب کے بعد میر حسن نے مثنوی سحرالبیان لکھی جو اُردو لٹریچر میں آجتک بے نظیر ہے

؏ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے مثنوی گلزار ابراہیم، میر حسن کی مثنوی رموز العاشقین، شاہنامہ اُردو اور متاخرین مصنفین کے جنگنامے وغیرہ نہیں دیکھے۔ (ا-ز)

میر حسن خود اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

مصنف نے اس میں ہرگز کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں کی بلکہ واقعیت کا اظہار کیا ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن کا زمانہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ لیکن میر حسن نے اپنی مثنوی نہایت صاف اور سلیس عبارت میں نظم کی ہے اگرچہ اس میں بھی بعض جگہ ایسے الفاظ موجود ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ کانوں کو ناگوار ہونا درکنار محسوس تک نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی اردو ادب میں لاجواب ہے۔ اس مثنوی کے ساٹھ ستر برس بعد نواب مرزا شوق نے کئی مثنویاں لکھیں اور اُن کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم تصنیف کی لیکن ہر دو اصحاب میر حسن سے زیادہ بہتر اضافہ اردو ادب میں نہ کر سکے۔ بیشک نواب مرزا شوق کے یہاں بھی زبان کی صفائی اور دلکشی موجود ہے لیکن وہ زیادہ قابل تعریف اس وجہ سے نہیں کہ میر حسن کے ساٹھ ستر سال بعد زبان بہت کافی منجھ چکی تھی۔ لہذا شوق کے لئے اپنی مثنوی کا صاف زبان میں نظم کرنا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ برخلاف اس کے میر حسن کو یقیناً دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ سنا گیا ہے کہ میر انیس کا بھی ارادہ تھا کہ ایک مثنوی لکھیں اور اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا تھا لیکن درمیان میں خیال آیا کہ دادا جان کی مثنوی دیکھ لینی چاہیئے۔ مثنوی پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم ہوئی کہ میں اس سے زیادہ بہتر زبان نہ لکھ سکونگا لہذا وہ ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ اور ان کی مثنوی ناتمام رہ گئی۔ میر انیس مسلمہ طور پر زبان کی نزاکت اور اشعار کی روانی میں مشہور ہیں۔ لیکن جب انیس جیسے شاعر کی بھی سحر البیان کے متعلق یہ رائے ہو تو مثنوی کے افضل ہونے میں شبہ کی کیا گنجایش ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ سحر البیان کے قصہ سے ظاہر ہے یہ افسانہ محض فرضی ہے اور ہرگز کوئی اصلیت نہیں رکھتا کیونکہ بعض باتیں اس افسانہ میں ایسی ہیں جو قرین قیاس نہیں لیکن میر حسن نے اپنے زمانہ کے نوابوں اور شاہزادوں کی حالت کا نقشہ نہایت صحیح کھینچا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال سے مسلمانوں پر بالعموم اور شاہزادوں اور نوابوں پر بالخصوص عیش و عشرت کی دُنیا مسلط تھی۔ ہر طرف محفل رقص و سرود جمی ہوئی تھی۔ سلطنت کے کاموں سے بادشاہوں کو قطعاً سروکار نہ تھا۔ دلّی کے شہزادے اور اودھ کے نواب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ الغرض میر حسن نے اپنی تصنیف میں قوم کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے

جو نہایت خوب ہے۔ اس مثنوی میں میر حسن نے قریب قریب ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے جو بادشاہوں کے یہاں عام طور پر واقع ہوتی تھیں اور اس بات کا بھی خاص اہتمام کیا ہے کہ جو بات ہو برمحل و باموقع ہو جس کی مثالیں جا بجا موجود ہیں۔

جب بادشاہ نے فقیری اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مشیروں اور وزیروں نے نہایت نیک صلاح دی جس کا اثر بادشاہ کے دل پر ہوا

فقیری جو کیجئے تو دنیا کے ساتھ — نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
کرو سلطنت لیکن اعمال نیک — کہ تا دو جہاں میں رہے حال نیک
یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت — فقیری میں ضائع کرو اسکو مت
عبادت سے اس کشت کو آب دو — کہ واں جا کے خرمن کو تیار لو
رکھو یاد عدل و سخاوت کی بات — کہ اس فیض سے ہے تمھاری نجات

جس وقت بادشاہ کی خدمت میں نجومی حاضر ہوئے اور انھوں نے اس کا زائچہ دیکھا تو کہا :۔

کہا "رام جی کی ہے تجھ پر دیا — چندرماں سا بالک ترے ہوئیگا"

اگر اس خیال کو پنڈتوں کی زبان میں ادا نہ کیا جاتا تو نہایت بے لطفی پیدا ہو جاتی۔ اور اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کوئی پنڈت کھڑا ہوا ہے۔

بادشاہوں کے یہاں سیکڑوں شوخ و شریر کنیزکیں اور لونڈیاں ہوتی ہیں جو عیش و عشرت کے وقت ضرور ایسا کرتی ہونگی ؎

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں — کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے — کہیں واہ وا اور کہیں واچھڑے
کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے — کوئی نہر پر پاؤں بیٹھے ہلائے

پرستان میں پہونچکر جب بے نظیر بیدار ہوا تو اس کو ایک نیا عالم نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کسی اجنبی مکان میں آ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بارہ سال کی عمر کے بچے کو کسی قدر خوف محسوس ہونا چاہیئے۔ لیکن میر حسن نے اس کا بھی خیال کیا کہ بے نظیر اگرچہ بچہ تھا، تاہم وہ بادشاہ کا لڑکا تھا اس لیئے اس کو قطعاً خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ کسی قدر دلیری اور ہمت کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں ہونے چاہیئے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :۔

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ — ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

پھر جب بینظیر نے پری سے دریافت کیا کہ میں یہاں کیسے آیا تو اُس نے یہ راز مخفی رکھتے ہوئے کہ وہ خود ہی اس کو لائی تھی تعجب کا اظہار کیا کہ ایک غیر شخص میرے مکان میں بغیر اجازت کیونکر گھس آیا۔

خدا جانے تو کون یاں ہے کہاں مجھے بھی تعجب ہے ہاں ہے کہاں

بدر منیر کو جب اس کی کنیزوں نے اطلاع دی کہ باغ کے درختوں میں ایک شخص چھپا کھڑا تو وہ کسی قدر سہمتی اور ڈرتی ہوئی بینظیر کو دیکھنے پہونچی۔ میر حسن نے اس وقت کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:۔

خواصوں کے ہاتھوں پہ دھر اپنا ہاتھ عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
کچھ اس خوف سے ہول کھاتی ہوئی دھڑک اپنے دل کی مٹاتی ہوئی

صنف نازک کو فطرتاً شرم کا مادّہ کچھ زیادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں پہلی ملاقات میں ویسے بھی ایک قسم کی جھجک ہوتی ہے۔ چنانچہ بدر منیر اور بینظیر کی پہلی ملاقات کا ذکر اس طرح پر کیا گیا ہے

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے لجائے ہوئے، شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہووے چمن

فیروز شاہ نجم النسا سے جو جوگن کے بھیس میں ملبوس تھی یوں ہمکلام ہوا۔

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے لگا کہنے "جوگی جی آدیس ہے"
"پڑا تم پر ایسا کہو کیا بجوگ لیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ"
"کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے دیا اپنی ہم یہ بھی فرماؤ گے"

پس مقصد کہنے کا یہ ہے کہ بات کرنے کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے۔ ایک جوگی سے اسی طریقہ پر بات کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر فیروز شاہ اس سے ایک عام آدمی کی طرح گفتگو کرتا تو ہرگز لطف نہ آتا۔ حاصل کلام میر حسن نے موقع اور محل کا بےحد خیال رکھا ہے۔ ان کے یہاں ہر چیز میں مناسبت موجود ہے۔

میر حسن نے انسان کی زندگی کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ کو نہایت غور سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان تمام رموز و حقائق سے واقف ہیں جن کا علم شاعر کے لئے نہ صرف اشد ضروری ہے بلکہ ان کا جاننا اس کا فرض اولین ہے۔ اگر وہ اس حالت سے واقف ہیں

جو انسان پر خوشی کے عالم میں گزرتی ہے تو اُن کے یہ نقشہ بھی پیشِ نظر ہے جو درد و غم کے وقت ہمارے روبرو ہوتا ہے۔ اگر وہ لمحاتِ یاس سے باخبر ہیں تو اُمید کی گھڑیوں سے بھی آگاہ ہیں۔ اگر وہ لذتِ وصل سے لطف اندوز ہوئے ہیں تو ہجر و فراق کے صدمات بھی سہہ چکے ہیں۔ الغرض اُنھوں نے ہر چیز کا مشاہدہ غور سے کیا ہے۔ اور اُن کے کلام کی مقبولیت کی یہی وجہ ہے۔ کیونکہ جب وہ کسی چیز کا نقشہ کھینچکر دکھاتے ہیں تو اُن کے یہاں ہرگز کوئی ایسی شئے نہیں ہوتی جو اُن کے نقشہ کو اَن نیچرل یا غیر فطری بنادے۔ میر حسن نفسیاتِ انسانی کو خوب سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے بینظیر کے فراق میں جو حالت بدرِ منیر کی ظاہر کی ہے وہ نہایت نیچرل ہے اور ایسی باتیں ان حالتوں میں اکثر واقع ہوتی ہیں:۔

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی ۔۔۔ درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی ۔۔۔ دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔۔۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ ۔۔۔ اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا ۔۔۔ نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے ۔۔۔ محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" ۔۔۔ تو اُٹھنا اُسے کہہ کے "ہاں جی چلو"
جو پوچھا کسی نے کہ "کیا حال ہے" ۔۔۔ تو کہنا "یہی جو کہ احوال ہے"
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی ۔۔۔ یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھائیے" ۔۔۔ کہا "خیر بہتر ہے منگوائیے"
کسی نے کہا "سیر کیجے ذرا" ۔۔۔ کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا"

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر ۔۔۔ وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
نہفتہ اُسی سے سوال و جواب ۔۔۔ سدا روبرو اس کے غم کی کتاب

انسان کا کسی کے ہجر میں دیوانہ ہوجانا اور ایک خاص جگہ اس کی جستجو کرنا، آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا، زندگی سے بیزار ہوجانا، سونے کے بہانے اُس کا تصور کرنا، تنہائی میں بیٹھکر رونا، طبیعت کی شگفتگی کا جاتا رہنا، کھانے پینے سے قطعاً سروکار نہ ہونا، جہاں بیٹھ جانا گھنٹوں

اسی جگہ بیٹھے رہنا، کسی نے سوال کیا تو جواب دے دیا ورنہ خاموش بیٹھے رہنا۔ الغرض تمام باتیں میر حسن نے ایسی لکھی ہیں جو عام طور پر ان حالتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہیں

میر حسن کی مثنوی کی اس مثال سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ میر حسن نفسیات انسانی اور انسان کی زندگی سے کس حد تک واقف ہیں۔ اب ہم ایک دوسری چیز لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق شاعری مصوری ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے بھی سحرالبیان لاجواب ہے۔ ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر شاعر تصویر کھینچنے سے عاری ہے تو یقین جانیئے اس کی شاعری ناتمام ہے۔ محاکات میں جامی کا یہ شعر اکثر پیش کیا جاتا ہے

لغزش مستانہ در رفتار و جام مے بکف — رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بسامانِ دگر

واقعی شعر نقشہ کشی کے اعتبار سے نہایت مکمل ہے۔ اردو میں میر انیس کو یہ کمال حاصل ہے کہ جس سماں کا نقشہ کھینچتے ہیں وہ ہو بہو نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن میر حسن خود بھی فنِ مصوری میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور یہ سمجھ میں بھی نہیں آسکتا کہ جس شخص کا پوتا اس فن میں کامل ہو تو کیا وہ خود بالکل ہی ناواقف ہوگا۔ باغ کا نقشہ کھینچتے ہوئے میر حسن لکھتے ہیں:۔

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن — کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبّو کے ہر جا نشاں — مدن بان کی اور ہی آن و یاں
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار — ہر اک گل سفیدی میں مہتاب وار
کہیں زرد نسرین کہیں نسترن — عجب رنگ کے زعفرانی چمن
گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
خوشی سے گلوں پر گریں بلبلیں — تعشق کی آپس میں باتیں کریں

اس قسم کی تصویر جیسی میر حسن نے باغ کی یہاں پر کھینچی ہے نسیم کے یہاں اسکا نام بھی نہیں۔

چکبست صاحب بھی میر حسن کے اس جوہر کو مانتے ہیں۔ جو مقدمہ انھوں نے گلزار نسیم کے ساتھ شائع کیا تھا اسمیں اس طرح رقمطراز ہیں "میر حسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ میر حسن سخن آفریں ہیں، انکی زینت حسن صورت سے ہے۔" ہم اپنے دعوے کی تصدیق میں ایک اور مثال پیش کرتے ہیں میر حسن شب ماہتاب کی تصویر کھینچتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:۔

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتّے چمکتے ہوئے خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
نظر جو کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی سو وہ عالم وجد میں تھی کھڑی
درختوں سے لگ لگ کے باد صبا لگی وجد میں بولنے واہ وا

میرے خیال میں باغ اور شب ماہتاب کی جو تصویریں میر حسن نے کھینچی ہیں وہ نہایت جامع اور مکمل ہیں۔ اس سے زیادہ بہتر تصویر کھینچنا ممکن نہیں۔ بدر منیر جس وقت بینظیر کو دیکھنے درختوں کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی تو اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

سرکنے کی واں سے نہ جا گہ نہ ٹھاؤں دیے حیرت عشق نے گاڑ پاؤں
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل

تشبیہ بھی بعض لحاظ سے شعر کی جان ہوتی ہے۔ اس صنعت سے یہ فائدہ ہے کہ جو بات دو سطروں میں بیان نہیں ہوسکتی وہ دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ لیکن تشبیہ ہرگز دور از قیاس نہیں ہونی چاہئیے۔ سحرالبیان میں میر حسن نے بعض تشبیہات نہایت عمدہ پیش کی ہیں۔ چکبست کے خیال کے مطابق میر حسن صرف محاورہ اور روزمرّہ کے بادشاہ ہیں اور استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصّہ ہے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ ہزارہا مثالیں سحرالبیان میں موجود ہیں جو اس رائے کی تردید کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف محاورہ اور روزمرّہ کے بادشاہ ہیں بلکہ عمدہ تشبیہات کا اپنے کلام میں داخل کرنا ان کا خاص جوہر ہے۔

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر نشے کا سا عالم گلستان پر

باد بہاری سے پھولوں کے گر جانے کے منظر کو اس سے بہتر تشبیہ نہیں دی جاسکتی کہ تمام گلستان

پہ مستی کا عالم طاری ہے یا سواری کی آہستہ خرامی کو اس سے زیادہ بہتر طریقے سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔

غرض اس طرح سے سواری چلی کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

یا چاندنی کی تشبیہ دریائے سیماب سے دینا نہایت قابل تحسین ہے۔

عجب لطف تھا سیر مہتاب کا کہے تو کہ دریا تھا سیماب کا

درختوں کے ایک دوسرے سے ملنے کو میر حسن یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

تھے اک طرف گنجان باہم درخت کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت

نہانے کے بعد انسان کی صورت اور بدن صاف ہو جاتا ہے، اسکی صفائی کی تشبیہ یوں دی گئی ہے۔

نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ نکل آئے بدلی سے جسطرح دھوپ

ایک اور جگہ میر حسن تشبیہ سے حیرت کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

میر حسن واقعی زبان کے بادشاہ تھے، وہ اپنے خیالات نہایت شستہ اور صاف زبان میں ادا کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے ان کو اس بات کا ملکہ ہے کہ جس شخص کی زبان کا چربہ اتارنا چاہتے ہیں نہایت کامیابی کے ساتھ اتار سکتے ہیں۔ مثلاً اگر نسائی زبان میں لکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زبان، ان کے محاورات، اور اُن کی امثال نہایت عمدہ طور پر اپنے اشعار میں باندھ دینگے۔ یا اگر کسی نیچے درجہ کے آدمی کی زبان کا استعمال اپنے اشعار میں چاہیں تو اس کو نہایت خوبی سے استعمال کرینگے۔ یا اگر کسی جوگی یا پنڈت کی زبان سے اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں تو اُسی کے انداز میں نہایت عمدگی سے ادا کریں گے۔

عورتوں کی توہمات پرستی مشہور ہے، جس وقت بےنظیر درختوں کی آڑ میں چھپ گیا تو بدر منیر کی خواصوں میں دو چار جو وہاں موجود تھیں اُنھوں نے اس کو دیکھا اور اُن کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آئے جس کا اظہار میر حسن نے ان اشعار میں کیا ہے:۔

کسی نے کہا "کچھ نہ کچھ ہے بلا" کسی نے کہا "چاند ہے یاں چھپا"
"کسی نے کہا "ہے پری یا کہ جن" کسی نے کہا "ہے قیامت کا دن"
لگی کہنے ما تھا کوئی اپنا کوٹ "ستارا پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ"
کسی نے کہا "دیکھیو اسے لوا!" کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا"
کسی نے کہا "یہ تو دلدار ہے" کسی نے کہا "کچھ یہ اسرار ہے"

اس موقعہ پر میر حسن نے ان تمام خیالات کو جو عورتوں کے دماغ میں ایسے وقت آ سکتے تھے نہایت خوبی کے ساتھ انہی کی زبان میں ادا کیا ہے۔ اسی طرح بدر منیر کا بینظیر کو دیکھکر کہنا:۔

یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

نظم کیا ہے۔ علاوہ اس کے میر حسن نے جس خوبی سے بہت سی جگہ عورتوں کی کہاوتوں کو اپنے اشعار میں باندھا ہے وہ اس مثال سے واضح ہو سکتی ہے۔

مری سمت ٹک دیکھ تو ہائے ہائے مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے

عورتوں کی زبانِ رشک کو جس خوبی سے انھوں نے نبھایا ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہے:۔

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے دل کو لگاوے کوئی بھلے چنگے جی کو جلاوے کوئی

یا

یہ اُڑتی سی اس کی خبر سن پری کہا "دیکھیے پاؤں اسکو ذری"
تو کھا جاؤں کچا اسے موت ہو "لگی ہے مری اب تو وہ سوت ہو"

ذری کا لفظ قابل غور ہے، یہ لفظ آج بھی لکھنؤ کی عورتوں میں مستعمل ہے۔ اسی طرح کچا کھا جاؤں کا محاورہ بھی ہماری عورتیں اکثر بولتی ہیں۔ الغرض میر حسن نے اپنی مثنوی میں اس بات کا خاص طور پر خیال کیا ہے کہ جو بات کہی جائے وہ روزمرہ اور محاورہ کے مطابق ہو اور جس قدر سادے الفاظ میں خیالات کا اظہار کیا جا سکے، کیا جائے۔

میر حسن کا زمانہ وہ تھا جو آجکل کی سی لامذہبیت سے کوسوں دور تھا۔ ہر مسلمان راسخ العقیدہ ہوتا تھا اور اسی طرح میر حسن بھی اپنے مذہب کے پکے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی اس مثنوی میں مذہبی رنگ کی جھلک کہیں کہیں بالکل صاف نمایاں ہے۔ مسلمانوں کا یہ عام عقیدہ ہے کہ انسان پر خواہ کتنی ہی مصیبت کیوں نہ پڑے لیکن خدائے تعالیٰ سے کبھی امید منقطع نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کو اپنے بندوں پر فضل و کرم کرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چنانچہ یہی خیال انھوں نے اپنے اس شعر میں ظاہر کیا ہے۔

نہ لا دل کبھی یاس کی گفتگو کہ قرآں میں آیا ہے لاتقنطو

یہ خیال کہ جو قسمت میں ہوتا ہے اُس کا پورا ہونا لازمی ہے۔ انسان کی تدابیر بھی قضا و قدر

کے مقابلہ میں کچھ کارگر نہیں ہوتیں۔

سخن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم — کہ آگے قضا کے ہو احمق حکیم

فلسفۂ ہستی کا مطالعہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے، اور میر حسن نے اس کا مطالعہ بہت کافی کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی نام ہے راحت و رنج کے مجموعہ کا۔ ان کے نزدیک زندگی میں رنج وغم اور عیش و راحت برابر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کا اظہار اس طریقہ پر کرتے ہیں۔

ہوئی کچھ خوشی شہ کو اور کچھ الم — کہ دنیا میں توام ہیں شادی و غم

میر حسن اس راز سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ہر چیز کا تعلق دل کی خوشی سے ہے اور جب دل آماجگاہِ رنج و الم ہو تو اچھی خاصی زندگی تلخ ہو جاتی ہے لہذا وہ کہتے ہیں :-

سبب یہ کہ دل سے تعلق ہے سب — نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب

گیا ہو جو اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

مثنوی سحرالبیان کے مصنف نے اس بات کا خوب مشاہدہ کیا ہے کہ جب بچھڑے ہوئے دو آدمی ایک جگہ مل جاتے ہیں تو وہ اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ نیند کوسوں بھاگ جاتی ہے اور یہ عام طور پر دیکھنے میں آیا بھی ہے کہ جب کوئی پُرانا دوست مل جاتا ہے جس سے مدت سے ملاقات نہ ہوئی ہو تو اس کی باتوں میں کسی بات کی بھی سدھ بُدھ نہیں رہتی حتی کہ نیند بھی خواب و خیال ہو جاتی ہے۔ اپنے اس تجربہ کو میر حسن یوں ظاہر کرتے ہیں :-

جو ملتے ہیں بچھڑے ہوئے ایک جا — انھیں نیند باتوں میں آتی ہے کیا؟

میر حسن ایک سچے مسلمان کی طرح دنیا کی ہر چیز کو فانی سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

یہاں موت ہے اہلِ عرفان کو — کہ جانا ہے اِک دن یونہی جان کو

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ آئے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میر حسن نے اپنی مثنوی میں وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جو اب متروک ہو گئے۔ خیر میر حسن کو تو مثنوی لکھے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے لیکن خود شوق اور نسیم کے یہاں بھی بعض ایسے الفاظ ہیں جو آجکل استعمال نہیں کئے جاتے مگر اس میں کوئی قصور میر حسن کا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ زبان کچھ عرصہ کے بعد بدل جاتی ہے لہذا بہت سے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جن الفاظ کو آج ہم نہایت فصیح سمجھکر لیتے ہیں ان میں سے اکثر سو سال بعد متروک نہ ہو جائیں گے۔ یہ باتیں زبان کے تدریجی ارتقا کے ساتھ وابستہ ہیں

پس ایسے الفاظ میں جو اب متروک ہو گئے ہیں ہم کسی مصنف یا شاعر کو خطاوار نہیں ٹھہرا سکتے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض متروک الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو کانوں کو ناگوار گزرتے ہیں مثلاً میر کی زبان میں اور موجودہ زبان میں بہت زیادہ فرق ہو گیا ہے۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا احساس کم ہوتا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ میر حسن کی مثنوی میں ایسے الفاظ بہت ہی کم محسوس ہوتے ہیں

وہ آنکھیں کہ کرتی تھیں جیدھر نگاہ — اودھر عشق میں آتے تھے سب بھول راہ

بس اب کچھ خوشی کی کرو گفتگو — خدا پھر نہ تم کو رولاوے "کبھو"

کنیزانِ مہ رُو کی "ہر طرف" ریل — چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

کچھ آئی جو اس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے "پہ" بچھے "پلنگ"

کہا ماہ رُخ نے کہ تھے تیرے بخت — کہ بخشا تجھے "میں" سلیماں کا تخت

مندرجہ بالا اشعار میں خط کشیدہ الفاظ آجکل متروک ہیں۔ ہم نے یہ مثالیں اس لئے دی ہیں تاکہ میر حسن کے زمانہ کی زبان اور آجکل کی زبان میں جو فرق ہے اس کا آسانی سے پتہ چل سکے۔

یہاں پر مثنوی سحر البیان کے بعض نقائص کو نظرانداز کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ مغربی اُصولِ تنقید کے مطابق ناقد کا فرض یہی ہے کہ مدح وستائش بھی کرے اور عیوب شماری بھی۔ لہذا اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ہم کو سحر البیان کے تاریک پہلو پر بھی نظر کرنی ہوگی۔

شعرا کے یہاں عام طور پر مبالغہ کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک وہی شعر اچھا ہے جس میں مبالغہ زیادہ ہو، مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ بیشک ایک زمانہ تھا جب کہ شاعروں کو زیادہ مبالغہ کرنے سے فائدہ پہونچتا تھا کیونکہ درباری شعرا جو قصیدہ بادشاہ کی شان میں لکھتے تھے اس میں انعام حاصل کرنے کے خیال سے ضرورت سے زیادہ اس بادشاہ کی تعریف کی جاتی تھی۔ بادشاہ بھی اس شعر کو زیادہ پسند کرتے تھے جس میں اُن کی تعریف زیادہ ہوتی تھی اور اسی شاعر کو انعام و اکرام سے مالامال کرتے تھے جو اُن کی تعریف حد سے زیادہ کرتا تھا۔ الغرض ان کی تعریف جھوٹ اور غلو پر مبنی ہوتی تھی۔ ان قصائد میں تمام باتیں جھوٹی ہوتی تھیں۔ صرف دو چار ایسی باتیں ہوتی تھیں جو صحیح ہوتیں اور باقی تمام از سرتاپا غلط۔ مگر اب وہ زمانہ ختم ہو گیا ہے کیونکہ اب نہ وہ بادشاہ ہیں اور نہ کوئی قصیدے لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ طبائع بھی اب پہلے سے بدل گئی ہیں، جھوٹ اور غلو کو اب کوئی پسند نہیں کرتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ سے شعر کی تاثیر قطعاً جاتی رہتی ہے۔ قصہ لکھنے میں تو اس بات کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو

جھوٹی اور غیر ممکن باتوں سے احتراز کیا جائے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ پڑھتے وقت یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ ہے۔ لیکن میر حسن نے بعض جگہ دوسرے شعرا کی طرح بہت کافی مبالغہ سے کام لیا ہے۔ قلعہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کہوں قلعہ کی اس کے میں کیا شکوہ گئے دب بلندی کو دیکھ اسکی کوہ

جو بات میر حسن نے اس شعر میں بیان کی ہے وہ نہ صرف بعید از قیاس ہے بلکہ قطعاً غیر ممکن ہے۔ قلعہ خواہ کتنا ہی مرتفع اور شاندار کیوں نہ ہو یہ ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا کہ پہاڑ سے زیادہ بلند ہوگا۔ انھیں باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی قلعہ نہیں تھا بلکہ محض گھڑی ہوئی بات ہے۔

رہے واں کے حجروں کا جو در کھلا تو دنیا کے باجوں کی آئے صدا

وگر بند کر دیجیے ایک بار تو جوں ارغنوں ساز نکلیں ہزار

یہ دونوں اشعار بھی پہلے شعر کی طرح مبالغہ سے پُر ہیں۔ یہ تو ممکن بھی ہے کہ حجروں کے در کھولنے پر کہیں اور سے باجے کے بجنے کی آواز آجائے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دروازہ بند کرنے پر کیونکر ہزارہا قسم کے راگ اس میں سے نکل آئیں گے۔

شرابوں کے شیشے چُنے طاق میں گزک وہ کہ نکلے نہ آفاق میں

اس شعر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر گزک ایسی تھی کہ آفاق میں نہیں مل سکتی تو آخر وہاں کیسے موجود تھی۔ لیکن ہم ایسے مبالغہ کو جائز سمجھتے ہیں کیونکہ مبالغہ محاورہ کا جز ہے۔ ہم عام طور پر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں چیز دنیا میں نہیں مل سکتی یا اس قسم کی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن میں بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن روزمرہ اور محاورہ کے اعتبار سے انکا استعمال جائز ہے۔ داغ کے اس شعر میں بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن عام طور پر یونہی بولا جاتا ہے اور شاعر زبان کی شستگی کے خیال سے یہاں پر یہ محاورہ استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا

میر حسن کسی لڑکی کے رخساروں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

وہ رخسارِ نازک کہ ہو جائے لال اگر اس پہ بوسہ کا گزرے خیال

شاعر تعریف تو کر گیا لیکن اس کو یہ خیال نہ رہا کہ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ محض اس خیال سے رخسار کا سُرخ ہو جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح یہ دو شعر بھی حد درجہ مبالغہ کی مثال ہیں:-

وہ گلڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
اس اندھیر کو کیا لکھوں اب میں آہ قلم کے نکلتے ہیں آنسو سیاہ

گو میر حسن نے بعض بعض مقام پر حد سے زیادہ مبالغہ کیا ہے لیکن وہ اس زمانہ کی روش سے مجبور تھے تاہم ان کے مبالغہ سے مثنوی کی فضیلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی مثنوی سحر البیان میں سب سے زیادہ قابل اعتراض چیز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مثنوی میں ایک باب ایسا بھی داخل کر دیا ہے جو بہت رکیک اور مبتذل ہے چنانچہ ایسے ہی ابواب پڑھکر مثنوی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ مگر ایک لحاظ سے وہ اس باب کو شامل کرنے پر مجبور تھے، تاہم آجکل اس باب کے اشعار پڑھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔

ایک نوجوان تنقید نگار نے جنھوں نے سحر البیان کے اس پہلو پر کافی غور کیا ہے میر حسن کی اس لغزش کو بہت کچھ قابل تحسین بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر سحر البیان کے اس باب کو نکالدیا جائے تو اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی، بلکہ اس کا اصلی نشا ہی فوت ہو جاتا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سحر البیان کے اس باب کو داخل نہ کیا جاتا تو کیونکر تمام مثنوی کا اصل نشا فوت ہو جاتا

بہر حال میر حسن کی مثنوی اپنے زمانہ کے رسوم و توہمات کا آئینہ ہے، وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ "جب عیش وطرب کی اُمنگیں گرم خون کی طرح ہر فرد کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھیں"۔ لیکن عیش وطرب کی اُمنگیں کسی زمانہ کے لئے مخصوص نہیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جب انسان نے عیش وطرب کو چھوڑ کر رنج و تعب خوشی سے قبول کر لیا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ ضروریات کے احساس نے کرب و بلا جھیلنے کے لئے انسان کو مجبور کر دیا ہو اور چار و ناچار وہ اس کے لئے مستعد ہو گیا ہو۔ آج بھی ہماری طبائع عیش وعشرت کو پسند کرتی ہیں اور ہم یہی چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو اپنی زندگی نہایت آرام سے گزاریں۔

بہر حال میر حسن کی مثنوی کا یہ پہلو بہت رکیک ہے، اصل میں اس قدر تفصیل میں جانے کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ مثنوی میں کہیں کہیں دو چار شعر اور بھی ایسے ملتے ہیں جو بہت عُریاں ہو گئے ہیں۔ مثلاً:-

نکیلی وہ اُٹھی ہوئی چھاتیاں
.............

ان اشعار کو عورتوں کے پڑھنے کا کیا ذکر خود مردوں کو ان کے پڑھنے سے عار ہوگا۔ اور آجکل جب تعلیم نسواں کا اس قدر چرچا ہے اور لڑکیوں کو پڑھنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے اس قسم کے اشعار کی

اشاعت کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ مثنوی اُن مثنویوں کے مقابلہ میں جو شوق نے بعد کو لکھی ہیں نسبتاً کم رکیک ہے۔ لیکن شوق کی مثنویاں خلاف تہذیب ہونے کے باوجود روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہیں۔ بہر نوع سحر البیان میں اگر ایک باب کسی قدر رکیک ہے تو یہ اس کی دوسری خوبیوں کو روپوش نہیں کرسکتا۔ اس باب کو نکال دیا جائے تو باقی ماندہ مثنوی نہایت قابل قدر اور لاثانی ہے۔

اِس مثنوی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے لئے میر حسن نے وہ بحر انتخاب کی ہے جس میں اکثر مثنویاں لکھی گئی ہیں اور جس میں موسیقی کے زیروبم کا پورا پورا احساس ہے اور گلزار نسیم کی بحر میں کوئی موسیقیت نہیں ہے۔

# جذبات اثر

(خانصاحب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی، بی۔ اے)

دردِ فراق کہنے کے قابل نہیں رہا
اِک دشنہ زخم ریز ہے اب دل نہیں رہا

اے ذوق ہرزہ کوش ترا دھیان ہے کدھر
لیلےٰ کہاں جو پردۂ محمل نہیں رہا

میں اور تجھ سے عرضِ تمنا، نہیں نہیں
مدت ہوئی وہ نشۂ باطل نہیں رہا

اے وہم غیر تو نے ستم کیا کیا کہ میں
خود اپنے اعتبار کے قابل نہیں رہا

سو انقلاب ہوگئے دنیائے عشق میں
وہ گوشۂ نگاہ جو مائل نہیں رہا

تو سر بسر جمال، تو آئینۂ جمال
کیا ہے اگر نظر کے مقابل نہیں رہا

اپنا کنار آپ ہوں گرداب کی طرح
میرے محیطِ شوق کا ساحل نہیں رہا

محشر میں جذبِ عشق کی معجز نمائیاں
آلودہ خوں سے دامنِ قاتل نہیں رہا

جب تک سُنائے فردہ غریبوں کو ناخدا
دھندلا سا ایک نقش تھا۔ ساحل نہیں رہا

اے دل غریبِ دل مرے حسرت نصیب دل
کچھ خونِ آرزو کا بھی حاصل نہیں رہا

تڑپائے گا تجھے بھی، خدارا نہ اب ستا
دل اپنے اضطراب کی منزل نہیں رہا

ہمت نے راہ ترک طلب اختیار کی
جب اور کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

آغوشِ جلوہ باز ہے اُس کے لئے اثر
اپنی صفائے دل سے جو غافل نہیں رہا

# عالمپور میں

(از مولانا شاہد صدیقی اکبرآبادی)

یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ مناظر، یہ زمیں، آئے اور آکر محبت سیکھ لے کوئی حسیں
ہر طرف اک حیرت افزا بیخودی چھائی ہوئی سازہائے زندگی پر خامشی چھائی ہوئی
بہہ رہی ہے ایک ندی پیچ و خم کھاتی ہوئی غافلوں کو زندگی کا راز سمجھاتی ہوئی
تیز رو ندی کی موجیں دے رہی ہیں اک پیام اور ساحل کے پکھیرو کر رہے ہیں کچھ کلام
دور تک ہے اک سہانی روشنی پھیلی ہوئی ہے زمیں پر آسمانی روشنی پھیلی ہوئی
اک طرف ویراں کھنڈر ہیں نوحہ خوانِ زندگی اک طرف آباد کوچے داستانِ زندگی
ایک جانب کچھ منادر اپنی عظمت کے گواہ جنکی حالت دیکھ کر حیرت میں پڑ جائے نگاہ
دیکھ اے نادان! کیوں گردابِ مدہوشی میں ہے عہدِ ماضی کا فسانہ ان کی خاموشی میں ہے
درمیاں میں اک بزرگِ باکرامت کا مزار دورِ موجودہ کی عقل آرائیوں پر اشکبار
کہہ رہا ہے داستانِ اتحادِ اولیں جس کا اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں
اپنی آنکھوں سے مذاہب کی محبت دیکھ لے دیکھ لے نادان! آثارِ قدامت دیکھ لے
اس جگہ انسانیت کی روح محوِ خواب ہے یاں جو ذرہ ہے کتابِ عاشقی کا باب ہے
اس جگہ ملتی ہے تعلیم خلوص و اتفاق جس کو پاکر بھول جانا چاہیئے درسِ نفاق
اس جگہ ہے آسمانی دیوتاؤں کا گزر جن کی عظمت تک نہیں پہنچی ہے انسانی نظر
اس جگہ اک مردِ کامل اک ولیِ پارسا سو رہا ہے بے نیازِ کشمکش ہائے فنا
درسگاہِ ارتباطِ ہندو و مسلم ہے یہ یعنی دنیائے نشاطِ ہندو و مسلم ہے یہ

زندگی پیدا ہوئی شاہد دلِ رنجور میں
اک عجب عالم نظر آیا ہے عالمپور میں

# اُردو اور ہندی

## ایک اہم تجویز

(مسٹر حامد اللہ افسر، بی، اے)

اب سے چار پانچ سال پہلے میں نے ایک تجویز الہ آباد کے مشہور انگریزی روزانہ اخبار "لیڈر" میں شائع کی تھی جس کا مقصد اُردو ہندی کے قضیہ کو ہمیشہ کے لئے طے کر دینا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ صوبہ متحدہ کے ہائی اسکولوں کے امتحان میں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کو لازمی قرار دیدینا چاہیے۔ اس وقت ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی تعلیم ہائی اسکول کے امتحان میں لازمی ہے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ یوپی کے باشندوں کے لئے اُردو اور ہندی دونوں زبانیں لازم رہیں اور ان کی تعلیم کا معیار یہی رہے جو اس وقت ہائی اسکول کی جماعتوں میں اُردو اور ہندی کا ہے۔

اس تجویز پر ایک مدت تک اخبار مذکور میں بحث جاری رہی موافقت میں بھی مضامین شائع ہوئے اور مخالفت میں بھی، خود "لیڈر" نے ایک اڈیٹوریل نوٹ میں اس تجویز پر بہت ہمدردانہ لہجہ میں اظہار خیال کیا، لیکن جیسا کہ ہمارے سب کام ہوتے ہیں کچھ عرصہ تک جوش رہتا ہے پھر ٹھنڈا ہو جاتا ہے وہی حال اس تجویز کا ہوا۔

اس عرصہ میں مجھے تجویز مذکور پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کا موقع ملا اور میں نے اپنے خیال میں اس کو ہر طرح نہایت مفید پایا۔ جب سے ہماری مادری زبان کو ہمارے مدرسوں میں تعلیم کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے مختلف مضامین پڑھانے والے ماسٹروں کو ایک بڑی دقت یہ آپڑتی ہے کہ اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے جب وہ سیاہ تختہ کو استعمال کرتے ہیں تو ان کے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انہیں لکھنا ہے وہ کس زبان کے حروف میں لکھیں جماعت کے طلباء میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف اُردو جانتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ہندی جانتے ہیں۔ اگر ٹیچر سیاہ تختہ پر اُردو میں لکھتا ہے تو ہندی جاننے والے لڑکے نہ سمجھ سکیں گے۔ اور اگر ہندی میں لکھتا ہے تو اُردو جاننے والے محروم رہیں گے۔

اصل میں اسی مشکل کو حل کرنے کے لئے اس تجویز کا خیال پیدا ہوا۔ اگر ہندی اور اُردو دونوں کو ساوی معیار پر لازمی قرار دیدیا جائے گا تو پھر ٹیچر کو آزادی ہوگی کہ وہ جس رسم خط میں چاہے سیاہ تختہ پر اپنا مطلب واضح کرے، دوسری زبان کی حیثیت سے اب بھی اُردو اور ہندی دونوں زبانیں ثانوی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہیں لیکن اُن کا پڑھانا نہ پڑھانا برابر ہے، نہ ماسٹر ہی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ طلبا۔

ہائی اسکول کی جماعتوں تک اُردو اور ہندی دونوں کو ساوی معیار پر لازمی قرار دینے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوگا کہ طلبا کو ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے دونوں زبانوں میں اچھا خاصا دخل ہو جائے گا، اور جب وہ اسکول اور کالج کے حدود سے نکل کر بہ حیثیت ایک شہری کے زندگی کی شاہراہ پر گام زن ہوں گے تو ہندوؤں کو اُردو سے اور مسلمانوں کو ہندی سے نفرت نہ ہوگی، جیسا کہ بہ استثنائے چند اس وقت ہے، کیونکہ ہندو اور مسلمان سبھی دونوں زبانوں سے واقف ہوں گے۔

اس وقت ہندی زبان ایک بڑی حد تک ہندوؤں کی مذہبی، معاشرتی اور تمدنی روایات کی سرمایہ دار ہے اور اُردو زبان زیادہ تر اسلامی روایات سے لبریز ہے۔ دونوں زبانوں کے لازمی قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان حضرات ہندوؤں کے روایات اُن کے معتقدات اور اُن کے رسم و رواج سے آگاہ ہو جائیں گے اور ہندو اصحاب مسلمانوں کی روایات اُن کے معتقدات اور اُن کے رسم و رواج سے واقفیت حاصل کر سکیں گے، اور یہ آگاہی اور واقفیت دونوں فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا بڑا اچھا ذریعہ ہوگی۔

اس وقت ہمارے صوبہ میں دو زبانیں رائج ہیں ایک اُردو اور دوسری ہندی، اُردو کے بہی خواہ اس کوشش میں ہیں کہ اُردو کاروباری زندگی، سیاسیات، تمدنی اور معاشرتی ضروریات میں ہندی سے بازی لے جائے اور ہندی کے خیر طلب یہ چاہتے ہیں کہ اگر بس چل سکے تو اُردو کو نیست و نابود ہی کر دیں تاکہ زندگی کے کسی شعبہ میں اس کا نام و نشان نہ رہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک معتدل گروہ ایسا بھی ہے جو دونوں زبانوں کو ایک زبان بنا دینے کیلئے سرگرم کار ہے، لیکن یہ سب کوششیں فضول اور بیکار ہیں، نہ اُردو کے بہی خواہ ہندی کو نیست و نابود کر سکتے ہیں اور نہ ہندی کے پرستار اُردو کو مٹا سکتے ہیں اور نہ دونوں زبانیں ایک ہو سکتی ہیں۔ اُردو نے بہ حیثیت ایک مستقل زبان کے بہت کافی ترقی کر لی ہے۔ اسیطرح ہندی نے بھی بحیثیت

ایک جداگانہ زبان کے جڑ پکڑلی ہے، دونوں کے راستے بالکل جدا جدا ہیں اور دونوں کا ادب برابر ترقی کر رہا ہے، گویا ہمارے صوبہ کی دو مستقل زبانیں ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے جو ایک دوسرے سے برابر دور ہٹتے جاتے ہیں۔ اور اتحاد و اتفاق کے ایک بڑے مضبوط ذریعہ سے ہم محروم ہیں۔

اگر ہمارے صوبہ کے تمام تعلیمیافتہ حضرات اُردو اور ہندی دونوں زبانوں سے آگاہ ہو جائیں جیساکہ اس تجویز کا مقصد ہے تو اس سے ایک اہم فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی میں جو ایک خلیج پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو جائیگی اور ہم ایکدوسرے کی صحبت سے مخلوظ ہو سکیں گے، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہمارے صوبہ میں صرف ایک زبان رہ جائیگی۔ اسلئے کہ جب ہم دونوں زبانوں سے آگاہ ہونگے تو ہم تحریر و تقریر میں قدرتی طور پر وہ زبان استعمال کریں گے جو شائستہ تر ہے، جسمیں مفہوم زیادہ وضاحت کیساتھ اور زیادہ خوبصورتی سے ادا ہو سکتا ہے جو تہذیب یافتہ سوسائٹی کی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کرسکتی ہے جسکے الفاظ میں ایک قسم کا وقار ہے، متانت سنجیدگی، پاکیزہ شوخی اور لطیف ظرافت ہے،

ظاہر ہے کہ ابھی دونوں زبانیں (اُردو اور ہندی) محتاج ترقی ہیں اسوقت ہم سب یکجہتی کیساتھ اِنمیں سے کسی ایک زبان کو ترقی دینے کیلئے تیار نہیں ہیں، لیکن جسوقت ہمارے صوبہ کے باشندوں کی کثیر تعداد دونوں میں سے کسی ایک زبان کو کاروباری اور معاشرتی ضروریات کے لئے منتخب کریگی تو اس منتخب شدہ زبان میں جو خامیاں ہیں اُنکی بھی آسانی سے اصلاح ہو جائیگی، اور اسطرح رفتہ رفتہ تقریبًا پچاس سال کے اندر ہمارے صوبہ میں صرف ایک زبان رہ جائیگی، اور وہی زبان بہترین زبان ہوگی کیونکہ وہ کسی بیرونی کوشش یا مصنوعی ذریعہ سے ہم پر مسلط نہیں کیجائیگی بلکہ ہم خود اُسکو منتخب کرنے پر مجبور ہونگے اس لئے وہی قدرتی طور پر ہماری مادری زبان ہوگی۔

نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہندی ہوگی یا اُردو جس طرح میرے نزدیک وہ زبان اُردو ہی ہوسکتی ہے جس کو ہمارا صوبہ منتخب کریگا اسی طرح ممکن ہے آپ کو یہ یقین ہو کہ وہ زبان ہندی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی، دونوں میں سے کونسی زبان منتخب کیجائیگی اس کا فیصلہ زمانہ کرے گا۔

یہی منزل جس پر تیز روی کے اس دور میں اپنی تجویز کے ذریعہ میں پچاس سال کے اندر پہنچا چاہتا ہوں بالآخر ہمارے صوبہ کے ہر راہرو کی نظر میں ہوگی، کیونکہ زبان کا مسئلہ کسی مصنوعی ذریعہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ زبانوں کی ترقی اور ترویج قطعًا فطری ہوتی ہے، ہو نہیں سکتا کہ کسی زمانہ میں ہمارے سارے صوبہ کی ایک ہی زبان ہو جائے یہ دوسری بات ہے کہ وہ زمانہ دو صدی میں آئے یا چار صدی میں۔

اب ایک نظر ہمیں ان مشکلات پر بھی ڈال لینی چاہیے جو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں سدراہ ہونگی، "لیڈر" میں جسقدر اعتراضات میری اس تجویز پر ہوئے تھے انمیں میں سے کوئی ایک اعتراض بھی تجویز کے معقول اور مناسب ہونے پر نہ تھا بلکہ ہر معترض نے اسکو چند در چند وجوہ سے ناقابل عمل قرار دیا تھا، جہانتک مجھے یاد ہے تمام اعتراضات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسوقت جبکہ ہائی اسکول تک ہمارے تعلیمی نصاب میں لازمی اور اختیاری مضامین کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے ایک اور مضمون کا نصاب تعلیم میں اضافہ کر دینا مناسب نہ ہوگا، اس طرح طلبا پر ناقابل برداشت بار ہو جائے گا۔

یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس اعتراض نے جس شکل کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے گھبرا کر ہم ایک ایسی تجویز کو ترک کرنے پر کیوں مجبور ہو جائیں جس سے صدہا فائدے یقینی طور پر رونما ہونگے۔

بے شک اسوقت ہمارے نصاب تعلیم میں مضامین کی تعداد بہت ہے لیکن اگر نصاب تعلیم پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو ہم اس بار کو ہلکا کر سکتے ہیں، مثلاً میرے نزدیک ہائی اسکول میں ریاضی کا نصاب اسوقت ضرورت سے زیادہ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جو طلبا انجنیرنگ وغیرہ میں جانا چاہتے ہیں اُن کے لئے موجودہ نصاب ضروری ہے اس مشکل کا حل اسطرح ہوسکتا ہے کہ ریاضی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۔ ریاضی

۲۔ مزید ریاضی

میتھمٹیکس (ریاضی) لازمی مضمون قرار دیدیا جائے اور ہایر میتھمٹیکس (مزید ریاضی) اختیاری مضمون ہو، جو طلبا رخاص طور پر ریاضی سے ذوق رکھتے ہو یا جنکو کسی مخصوص پیشہ کیلئے ریاضی کی ضرورت ہو وہ ہایر میتھمٹیکس کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، اسی طرح میرے نزدیک تاریخ اور جغرافیہ کے نصاب کو بھی ہلکا کیا جا سکتا ہے۔

پھر جب اُردو اور ہندی دونوں زبانیں لازمی قرار دی جائینگی تو وہ ہائی اسکول کی جماعتوں میں پہنچکر اک دم تو لازمی نہیں کر دی جائیں گی بلکہ ابتدائی جماعتوں سے دونوں زبانیں لازمی ہونگی، سلئے ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے طلبا رکیلئے دونوں زبانیں کافی آسان ہو جائیں گی۔

بہر طور میرے نزدیک یہ تجویز ہر حیثیت سے ہمارے صوبہ کیلئے نہایت مفید تجویز ہے، میں خصوصًا پنے صوبہ کے ماہرین تعلیم سے اور عمومًا تمام صاحبان غور و فکر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس تجویز پر غور فرمائیں اور اگر یہ قابل عمل ہو تو اراکین ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ بورڈ بں سے کوئی صاحب اس تجویز کو بورڈ میں پیش فرمادیں،

# محبّت کی پہلی شکست

(از جناب فطرت واسطی)

عہدِ طفلی! تیری باتیں مجھکو کچھ کچھ یاد ہیں — تیری دُنیا کے فرشتے کس قدر آزاد ہیں
بےخبر یکسر تھا میں پابندیوں سے دہر کی — کمسنی میں ہوتی ہے اُف کس بلا کی سادگی
تیری رخصت کا زمانہ وقتِ فکر و غور تھا — ارتقائے ذہنیت میں کشمکش کا دَور تھا
اب دماغ و دل کی قوت بھی ترقی یاب تھی — اب نمایش گاہِ عالم، محفلِ اسباب تھی
اب تو محسوسات میں بجلی کی رَو آنے لگی — دہر کی ہر چیز پر غائر نظر جانے لگی
رفتہ رفتہ خود بخود مجھے محسوس یہ ہونے لگا — رہنمائے دل ہوں میں، یا دل تھا میرا رہنما
سیرِ گلشن میں نئی لذت مجھے آنے لگی — خود بخود غنچوں کی جانب اب نظر جانے لگی

---

سیر کو اِک بار اپنے گھر سے نکلا شام کو — تھا میں آہستہ خراماں، جلوہ گاہِ عام کو
اِک حسیں خاتون کو دیکھا کنارِ جوئبار — اُسکا وقتی مشغلہ تھا، موجِ دریا کی شمار
اُس کے جلووں کا تماشا، منظرِ امید تھا — دل کی دنیا پر فروزاں حُسن کا خورشید تھا
حُسن کی سادہ شعاعوں میں جوانی کا نکھار — مایۂ حسنِ دو عالم، صد گلستاں در کنار
دعوتِ نظارہ دیکر، ہوگئی محوِ حجاب — ایک ادائے پرسکوں جو بن گئی صد اضطراب
یا مری بے ساختہ نظروں سے وہ شرما گئی — یا اداؤں سے وہ اپنی آپ ہی گھبرا گئی
بجلیاں لاکھوں تمناؤں پہ برسانے لگی — زیرِ لب کچھ مُسکرا کر اِک طرف جانے لگی

---

میں طلسمِ حسن پر حیرت زدہ خاموش تھا — میں بقیدِ ہوش تھا اور دل مرا بیہوش تھا
سینۂ لرزاں میں دل تھا، دل میں دردِ مستقل — اشک ریزی کے لئے آنکھیں تھیں میری مشتعل
کچھ نہ سمجھا میں، ذرا بھی کیا سے کیا یہ ہوگیا — جاگ اُٹھے جذبات دل کے، دل مرا کیوں سوگیا
ہو چکا ہے دل مرا اب موردِ صد اضطراب — تیری آمد کے کرشمے تھے یہ، اے عہدِ شباب

آرزوئیں وہ کہاں ہیں وہ اُمنگیں اب کہاں
نذرِ لو ہیں عشق کی دل ہو مرا بے کارواں
ابتو اتنا یاد ہے اک خواب دیکھا تھا ضرور
ہاں دماغ و دل میں جسکا اب بھی باقی ہے سرور
یاد ہے وہ بازیِٔ عشق و محبت کی شکست
یادِ دلِ ناآشنائے درد کی پہلی شکست

ہوگیا ہے خاتمہ فطرت دلی جذبات کا
نوجوانی کر گئی ہے، خون محسوسات کا

# الوَدَاع

(از منشی تلوک چند محروم بی۔اے)

الوداع اے کنارِ آبِ رواں
اے فضائے دیارِ آبِ رواں
اُف! یہ نیرنگیِ بہارِ شفق!
گل بدامن نگارِ آبِ رواں
اب نہ دیکھے گی چشمِ شوق اپنی
جلوۂ لالہ زارِ آبِ رواں
پھر کہاں ہم کہاں یہ شامِ وطن
پھر کہاں یہ بہارِ آبِ رواں
طبعِ شاعر کو تھی عزیز بہت
صحبتِ سازگارِ آبِ رواں
تھی دلِ خاکسار کو مرغوب
پستیِ رہگذارِ آبِ رواں
چمنستاں کو کب ہوا حاصل
منظرِ خوشگوارِ آبِ رواں
ثمر و شاخ نذرِ موج و حباب
سبزہ و گل نثارِ آبِ رواں
اس کو بہلاؤ گے تم اے اشکو!
دل کہ ہے بے قرارِ آبِ رواں

لے چلے ہیں وطن سے ہم محروم
اشکِ غم یادگارِ آبِ رواں

۵ ہمارے دوست محروم صاحب پچھلے سال اپنے سرحدی وطن سے تبدیل ہو کر راولپنڈی تشریف لے آئے ہیں
نظم دلنشیں جواب ہدیۂ ناظرینِ زمانہ ہو رہی ہے ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے روانگی کے وقت قلمبند ہوئی تھی۔

# سید عبد الوالی عزلت

**ابتدائی حالت** اِن کا نام سید عبد الوالی اور تخلص عزلت ہے۔ حضرت سید سعد اللہ سورتی کے بیٹے ہیں۔ تاریخ پیدائش کسی تذکرے میں درج نہیں، البتہ اُن کے دوسرے حالات سے صرف ایک قیاسی زمانہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی زندگی کے متعلق مختلف تذکروں سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں اُن کی نوعیت اس طرح کی ہے:-

(۱) میر صاحب لکھتے ہیں "تازہ وارد ہندوستان کہ عبارت از شاہجہاں آباد است، شدہ اند، نسبت تمام بہ سخن دارند۔"

(۲) قائم نے لکھا ہے "در عہد سلطنت مرزا احمد بہ دار الخلافت تشریف داشت ....."

(۳) "راقم سطور ہر گاہ کہ بہ حیدر آباد رفت ربطے ازاں جناب پیدا کرد، چنانچہ ہر روز بلا ناغہ بخدمت می رسید۔ وآں جناب ہم اکثر گاہ بہ غریب خانہ قدم رنجہ می فرمودند.......... الحال سلسلۂ ترسیل مراسلات از جانبین گرم است....."

(۴) "..... بعد مراجعت سفر بیت اللہ در بندر سورت ملاقات او اتفاق افتاد........ از بندر سورت روانہ شدہ بعد از طے ارض راہ بستم جمادی الاول سنہ (۱۱۶۴ ہجری) آں بلدہ (شاہجہاں آباد) فائز شدہ تا وقت ہماں جاست" (سرو آزاد)

(۵) "در زمان دولت نواب محمد علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور، وارد مرشد آباد و مورد مہربانی نواب مذکور گردید و بعد از انتقال نواب بہ دکن رفت۔" (گلزار ابراہیم)

(۶) "دہلی سے مرشد آباد گئے..... نواب (نواب مرشد آباد) کے مرنے کے بعد دکن گئے، اور اورنگ آباد میں بود و باش اختیار کی۔ نواب ناصر جنگ نظام الدولہ بہادر کا زمانہ تھا........ اُن کی شہادت کے بعد حیدر آباد گئے....." (گل رعنا)

(۷) "در ایام آصف جاہ نظام الملک بہ خجستہ بنیاد آمدہ ....." (گلشن گفتار)

عزلت کے متعلق ہمارے پاس صرف یہ سات بیانات ہیں جن سے اُن کی زندگی کے حالات

کچھ روشنی پڑتی ہے، اگر ان بیانات کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے ہم کسی نتیجہ پر پہونچنا چاہیں تو وہ یہ ہوسکتا ہے :-

عزلت ۱۱۶۲ھ میں سورت سے شاہجہاں آباد گئے، نکات الشعراء کی تالیف کے وقت وہ وہیں موجود تھے (۱۱۶۴ ہجری) جب آزاد نے "سرو آزاد" لکھا اُس وقت بھی اُن کی موجودگی وہیں کی بتائی ہے۔ لیکن مخزن نکات (۱۱۶۸ ہجری) کی تالیف کے وقت وہ دہلی کو چھوڑ چکے تھے۔ جس وقت گلزار ابراہیم لکھا گیا (۱۱۹۷ یا ۱۱۹۸ ہجری) اُس وقت وہ مرشد آباد سے دکن آچکے تھے، بلکہ اس سے بہت پہلے چمنستان شعرا کی تالیف کے وقت وہ دکن میں موجود تھے۔ جس وقت شفیق نے اُن کے حالات لکھے ہیں (۱۱۷۵ ہجری) اُس وقت دونوں میں خط و کتابت ہوتی تھی۔ گل رعنا کے بیان کے مطابق اُن کی عمر کا آخری حصہ حیدرآباد میں گذرا، اور شفیق نے بھی لکھا ہے کہ وہ اُن سے حیدرآباد ہی میں جاکر ملے اس لئے خیال ہے کہ ۱۱۷۵ھ ہجری میں وہ حیدرآباد ہی میں تھے

اِن سب بیانات میں تو ربط پیدا ہو جاتا ہے لیکن گلشن گفتار کا بیان ایسا ہے جو اس سلسلہ کو درہم برہم کر دیتا ہے، اُس میں ہے کہ آصف جاہ نظام الملک کے زمانہ میں حیدرآباد آئے۔ یہ نہیں معلوم کہ کس سنہ میں لیکن یقین ہے کہ ۱۱۶۵ھ ہجری سے پہلے۔ اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ دہلی جانے اور علامہ آزاد کو سورت میں ملنے سے پہلے ایک مرتبہ حیدرآباد آچکے تھے

اِن سب باتوں کے بعد یہ پتہ لگانا کہ وہ کب پیدا ہوئے کسی قدر دشوار ہے، لیکن ہاں میر آزاد۔ فتح علی اور خواجہ حمید نے اُن کا ذکر جیسے لفظوں میں کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی عمر ان تذکروں کے لکھے جانے کے وقت کافی ہوگی۔ میر اور آزاد کا بیان ۱۱۶۴ھ ہجری کا ہے اور موخر الذکر تذکرہ نویسوں کا ایک سال بعد کا، لیکن ان میں سے ہر ایک انھیں ادب اور احترام کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ اس وقت اُن کی عمر تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال کی ہوگی۔ اس طرح پیدائش ۱۱۳۰ھ ہجری کے قریب ہوسکتی ہے۔ وفات کا سن گل رعنا میں ۲۱۔ رجب ۱۱۸۹ھ

۵۱ مؤلف گل رعنا نے ان کے والد کو سلوتی لکھا ہے۔ میں نے چمنستان شعرا، نکات الشعراء، مخزن نکات۔ گلشن گفتار۔ گلزار ابراہیم، تذکرہ ریختہ گویاں، تحفۃ الشعراء اور سرو آزاد میں دیکھا تو سوائے گردیزی کے سب متفق ہیں کہ وہ سورت کے باشندے تھے اور اُس نے بھی سلون کا نہیں سورت کا لکھا ہے اور قائم نے نام بجائے سعد اللہ کے عزیز اللہ لکھا ہے۔ سرو آزاد میں "سلوتی سورتی" لکھا ہے جس کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے۔

۵۲ نکات الشعراء صفحہ ۹۰ ۵۳ مخزن نکات صفحہ ۶۵

۵۴ چمنستان شعراء صفحہ ۲۲۶

درج ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں۔

علمیت | عزلت کے علم و فضل کا ذکر ہر تذکرہ نویس نے بڑے طمطراق سے کیا ہے:۔

(۱) "فضل و کمال ایشاں از تحریر و تقریر بیرون است"

(۲) "ہیچ احدے از فضلا و علمائی توانست کہ بہ بحث علم تقابل ایشاں دم زند... (گلشنِ گفتار

(۳) "مردے فاضل و عالم" (مخزنِ نکات)

(۴) "جامع اقسام فضائل است" (تحفۃ الشعراء)

(۵) "در معقولات حیثیتے خوب بہم رسانیدہ" (سروِ آزاد)

(۶) "درویش وضع، عالم فاضل" (نکات الشعراء)

اِن سب بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک جید عالم تھے، علوم منقول کے علاوہ معقولات میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے، اس سے بھی اُن کی عمر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک نوعمر شخص اتنا عالم و فاضل ہرگز نہیں ہوسکتا کہ علامہ آزاد اور میر جیسے نازک مزاج اُس کی اتنی تعریف کریں۔

شفیق نے تو ان کی اتنی تعریف کی ہے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ اگر ان کے بیانات کو مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزلت سے بڑھکر کوئی دوسرا عالم ہی اُس زمانہ میں نہیں تھا۔

شاعری | ہر تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ عزلت فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، لیکن اُنھیں زیادہ شوق اردو ہی میں کہنے کا تھا۔ اور اُن کا اُردو کا کلام ایسا ہے کہ میر صاحب تک نے اُس کی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں "بنسبتے تمام سخن دارند، از اسالیب کلام شاں واضح می گردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند" علامہ آزاد۔ شفیق۔ قائم۔ خواجہ حمید سب نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ اتنی تعریف کے مستحق ہرگز نہیں ہیں جتنی لوگ کرتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہیں تو ان کے کلام پر کچھ لکھنے اور اُسے عام نظروں کے سامنے لانے سے فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ مظہر، میر، سودا، درد اور یقین کی شاعری نے شمالی ہند میں اپنا سکہ جما رکھا ہے۔ اور اُس کے آگے لوگ دکن کے شاعروں کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے، حالانکہ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جن کا کلام بیحد بامزہ ہے۔ ایسے ہی شاعروں میں عزلت بھی ہیں۔ ان کے کلام میں میر اور درد کی سی درد بھری باتیں نہ ہوں لیکن ایسے گئے گذرے بھی نہیں کہ آبرو، یکرنگ اور ناجی جیسے شاعروں کا ذکر تو لوگ جی کھول کھول کر کریں اور ان کا نام تک نہ لیں۔

عزلت کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ فارسی

شاعری اور اُس کے صوری و معنوی اثرات اُردو پر اپنا گہرا اثر جار ہے تھے اپنے کلام کو ملکی خصوصیات سے مالا مال رکھا، اور بارہ ماسہ۔ پہیلی۔ کبت۔ جھولنہ اور مکرنیوں کے علاوہ جا بجا اپنی غزلوں میں بھی ملکی روایات اور خصوصیات کو نظم کیا۔

بارہ ماسے میں جہاں جا بجا فارسی کے انداز میں شعر نظم کئے ہیں وہاں دوسری طرف بالکل ہندی کے رنگ میں ڈوب کر ہر مہینہ کی خصوصیات بھی ملکی روایات اور کیفیات کو نظر میں رکھ کر نظم کی ہیں۔

اساڑھ کا مہینہ:۔ جھلاتی ہوں میں جھولا سانس کا ہائے ✤ جو پی آویں تو دل کا ملغ سکھ پائے

صرف ایک شعر میں جھولے کا ذکر کرکے ہندوستان کی برسات کی کیفیتوں کی یاد تازہ کی ہے۔

ساون:۔ یہ ساون کال سن بھادن میں آیا مرے رونے نے سکھ کا گھر ڈبایا

ہندوستان کی عورتیں ہندی شاعری میں ہمیشہ اس خصوصیت کے ساتھ یاد کی جاتی ہیں کہ ساون آیا اور اُنھوں نے "پی" کی یاد میں آنسو بہانے شروع کردیئے۔ عزلت نے بھی اُسی خیال کو ذہن میں رکھکر یہ شعر نظم کیا ہے۔

بھادوں:۔ اُٹھے ہے ہوک۔ جب کوئل اُٹھے کوک ہلگتی ہوں کمک کو موڑ دے ھوک

اسی طرح کنوار۔ کاتک۔ اگھن۔ پوس۔ ماگھ۔ پھاگن۔ چیت۔ بسیاکھ کے ذکر کے ساتھ مقامی رنگ میں ڈوب کر بڑے مزے مزے کے شعر کہے ہیں۔

اُردو میں مکرنیوں کا رواج نہیں۔ اس کی ابتدا امیر خسرو کے وقت سے ہوئی اور یہ روش خسرو ہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ عزلت نے اس یاد کو پھر تازہ کیا۔ صرف ایک مکرنی سنیئے:۔

دا ہن بھیگا سبھی سنگار موتی بھاگ جگاؤں ہار

سو سر چڑھو پی لاگے نیکا ارے کوئی ساجن نا سکھی ٹیکا

اسی طرح اُنھوں نے بہت سے دو سخنے بھی کہے ہیں۔

غزلوں میں عزلت نے مختلف مقامات پر ان چیزوں کو نئے نئے انداز میں نظم کیا ہے کہیں ہولی اور اُس کی خصوصیتوں کا ذکر ہے، کہیں بسنت کی رنگینیاں یاد آگئی ہیں کہیں دیوالی کی روشنی سے کلام میں حسن قبول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، دو ایک شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہے گلال ابر کہ میں دوبارا رنگیلا سانولا لالہ اور مہتاب یہ ڈھلے ہیں دل ہولی کی رات

فقیروں سے نہ ہو بے رنگ لالا فصل ہولی میں ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگوا ہے

اُڑانا خاکساروں کا غبار آتنا خوش آتا ہے
دھلینڈی کھیلیں کے دن وہ بے پروا مچاتا ہے

---

زاہدوں پر نہ ڈال لال گلال
چاہیئے پاس شرع اَبر کھ سے

---

چلی ہے موسم ہولی میں بلبل اُس گل بن
کوئی گلاب کی پچکاری بھر کے مارے اُسے

**جنون اور اُس کی کیفیتیں** ہر شاعر اپنے ملئے کچھ خاص مضامین مخصوص کر لیتا ہے اور جب اُس رنگ میں ڈوب کر شعر کہتا ہے تو اُس کی روش دوسرے شاعروں سے بالکل جداگانہ ہو جاتی ہے۔ یقینؔ کے دیوان میں جنون کے متعلق جو شعر کہے گئے ہیں اُن میں کچھ عجب کیف و سرمستی ہے۔ عزلت پر یقینؔ کا خدا جانے کیوں آتنا گہرا اثر پڑا کہ اُن کی اکثر غزلیں یقینؔ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں، اُن کا مفصّل ذکر یہاں بیکار ہے، البتہ عزلت کے ایسے شعر جب مختلف موقعوں پر مثال کے لئے پیش کئے جائیں گے تو اُسی وقت یقینؔ کی غزلوں کا بھی ذکر کر دیا جائیگا۔ لیکن یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ یقینؔ اور عزلت میں اس مماثلت کے علاوہ دوسری خاص مماثلت ایسے موقعوں پر ہے جہاں اُنھوں نے جنون کی مختلف کیفیتوں یا جنون کا ذکر کیا ہے۔ موازنہ بے کیف سی چیز ہے۔ اس لئے صرف عزلت کے ایسے شعر حاضر ہیں:۔

جیوں بگھولا ہوں میں طوفان جنوں کا گرداب
سر کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں۔ راہ کہیں

طرز بیان میں کس قدر بے تکلفی اور روانی ہے۔

عقل کی تدبیر کیا مجنونِ سودائی کے تئیں
باغباں در کار کب ہے نخلِ صحرائی کے تئیں

اِس شعر میں درد اور مجبوری کی اُس کیفیت کا اظہار ہے جس سے فرزانے بے بہرہ ہیں۔

کھلا کے دل جیسے بالا سو ہے مرا والی
جناب پاک جنوں مدظلہ العالی

زور کلام کے ساتھ جذبات کی گہرائی کا کس قدر مکمل مرقع ہے۔

جنوں سے ربط ہے جوں موج آب آتنا مرے جی کو
کہ نقش زندگی مٹ جا نہ پھاڑوں گر گریباں کو

اِس مضمون کو کس قدر شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے۔

اس جنون وحشت اثر کی بزم رنگین آبادی میں نہیں ویرانہ میں جمتی ہے اس لئے جنوں کے دیوانے دوسروں کو بھی اُسی طرف بلاتے ہیں ؎

بیاباں کے گلوں سے بوئے رنگ درد آتی ہے — ارے بلبل چمن سے دل اُٹھا، آ بول صحرا میں

اب یہاں کے واحد حکمران مجنوں کا نام جنون کی جدت لذتوں میں ذوقِ حسن پیدا کرتا ہے اُس کا ذکر سنیئے ؎

نہ پوچھو یہ بگولا ہے مرا ہم تول صحرا میں — یہ قبرِ حضرتِ مجنوں ہے ڈانواڈول صحرا میں

یا ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو، شاعرانہ اعجاز کی کیف آگیں لذتیں اُس کے ہر لفظ میں سحر پیدا کرتی ہیں ؎

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اُجڑا سمجھوں — مشتِ خاک اپنی اُڑا کر اُسے صحرا سمجھوں

جنونِ فتنہ پرور کی کیفیتوں کو بیان کرنے میں جو شعر عزلت نے کہے ہیں اُن میں کہیں درد ہے اور کہیں اثر۔ کہیں زورِ کلام ہے اور کہیں شاعرانہ اندازِ بیان کی لطافت۔ اِن چیزوں کے دیکھنے سے عزلت کی شاعرانہ فطرت کا اندازہ رفتہ رفتہ ہونے لگتا ہے لیکن اُن کے کلام کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم کرنے سے پہلے اُس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈال لینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اُن کے چند ایسے شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں صفائی زبان کے علاوہ شاعرانہ اندازِ بیان اور جوش و سرمستی نے نئے نئے کرشمے دکھائے ہیں۔ یقین کی ایک غزل ہے ؎

نہ مرتا میں اگر صدقہ ترے جانے کے کام آتا — گرسنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

عزلت نے بھی ایک غزل اسی زمین میں کہی ہے۔ وہ شعر سنیئے ؎

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا — یہ آئینہ تھا تجھ خود بیں کے اترانے کے کام آتا

اس کا مقطع خوب کہا ہے ؎

لٹے عزلت کے موئے سر بیاباں کے ببولوں نے — جو بچتا یہ جنوں جاروب ویرانے کے کام آتا

کس قدر شاعرانہ کیف و سرمستی ہے۔

یقین نے ایک اور غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے ؎

گرا میں آنکھ سے تیرے جہاں کے ہاتھ کیا آیا — مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا

عزلت کا ایک شعر اسی زمین میں ملاحظہ ہو:۔

کیا ویراں مرا دل دلبروں کے ہات کیا آیا — یہ بیت اللہ توڑے سے بتوں کے ہاتھ کیا آیا

یقین کی مشہور غزل ہے ؎

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دَورِ پیمانے سے کیا نسبت

عزلت پر اس غزل کا بھی جو اثر پڑا اُس کا عکس ملاحظہ ہو ؎

وہ زلفوں سے نہ گذرے بلکہ اپنے جی سے ٹل جاوے — کہو میرے دلِ صد چاک کو شانے سے کیا نسبت

غیر آہ سرد نہیں داغوں کے جانے کا علاج — جز صبا کیا ہے چراغوں کے بجھانے کا علاج

اچھا شعر ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ یقین کی غزل اس زمین میں بھی موجود ہے۔

یقین کی غزل کا مشہور مطلع ہے ؎

دل ہمیں کہکر چلا تھا اپنے جانے کی خبر — پھر نہ دی ہمکو کسو نے اُس دوانے کی خبر

عزلت کا مطلع بھی دیکھئے معلوم ہوتا ہے سامنے رکھکر کہا ہے ؎

ہم رکھتے تھے پر نہ دل کے جانے کی خبر — آہ نے اُڑنے سے کچھ کہی اس دوانے کی خبر

یقین کی غزلوں میں ایک مضمون کئی جگہ نظم کیا گیا ہے اور اُس میں ہر جگہ نیا لطف ہے ایک آدھ شعر سُن کر اس کا اندازہ کیجئے۔

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالاں نے — نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گذرا

رکھا ہے گھیر اِن شہری غزالاں نے مرے دل کو — پھنسا ہوں اب تو بستی میں یہ ویرانے سے کہیو

عزلت نے اسی کیفیت کا اثر لے کر ایک ایسا ہی شعر کہا ہے، بہت مزیدار ہے ؎

غنیمت بوجھ لیویں میرے درد آلود نالوں کو — یہ دیوانہ بہت یاد آئیگا شہری غزالوں کو

دو ایک شعر اور سُن کر اس داستان کو ختم کیجئے ؎

برس مت ابر مت جا گا بگولا خاک مجنوں کا — خدا کے واسطے دشتِ جنوں کی ناک بہنے دے

تنہا چلا میں یوں طرفِ وادیٔ جنوں — زنجیر پاؤں پڑ کے مرے سات ہو گئی

---

متقدمین کے کلام کی ایک خصوصیت جو قریب قریب سب شاعروں میں موجود ہے، درد و اثر ہے۔ جس زمانہ میں اِس شاعری کی پرورش ہوئی عام طور پر سیاسی بے چینیاں تھیں اور ان کا اثر افراد پر بھی پڑا۔ شاعر اپنی سوسائٹی کے جذبات و خیالات کے ترجمان ہیں اس لئے اُن کے شعر اُسی درد کی تصویریں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جس شاعر کا دل خود اس چوٹ کے درد سے آشنا تھا اُس کے یہاں زیادہ سوز و گداز ہے اور جو خود اس کا شکار نہیں ہوا بلکہ اُس نے دوسروں کی تکلیفیں دیکھیں اُس کے یہاں اس درد و اثر، سوز و گداز میں آپ بیتی کا لطف نہیں۔ عزلت کے کلام میں بھی درد کی چاشنی ہے۔ لیکن میر یا درد کی سی تڑپ نہیں۔ البتہ ایک بات نئی ہے اور وہ یہ کہ اُن کے اس

قسم کے شعروں میں عموماً درد کے ساتھ طعن و طنز ضرور ہے اور اس طرح اُنھوں نے اپنا رنگ اپنے ہم عصروں سے کسی قدر الگ کر لیا ہے۔

پھیر کر منہ ہم سے کہتے ہو بُلاتا ہوں تمھیں
ہائے مت باتیں بناؤ ہم سے ہو بیزار تم

اِس شعر میں بیکسی اور درد ضرور ہے لیکن دوسرے مصرعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا ضبط کے حدود سے باہر ہو چکا ہے اور اب اُس کے درد اور تکلیف کا احساس ایسا نہیں کہ وہ اُسے آسانی سے برداشت کر سکے۔

مرنا بھلا۔ بد بھلی۔ محشر بھی سلح ہے
بے درد سے کسی کو نہ حق آشنا کرے

یہ شعر بھی ایسے ہی شخص کی زبان سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے جو اپنے تلخ تجربات سے بجید عاجز آ چکا ہے اور اب اُن کی پرورش اُس کے اختیار میں نہیں۔

بسے ہے تجھ میں دل پر دل کے تو جلنے کو کیا جانے
شرر پر جو گذرتی ہے سو پتھر کی بلا جانے

---

ہوش و دل لے کر ہمارا اب نہیں لیتا سلام
بے جواب اے بے مروت ہم نے تیرا کیا کیا

---

مت جھٹک ہم جلوں اُپر دامن
بات سُن راکھ اُڑا مت دے

---

مجھکو گلگرو نے خموشی سے کیا قتل سو کیوں
بلبلو تم کہو کیا منہ میں زباں ہے کہ نہیں

یقین کی ایک غزل ہے ع ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس۔ عزلت کی بھی غزل اس زمین میں ہے، ایک شعر سنئیے:-

نیم بسمل ہوا میں تیغ نگہ تب رکھ لی
کس بھلے وقت بُرا ہو گیا جلاد کہ بس

دنیا کے تلخ تجربوں سے عاجز آ کر مرتے وقت زبان سے یہ نکلتا ہے کہ ؎

چشم رکھتا ہوں، کوئی یک پل نہ رووے میرے بعد
آپ کو جوں شمع میں مرنے سے آگے رو چکا

عزلت کے شعروں میں سے ایسے بھی بہت سے ہیں جن میں طنز کا جذبہ اس سے کسی قدر زیادہ نمایاں ہے لیکن اُس میں مومن کے ادبی طنز کا لطف نہیں ؎

نخلِ اُمید بے وفاؤں سے
دل سلامت پھرے تو پھل پایا

---

عزلت کے کلام کی ایک دلچسپ خصوصیت اُن کی شوخی ہے۔ کبھی کبھی یہ شوخی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اُسے صرف ظرافت ہی کہکر پکارا جا سکتا ہے۔ چند شعر سُن کر اس کا اندازہ کیجئے جرأت اور داغ کے رنگ کی کس قدر مکمل ابتدا ہے ؎

گرد سے چہرہ بھرے آئے چمن میں دوڑتے — میں نے منہ چوما تو کہتے ہیں تمھارے منہ میں خاک

اسی رنگ کا ایک دوسرا شعر ہے جس میں اِس مخصوص رنگ کی جھلک کم ہے ؎

جلد مرگئے تری حسرت میں ہم — یہ ترا دیر کا آنا نہ گیا

ہنستے کیا ہو مرے رونے پہ اے دلدار بہت — تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت

اکثر شعر ایسے ہیں جن کی شوخی میں یہ تیکھا پن اور لگاوٹ نہیں، لیکن جرأت اور داغ کے رنگ کی جھلک ضرور ہے ؎

عشق گورے حسن کا، عاشق کے دل کو لے چلا — سانولوں کے عاشقوں کا دل ہے کالا کوئلا

---

بستہ جو ہنسے تیرے دہن پر تو چبا جاؤں — دم مارے جو عُناب ترے لب سے تو کھا جاؤں

جیسا کہ ایسے رنگ میں کہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، عزلت کے یہاں اِس شوخی اور ظرافت کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض بعض جگہ اِس قدر بدمذاقی پیدا ہوگئی کہ تعجب ہوتا ہے۔ ایسے شعروں میں سے صرف ایک ایسا شعر لکھتا ہوں جس میں اس بدمذاقی کا پرتو ذرا کم ہے، اسے پڑھکر اندازہ ہو جائیگا کہ عزلت نے اس سے آگے چلکر کیا کیا کہا ہوگا ؎

بہت منہ پہ وہ زلفیں آج بکھراتا ہے اے عزلت — وہ گالوں پر کسی کا زخمِ دنداں ہے لگا شاید

---

عزلت کے یہاں خمریات میں بھی اکثر شعر ہیں اور وہ پُر کیف بھی ضرور ہیں۔ یہ کیفیت بھی مایہ خمخانۂ یقین سے اُڑائی گئی ہے۔ یقین قدما میں خمریات کے بادشاہ ہیں اور اس رنگ میں جو کچھ کہہ گئے ہیں اُس کی مثال ہمارے دَور میں ریاض کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ عزلت کے شعروں میں بھی کہیں کہیں وہی مزا ہے ؎

حشر میں قبر سے کہتا ہی اُٹھے گا مے کش — کہ کہاں ہے مے کہاں جام کہاں ہے شیشہ

شوخیہ بُوجھو اُن کی نہ ہو کیوں نہ رہی مے خواری — چشم ہے جام و دل بادہ کشاں ہے شیشہ

---

# "زمانہ"

(از پنڈت اندرجیت صاحب شرما)

گیتی کے فسانوں میں ہے میرا ہی فسانہ ۔ ہر ساز سے میرا ہی نکلتا ہے ترانہ
ہر رنگ میں پاؤ گے مرا نقشِ یگانہ ۔ ہے نام مرا وقت لقب میرا زمانہ
مطلب ہی نہیں مجھکو یہاں آج سے کل سے
ہے یوں ہی مرا سکہ رواں روزِ ازل سے

مفلس کو بنایا کبھی شاہوں کو بگاڑا ۔ اس گھر کو بسایا کبھی اس گھر کو اجاڑا
بزدل کو ابھارا کہیں رستم کو پچھاڑا ۔ گیدڑ کو کیا شیر تو شیروں کو لتاڑا
اِس دستِ عنایت میں کرامات یہی ہے
نیرنگیوں میں میری ہر اک بات یہی ہے

آتا ہے فلک کو بھی مرے نام سے چکر ۔ گردش میں زمیں ہی نہیں دن رات برابر
چھایا ہے عجب رعب مرا شمس و قمر پہ ۔ خدمت سے مری ہو نہیں سکتے کبھی باہر
رہتی ہے حکومت مری ہر بحر میں بر میں
یکساں ہے نشانہ مرا بس خشک میں تر میں

ہنگامۂ ہستی میں ہے میرا ہی تلاطم ۔ سیاروں میں موجود ہے میرا ہی تبسم
ہستی کو بھلا دے جو وہ میرا ہے ترنم ۔ خاموش جہاں کو کرے میرا وہ تکلم
مدہوش مرے جام کو پی کر ہوئے انساں
گمراہ مری راہ میں آ کر ہوئے ناداں

پائے گا مرے بحر کا کوئی نہ کنارا ۔ ملنے کا کسی کو نہیں اس گھر میں سہارا
نیرنگیوں کا یہ مری ہوتا ہے اشارا ۔ کھا جائے نہ دھوکا کوئی انسان خدارا
کہتا ہوں یہ للکار کے ہے چال غضب کی
جو پھنس گیا اسمیں سے نکلنے نہیں دیتا

کچھ مجھکو تعلق ہے فنا سے نہ بقا سے اِس دل میں کہاں خوف ہو پھر روزِ جزا سے
پوچھو تو حقیقت کو مری جا کے خدا سے اِک لاگ سی رہتی ہے مجھے قبلہ نما سے
کھلتا جو کسی پر نہیں وہ راز ہے میرا
انجام ہے میرا نہ کچھ آغاز ہے میرا

یہ وقفِ خزاں میرا چمن زار نہیں ہے یہ دورِ طرب گردشِ پرکار نہیں ہے
اس بزم میں غم کا کوئی اظہار نہیں ہے یہ رنگِ سخن اور ہے بیکار نہیں ہے
ہے شیشۂ دل میں یہاں اِک اور ہی عالم
ہوتا ہی نہیں جس کا کبھی جوشِ جنوں کم

ہے ذاتِ مقدس مری توحید کا جلوا ہستی بھی مری شاہدِ مطلق ہے سراپا
اِک راز ہوں کونین کا میں بہرِ تماشا فطرت کا کرشمہ ہے ہر اک میرا کرشمہ
روشن ہیں سیہ خانے مری جلوہ گری سے
ہیں کعبہ و بت خانے میں میرے ہی تماشے

خالی جو نہ ہو مَے سے وہ میخانہ ہے میرا دُنیا کے لئے دُور میں پیمانہ ہے میرا
کاشانۂ دل بھی تو جلو خانہ ہے میرا دیوانہ خدا کا ہے جو دیوانہ ہے میرا
گنجینے ہیں قدرت کے نہاں سینے میں میرے
فطرت کے ہیں اسرار اس آئینے میں میرے

جس نے مجھے ہر آن میں دل سے نہ بھلایا جس نے مری درگاہ میں سر اپنا جھکایا
جس نے کہ مری خاک کو آنکھوں سے لگایا اُس نے ہی مری ذات سے کچھ فیض اُٹھایا
برگشتہ ہوا مجھ سے جو ٹھوکر اُسے چھوڑا
ساحل پہ سرِ شام ڈبو کر اُسے چھوڑا



# موجودہ تعلیم نسواں پر ایک نظر

(از شریمتی شوکماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی)

آج کل ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے اس کا طبقۂ نسواں پر کیا اثر پڑ رہا ہے اس پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہوگی۔ اسکی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کچھ ایسی کشمکش کی زندگی ہے جو ایسے نازک مسئلوں پر غور و خوض کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ اس کشمکش میں سخت ترین عنصر کسب معاش کا ہے جس کے باعث ہر شخص ہر وقت مصروف، متفکر اور پریشان رہتا ہے۔ آج میں اس تعلیم پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور چونکہ کسی معاشرتی مسئلہ پر تنقید کرنے سے پہلے ایک معیار تنقید قائم کرنا لازمی ہوتا ہے اس لئے تعلیمی مسئلہ پر بحث کرنے کیلئے بھی ہمیں ایسا کرنا ہوگا۔

ہندو دھرم میں انسان کا سب سے بڑا نصب العین روحانی ترقی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ہمارا تعلیمی معیار اور زندگی کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں آجکل مغربی طریقوں اور اصولوں پر تعلیم دیجاتی ہے جو مغرب کے نصب العین کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس نصب العین کے اعتبار سے وہی شخص سب سے زیادہ کامیاب ہے جو بہت دولتمند ہے اس کے مطابق انکی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ روحانی ترقی کے اعتبار سے اہنسا، تیاگ، خدمت، پرُاپکار، حیا اور ستی دھرم وغیرہ تعلیم کے نتائج ہونے چاہئیں۔ اس کے خلاف مغرب کہتا ہے "بخور و خوش باش" یعنی (Eat, drink & be merry) پہلے کا مطلب نفس کشی ہے اور دوسرے کا نفس پروری۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہندوستانی روز ازل سے ہی ان اصولوں پر عمل کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں ہندو دھرم کے جزئیات منتشر ملیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ ان جزئیات میں بعض ایسی باتیں داخل ہو گئی ہیں، جو غیروں کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں جس کا باعث ہندو دھرم نہیں بلکہ ہماری جہالت ہے۔ یہ برائیاں مغربی تعلیم سے دور نہیں ہوسکتیں اور نہ یہ تعلیم ہماری قدرتی افتاد طبع و تربیت کے موافق ہوسکتی ہے کیونکہ ہماری عظیم الشان روحانی و اخلاقی روایات، ملکی ماحول اور ہماری قدیم زندگی کے اثرات اب تک غیر محسوس طریقہ پر ہمارے دل و دماغ کی نشو و نما کو کسی اور ہی منزل کیطرف کھینچتے ہیں اور مغربی تعلیم کسی دوسری طرف مائل کرتی ہے نتیجہ باطنی

~~کشمکش اور~~ بے اطمینانی ہوتا ہے۔

دوسرا اہم فرق مغربی اور مشرقی آدرشوں (Ideals) میں ازدواجی زندگی کے متعلق ہے۔ شاستروں میں عورت کو "اردھانگنی" یعنی مرد کا نصف جسم کہا گیا ہے۔ عورت و مرد کے باہمی تعلقات کا اس سے زیادہ پُرمعنی اور صحیح تخیل دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت و مرد کا مشترکہ وجود ہی ایک فرد انسان کہا جا سکتا ہے۔ اس کے رو سے باہمی زندگی ایک دوسرے کی رفاقت و محبت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اس زندگی کی تکمیل کے لئے ایک کو دوسرے کا جزو حقیقی سمجھنا اسکی محافظت و خدمت کرنا اور ایک کو دوسرے پر اعتماد رکھنا لازمی ہے۔ عورت کمزور ہے مرد طاقتور۔ عورت کا فرض مرد کی خدمت اور محبت ہے، اور مرد کا محبت و محافظت۔ محافظت میں جسمانی محافظت اور کسب معاش دونوں داخل ہیں۔ میں نے عورت کے فرائض میں خدمت کو بھی شامل کیا ہے، اس پر بعض نئی روشنی کی تعلیم یافتہ بہنیں ناک بھوں چڑھائیں گی مگر خدمت کے بغیر محبت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ انسان کا دوسرا اہم فرض انسان کی خدمت ہے۔ سب سے پہلے ہم پر ہمارے والدین کا فرض ہے اُس کے بعد سوسائٹی کا اس کے بعد ہمارے ملک کا، اس آخری فرض کو ادا کرنا موجودہ زمانہ میں بچے بچے پر لازم ہے۔ بچوں کا سب سے پہلا مکتب آغوش مادر ہے۔ اگر ماں ہی اصول خدمت سے بیگانہ ہے تو بچے کیا ماں باپ کی، کیا سوسائٹی کی، اور پھر کیا ملک کی خدمت انجام دے سکیں گے۔ اسی لئے عورتوں کا سب سے پہلا دھرم اصول خدمت کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔

مغربی اصول کے مطابق ازدواجی زندگی ایک سماجی (Social Contract) معاہدہ ہے۔ اس اعتبار سے ازدواج زندگی کا کاروباری پہلو ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے سمجھوتہ میں بے لوث محبت کی چنداں گنجایش نہیں ہوتی۔ میری مراد اس محبت سے ہے جو روحانی مسرت کا مخزن اور روحانی ترقی کی معاون ہوتی ہے۔ مغرب والے بھی عورت کو مرد کا (Better Half) یعنی "نصف بہتر" مانتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ مغرب میں عورت و مرد اپنا الگ الگ وجود رکھتے ہیں۔ اور اپنے اپنے طرز عمل میں بالکل آزاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ "بخور و خوش باش" بھی شامل کر لیجئے تو مرد و عورت جدا جدا ہمہ تن خود پرستی و خود غرضی کا مجسمہ نظر آئیں گے، اور انکی زندگیاں عشرت پرستی و خود آرائی کی تفسیریں ہیں۔ ایسی زندگی میں محبت نہیں پیدا ہو سکتی اور خدمت کا تو ذکر ہی کیا۔ جن لوگوں کا ربط ضبط انگریزی سوسائٹی سے ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انگریز عورت سے اگر اُس کا دوست ملاقات کر رہا ہے تو اس کا شوہر اس تنہائی کی صحبت میں ہرگز مخل نہیں ہو سکتا کیا کوئی ہندوستانی مرد اس بات کو گوارا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جس دن ایسا ہوگا ہندوستانی ہندوستانی نہ رہ جائے گے۔ اُن کی فطرت ہی بدل جائیگی مگر یہ

ناممکن ہے۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ انگریز مرد جب بیمار پڑتا ہے تو اس کی بیوی کے تمام فرائض مریض کو وقت پر دوا دینے اور دو چار تشفی آمیز کلمات کہہ دینے تک محدود رہتے ہیں۔ ہندوستانی جب بیمار پڑتا ہے تو وہ صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی ہر وقت اس کے پاس موجود رہے بلکہ خود عورت اس کے پاس موجود رہنے اس کی تیمارداری میں ہمہ تن مصروف رہکر سخت سے سخت تکلیف جھیلنے میں اپنی زندگی کی غایت سمجھتی ہے اور اس میں دونوں کو وہ راحت حاصل ہوتی ہے جس کا بدل دنیا کی کسی مسرت میں موجود نہیں۔ یہ وہ اثرات ہیں جو کبھی ہندوستانی دل سے محو نہیں ہو سکتے۔ سیتا اور ساوتری کے تصورات و اثرات ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتے مگر تعلیم دور کرانا چاہتی ہے۔ نتیجہ وہی یعنی اطمینانی اور بے چینی اور ایک دوسرے سے بیگانگی و بے اعتنائی اور زندگی کی کشمکش میں اضافہ ہوگا۔

ہندوستانی عورت کا سب سے بڑا جوہر عصمت و حیا ہے۔ عصمت کے معنی سب جانتے ہیں۔ اور حیا عصمت کا جزو لاینفک ہے۔ حیا کے معنی جذبۂ شرم ہی کے نہیں بلکہ اُس میں جسم کو ڈھانکنا بھی شامل ہے۔ جو لوگ انسان کو حیوانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور حیا سوز آزادی کو روا رکھتے ہیں اُنکے خیالات اُنھیں کو مبارک ہوں۔ مگر جس ملک نے روحانی ترقی میں اپنا ثانی نہیں رکھا وہ ان خیالات کو کبھی روا نہیں رکھ سکتا۔ جب میں اپنی کسی بہن کو اسٹیشن یا کسی دوسری جگہ اس طرح دیکھتی ہوں کہ نصف رانوں تک گھٹنا اور وہیں تک فراک منڈھے، ہاتھ پاؤں سب کھلے، سر ننگا، چوٹی کھلی پشت پر پڑی بل کھاتی ہے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ آزادی کی یہ تعلیم و تہذیب غریب ہندوستانیوں کو کس گھاٹ لگائے گی۔ پردہ دور کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عریانیوں کو اُن کی جگہ پسند کیا جائے اس قسم کا پہناوا سراسر بے شرمی اور بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں اور سر کھلا رہنے سے صحت اچھی رہتی ہے وہ دیدہ و دانستہ اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیہاتی لڑکیاں اُن کی لڑکیوں سے کہیں تندرست و توانا ہوتی ہیں مگر وہ اتنی کوتاہ لباس نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسمانی مشقت کرتی ہیں اور تازہ ہوا میں سادہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ مانا کہ شرم و حیا ایک دلی کیفیت ہے لیکن یہ وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو بغیر سمجھے یا سمجھائے ہوئے پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ بغیر ظاہری عمل کے قائم رہ سکتا ہے۔ اب اس کا ظاہری عمل اگر وضع و لباس نگاہ و زبان سے متعلق نہیں ہے تو کس سے متعلق ہے۔ وضع و لباس میں بے پردائی اور بدن کی عریانی، بے حیائی نہیں تو کیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ محض غلامانہ

تقلید کے اثر سے کرتے ہیں۔ جس خطہ زمین پر عورتوں کے جسمانی حُسن کی نمائش منعقد کی جائے وہاں شرم و حیا کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟ وہاں کے تعلیمی طریق و اصول اپنی ہی جیسی بے غیرت دنیا کی طرف رہنمائی کریں گے۔ اس تعلیم کی عورت کا تصور فیشن کا نمونہ یعنی گٹا پارچہ کا نیم عریاں کھلونا، ایک ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ دوسرا ہاتھ پیانو پر۔ ابھی تک مردانہ کھیل تماشوں کے ساتھ گانا بھی عورت کی تعلیم کا جزو سمجھا جاتا تھا مگر اب سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا یعنی ناچنے کی بھی تحریک شروع ہو رہی ہے اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ بعض مقتدر اخبارات اُس کی تائید میں خامہ فرسائی کرنے میں مصروف ہیں۔ گانا ہمارے ملک میں عبادت میں شامل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ گانے سے جو روحانی کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور جو تہذیب نفس اِس سے ہوتی ہے وہ اس بات کی مقتضی ہے کہ اُسے عبادت کا ایک جزو سمجھا جائے۔ مگر گانا اسی طریقہ پر ہو جو عورت کے حُسن باطنی میں اضافہ کرے نہ اس کو ایک تفریحی کھلونے کی صورت میں پیش کرے۔ کیا اسی مقصد سے گانے کی موجودہ تعلیم دی جاتی ہے؟ ہرگز نہیں؟ اب ایک طرف تو مکمل آزادی کی تعلیم خود پرستی سکھاتی ہے دوسری طرف فیشن کی تقلید خود آرائی کی تعلیم دیتی ہے۔ غیرت و حیا سے اگر کچھ واسطہ رہتا ہے تو محض زبانی اور لفظی۔ اس پر گانا بجانا مزید براں ناچنا بھی ہوا تو پھر ہندوستان کی عورت کیا ہو جائیگی؟ اسکے تصور سے روح لرزتی ہے۔ مغربی تہذیب میں عورت کی جو حالت ہے اسکے متعلق والد صاحب[1] کی ایک نظم "ترغیب غیب" سے چند اشعار یہاں درج کرتی ہوں۔

نئی محفل نئے آئین ترتیب — ہوئیں عریانیاں معراج تہذیب
زن و شو میں کوئی رشتہ نہیں ہے — فقط پابندیٔ نفس لعیں ہے
اُڑی ہے طبقۂ نسواں سے غیرت — مزاجوں میں ہے بیباکی سفاہت
مدارِ زندگانی زن و شو — وفادارانہ ربط و لطفِ دل جو
وہ جانِ حُسن انداز نسائی — غیورانہ وہ نازِ دلربائی
وہ روحِ زیست ایثار و محبت — محبت میں وہ روحانی مسرت
خراب حسرت مردانگی ہیں — مکدر سارے لطف خانگی ہیں
ہوس کی عشق پر ہے حکمرانی — چلے ہیں ازدواج امتحانی
مسلط ہے بلا حیوانیت کی — پریشاں روح ہے انسانیت کی

[1] حضرت جگر بریلوی

اس کے بعد ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ موجودہ طریقہ تعلیم ہندوستانیوں کی مالی حالت کے ہاں تک مناسب ہے؟ ہندوستانیوں کا افلاس ماتم کرنے کے قابل ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ تعلیمی درسگاہیں جھونپڑوں میں قائم کی جائیں اور اُستاد طلبا یا طالبات کو ٹاٹ پر بٹھا کر تعلیم دیں۔ جسقدر روپیہ آجکل تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اُس کو وہی والدین جانتے ہیں جو رات دن محنت و جانفشانی سے روزی کماتے ہیں۔ یہ مسئلہ بذات خود ایک جداگانہ بحث کا محتاج ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال یہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس قدر گراں تعلیم کا بار دو چار فیصدی متمول حضرات کے سوا عام ہندوستانی برداشت نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے اعلیٰ دماغ، مقتدر اور ذی اثر رہنمایانِ قوم ان تمام باتوں کو مدنظر رکھکر اپنے آدرشوں اور قومی و ملکی ضروریات و روایات کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کریں۔

تعلیم نسواں بہرحال ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ تعلیم کے زہریلے اثر کو کسطرح دور کیا جائے یا یوں ہی بے پروائی سے اسے پھیلنے دیا جائے حتیٰ کہ مرض لاعلاج ہو جائے۔ قبل اس کے کہ کوئی موثر تدبیر سوچی جائے، ہر شخص کو، خصوصاً تعلیمیافتہ گھرانے کی مستورات کو، یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس قسم کی تعلیم سخت مُضر ہے۔ اور اُن کو اپنے بچوں کے دلوں میں اپنی تربیت سے ہندوستان کے رفیع الشان آدرشیں اس طرح نقش کر دینا چاہیے کہ زمانہ کی مخالف ہواؤں کا اُن پر کچھ اثر نہ ہو سکے۔ جب تک یہ نہو گا اس معاملہ میں کسی قسم کا غم و غصہ بیکار ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ ہندوستانی بہروپئے بنتے جائیں گے۔ ان کی ظاہری و باطنی زندگی میں کبھی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے گی۔ اور وہ حقیقی مقصد حیات سے روز بروز دور تر ہوتے جائیں گے۔

---

## رُباعی

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا
اک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی

حضرت رواں مرحوم

# داراشکوہ کا قتل

(از و کرما دیتہ سنگھ نگم ایم - اے، ایل ایل - بی وکیل لکھنؤ)

شاہجہاں کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، سب سے بڑے لڑکے کا نام داراشکوہ، دوسرے کا شجاع، تیسرے کا اورنگ زیب اور چوتھے یعنی سب سے چھوٹے کا نام مراد بخش تھا۔ بڑی لڑکی کا نام جہاں آرا اور چھوٹی کا روشن آرا تھا۔ یوں تو شاہجہاں اپنے سبھی بچوں کو دل و جان سے چاہتا تھا مگر دارا و جہاں آرا کو سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دارا کو ہمیشہ اپنے ساتھ دلی و آگرہ میں رکھتا تھا اور باقی تینوں لڑکوں کو مختلف صوبوں کا صوبیدار بنا دیا تھا۔ اس طرح اورنگ زیب دکن کا، شجاع بنگال کا اور مراد گجرات کا صوبہ دار تھا۔ شاہجہاں دارا کو اتنا چاہتا تھا کہ اپنے بعد دلی کے تخت پر اُسی کو بٹھانا چاہتا تھا، دارا بھی خود کو باپ کا لاڈلا بیٹا سمجھتا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ سب بھائیوں کی شکایتیں باپ سے کیا کرتا اور جو کچھ اُن کے خلاف چاہتا باپ سے کرا لیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب نیز دوسرے بھائی دارا کو نیچا دکھانے کی ہمیشہ سازش کیا کرتے تھے۔

اتفاق سے ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں یک بیک اتنا بیمار ہو گیا جس سے دربار درکنار جھروکے پر بھی بیٹھنا بند ہو گیا۔ اس سے تمام آگرہ میں یہ افواہ اڑ گئی کہ بادشاہ فوت ہو گئے ہیں۔

یہ افواہ سنتے ہی دوکانداروں نے اپنی اپنی دوکانیں بند کر دیں اور تمام شہر میں کئی دن تک ہڑتال رہی۔ تمام رعایا شاہجہاں کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھی۔ ادھر جب اورنگ زیب و شجاع و مراد نے یہ افواہ سنی تو فوراً اپنی اپنی فوجیں تیار کر کے آگرہ کی طرف چل دیئے۔ اگرچہ یہ تینوں بھائی دارا کے یکساں مخالف تھے، مگر آپس میں بھی یہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔

تینوں میں اورنگ زیب سب سے زیادہ چالاک و شاطر تھا، جس نے اپنی حکمت عملی سے مراد کو اپنی طرف ملا لیا اور دونوں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ آگرہ کی جانب چل دیئے۔ ادھر سے شجاع بھی اپنی فوج لیکر آگرہ کی طرف بڑھا۔ جب دارا کو یہ خبر ملی تو اُس نے کہلا بھیجا کہ والد

بھی زندہ ہیں اس لئے تم لوگ اپنی اپنی جگہ واپس جاؤ۔ مگران لوگوں کو دارا کی بات پر اعتبار نہ آیا اور وہ آگرہ پر چڑھ آئے۔ یہ دیکھکر دارا نے بھی اپنے بڑے لڑکے سپہر شکوہ کو ان کے مقابلہ کے لئے بھیجا چنانچہ اُس نے شجاع کو شکست دیکر بھگا دیا۔ اس کے بعد دارا خود اورنگزیب و مراد کے مقابلہ کے لئے گیا سامو گڈھ کے میدان میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی مگر فتح اورنگزیب کے ہاتھ رہی۔ فتحیاب ہوتے ہی اورنگزیب نے آگرہ کے قلعہ کو گھیرلیا اور اپنے بڈھے باپ کو قید کرکے خود تخت کا مالک بن بیٹھا۔ غریب دارا اپنی جان بچاکر اُسی دن رات کو اپنی بیوی دو لڑکیوں، اپنے لڑکے سپہر شکوہ اور چند وفادار سرداروں کے ساتھ اجمیر کی طرف بھاگ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی اورنگزیب نے جے سنگھ کو دارا کے تعاقب کے لئے بھیجا۔ جے سنگھ ایک بڑا ہوشیار اور بہادر سردار تھا اُس نے فوراً سروہی، پالن پور، کاٹھیاواڑ، کچھ و گجرات وغیرہ کے حاکموں کو لکھ بھیجا کہ جہاں کہیں بھی دارا ملے اُسے فوراً گرفتار کرلیا جائے۔ یہ خبر پاتے ہی گجرات کے افسروں نے دارا کے سردار سید محمد بخاری کو احمدآباد میں گرفتار کرلیا۔ دارا کے جاسوسوں نے فوراً بخاری کی گرفتاری کی خبر دارا کے پاس بھیجدی جو اُس وقت گجرات کے صدر مقام سے اڑتالیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ خبر سنتے ہی دارا کے ہوش اُڑگئے اور اُس کے بیوی بچے رونے لگے۔ کیونکہ جے سنگھ نے چاروں طرف سے اُس کا راستہ بند کردیا تھا۔ اُس وقت اُس کے پاس ایک گھوڑا ایک بیل گاڑی، پانچ اونٹ اور کچھ خچر تھے، اور وہ خود معمولی ململ کا کرتا پاجامہ اور ایک آٹھ آنے والا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ ایسی مصیبت میں اُس کے ایک سردار فیروز نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑدیا اور اورنگزیب سے جا ملا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد دارا ہندوستان کی سرحد پر درۂ بولان کے قریب پہونچا اور ایران جانے کا ارادہ کیا مگر اُس کی بیوی مانع ہوئی۔ خوش قسمتی سے اُسی وقت دادر کے زمیندار ملک جیون سے دارا کی ملاقات ہوئی۔ یہ زمیندار وہی شخص تھا جس کی دارا نے جان بخشی کرائی تھی جب شاہجہاں نے اُسے ہاتھیوں سے کچل ڈالنے کا حکم دیدیا تھا۔ ایسے دوست کو پاکر دارا کو بڑی تسکین ہوئی۔ مگر بدقسمتی سے اُسی وقت اُس کی بیوی نادرہ بانو بیمار ہوکر تین دن کے اندر فوت ہوگئی جس سے دارا کو بڑا صدمہ پہونچا۔ اس پر بھی اُس نے صبر و استقلال سے کام لیا۔ اور اُس کی لاش کو تجہیز و تکفین کے لئے چند وفادار سرداروں کے ساتھ لاہور بھیجدیا۔ یہ سخت غلطی تھی کیونکہ اب دارا کے ساتھ کوئی وفادار سردار باقی نہ رہا تھا پھر کیف دارا تین دن تک دادر کے زمیندار کے پاس رہکر ایران کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن راستہ ہی میں ملک جیون نے اُسے دھوکا دیکر گرفتار کرلیا۔ اس وقت

دارا کے پاس ایسے بہادر سپاہی بھی نہ تھے جو اس زمیندار کا مقابلہ کرتے۔ حالانکہ اُس کے لڑکے سپہر شکوہ نے حتی المقدور مقابلہ کیا مگر بے سود۔ چالاک ملک جیون نے فوراً دارا کی گرفتاری کی خبر جے سنگھ و بہادر خاں کے پاس بھیجدی جو اس وقت دریائے سندھ کے کنارے مقیم تھے، وہ فوراً ہی ادر پہونچے اور ملک جیون نے دارا، اُس کی دونوں لڑکیوں اور اُس کے لڑکے سپہر شکوہ کو ان کے حوالے کر دیا۔ بس یہیں سے دارا کی زندگی کا آفتاب غروب ہونا شروع ہوگیا جے سنگھ اور بہادر خاں دارا کو ۲۲۔ اگست ۱۶۵۹ء کو دلی لے آئے اور اُسے اورنگزیب کے خاص غلام نظر بیگ کے سپرد کر دیا۔

اُسی روز بدنصیب دارا اور اُس کے پیارے بیٹے سپہر شکوہ کو جو اس وقت صرف چودہ سال کا تھا ایک چھوٹے سے ہاتھی پر جس پر گدی کے سوائے اور کچھ نہ تھا، بٹھا کر تمام شہر میں گھمایا گیا۔ یہ نظارہ بڑا دردناک تھا۔ وہی دارا جو شاہی محل میں بڑے ناز و نعم سے پالا گیا تھا جسے کبھی خواب میں بھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی اُسی دارا کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا، سر پر ایک معمولی پھٹی ہوئی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ گلے میں جواہرات کے بجائے اسیری کا طوق پڑا ہوا تھا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ سر پر پڑ رہی تھی اور وہ دلی کی گلیوں میں گھمایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ نظر بیگ ہاتھی پر بیٹھا تھا اور اُس کے چاروں طرف اورنگزیب کے سپاہی ننگی تلواریں لئے ہوئے چل رہے تھے۔ دارا مارے شرم کے اپنا سر نیچے کئے ہوئے تھا۔ راستہ میں ایک فقیر نے چلا کر کہا کہ "اے دارا جب تو شہزادہ تھا مجھے کھانے کو دیتا تھا لیکن آج تیرے پاس میرے دینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔" یہ سنتے ہی دارا کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اور اُس نے فوراً اپنی پگڑی اُتار کر اُس کے آگے پھینک دی۔

جس طرف سے دارا کی سواری گذرتی تھی گھروں سے رونے چیخنے کی آواز سنائی دیتی تھی کیا بچہ، کیا بوڑھا اور کیا جوان، کیا مرد کیا عورت سبھی رو رہے تھے۔ برنیر (Bernier) ایک اٹالوی سیاح نے جو اس وقت دلی میں موجود تھا لکھتا ہے کہ دلی کے ہر گھر سے مرد عورت اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی ایسی دلدوز آوازیں سنائی دیتی تھیں گویا تمام شہر پر کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے۔ مگر دارا کو کون بچا سکتا تھا جو زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا اور اورنگزیب کے سپاہی ننگی تلواریں لئے ہوئے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

ادھر اورنگزیب نے ملک جیون کی غداری سے خوش ہوکر اُسے ایک ہزار سواروں کا سردار

**پریم بتیسی** یعنی اُردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند صاحب بی۔ اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے۔ قیمت حصہ دوم ۱۲

**رامائن مسدس** (مصنفہ جناب منشی رام جی مل صاحب کیوں سنبھلی) اس رامائن کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے مصنف کی جدت طراز ذہن رسا نے نازک و نادر استعارات اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں جو روحانی و وجدانی لطافت سے مملو ہیں۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں لے رہا ہے رامائن کے اندر نو تصویریں رنگین نہایت نفیس ہیں صفحات ۲۰۸ مجلد نفیس قیمت مجلد با تصویر ؏ با تصویر بلا جلد ؏ بلا جلد و تصویر ؏

**بیوہ** (مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی تازہ تصنیف) اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور انکی ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنیکی بھی کوشش کیگئی ہے کہ بیواؤں کیلئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ

**گھر گرستی** (مصنفہ مولوی سید بشیر حسن صاحب امروہوی مولوی فاضل) اس کتاب کے اندر قصہ اور مکالمہ کے پیرایہ میں عورتوں کو اچھی بیبیاں۔ اچھی مائیں اور رفیقۂ حیات بننے کی تعلیم دیگئی ہے ہر عمر کی عورتوں کو دلچسپ قصوں اور دلنشیں مثالوں کے ذریعہ سے تمام امور خانہ داری اخلاق و معاشرت سکھلائے گئے ہیں یہ بینظیر کتاب اس قابل ہے کہ لڑکیوں کو جہیز میں دیجائے کوئی شریف بی بی اور کوئی شریف گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے ہر ہائینس نواب بیگم صاحبہ رامپور کی سرپرستی میں یہ کتاب تیار کی گئی ہے قیمت ۱۲

# مجبور وفا

والدین اور اغیار کے ہاتھوں کیلاش اور کامنی کے سچے جذبات دلی کا کچلا جاکر ایک دردناک صورت اختیار کرنے اور آخر میں ایک کی جان پر بنجانے کا یہ الم انگیز واقعہ پنڈت کشن پرشاد کول ممبر انجمن خدام ہند لکھنؤ نے ایک دلگداز پیرایہ میں اس طرح لکھا ہے کہ انسان پڑھتے پڑھتے بیقرار ہو جاتا ہے چونکہ یہ ناول محض سوسائٹی کی اصلاح کیلئے لکھا گیا ہے اسلئے باوجود ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات کی ضخامت ہونیکے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ رکھی گئی ہے آپکے کتبخانہ اسکی ایک جلد سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔

**تاریخ ہند (عہد اسلامی)** غلام محمد لطیف نے ہندوستان کے عہد اسلامی کی یہ مختصر تاریخ طلبائے اسکول و کالج کی نفع رسانی کیلئے انگریزی زبان میں تحریر فرمائی ہے ضخامت زائد از دو سو صفحات قیمت ایک روپیہ عہ

**قربانی** یہ بھی پنڈت کشن پرشاد کول کا ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جس میں سوسائٹی کی اصلاح خصوصاً شادی بیوگان پر زور دیا ہے قیمت ۸

**بہار سخن** بابو شیام سندر لال صاحب برق ایڈووکیٹ سیتاپور کا لاجواب اور تاریخی تذکرہ جس میں نہایت تلاش و تجسس سے پانسو چھیاسٹھ ۵۶۶ ہندو شعراء ماضی و حال کے سوانح حیات و منتخب کلام مع ہر ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے جس سے فہرست دیکھتے ہی فوراً شاعر کا حال معلوم ہوجاتا ہے پرائیویٹ کتبخانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کی چیز ہے قیمت دو روپیہ عہ

**دنیائے راز** ابو الفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت عہ

**اثرستان** مشہور غزل سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پر تاثیر و نشتر ہے قیمت عہ

**سب کتابیں ملنے کا پتہ منیجر زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور**



# آپ کی بیوی کا حسن
## عمدگی صحت سے دمکنے لگے گا

زن و شوئی کی زندگی کے لطف کا دارومدار میاں اور بیوی دونوں کی صحت پر ہے۔ اگر آپکی بیوی کو کمزوری اور خالی الذہنی کی شکایت ہے تو وہ ماں اور بیوی کے فرائض پورے طور پر ادا نہیں کر سکیگی جس سے آپکو اور آپکے بچوں کو تکلیف ہوگی۔ لہذا آج ہی طے کر لیجئے کہ آپ اپنی بیوی کو سناٹوجن کھلانا شروع کر کے اسے از سر نو قوی اور تندرست بنائینگے سناٹوجن اسی غرض سے بنائی گئی ہے کہ عورت اور مرد دونوں میں یکساں نئی طاقت پیدا کرے۔ اس مشہور مقوی غذا کی ایک مرتبہ پوری خوراکیں استعمال کرنا حیرت انگیز نتائج دکھائیگا چند ہی روز بعد آپکی بیوی اپنی عمر سے کمسن اور زیادہ تندرست نظر آنے لگیگی اسکی سستی اور خستگی و تکان سب رفع ہو جائیگی الغرض وہ پھر آپکی مسرور بشاش بیوی بنجائیگی۔

اپنے لڑکوں کو بھی سناٹوجن کھلائیے اس سے انکی صحت اور نشو و نما دن دونی اور رات چوگنی ہوگی اور انکی طاقتمند صورتیں دیکھکر آپکا دل خوش ہوگا۔

آج ہی ایک شیشی خرید لیجیے

# SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام دوا فروشوں اور بازاروں سے ملتی ہے
ہاتھ سے چھوڑی نہیں جاتی

# ہاف ٹون عکسی تصویریں
## جن کی قیمتیں نصف کر دی گئی ہیں

| رنگین فی تصویر ۱ر | سادہ فی تصویر آدھ آنہ |
|---|---|
| مسیح ابن مریم۔ نغمۂ محبت | ڈاکٹر انصاری۔ سردار وبھ بھائی پٹیل |
| موسم سرما۔ باد بہاری | مصطفےٰ کمال پاشا کی ترکی کونسل |
| انتظار۔ خواب راحت | میراں صاحب۔ میر جعفر |
| گل بنج روز۔ رفیق طفلی | دربار شاہ عباس |
| شکنتلا و دشینت۔ مشغلہ ہرات | (موہنی تصویریں) چیت۔ بیساکھ |
| تار شکستہ۔ روح اور گناہ | جیٹھ۔ اساڑھ۔ ساون بھادوں |
| نورجہاں کی حسن مدبریہ جمال الملک | ماگھ۔ پھاگن۔ گوتم بودھ |
| شہنشاہ جہانگیر کی چوگان بازی | کالی داس۔ اکبر اعظم۔ مولانا شبلی |
| پیام محبت۔ کثرت پیش بعدت | شمس العلماء ذکاء اللہ۔ سازد نیاز |
| وقت تیغ۔ کرشن و جسودھاجی | مرزا انشاء منشی بشن نرائن بھار گو۔ |
| نظربدکا آمار۔ راجہ آج کا لاپ | ڈاکٹر نذیر احمد خاں۔ لارڈ اروِن |
| بھکارنی۔ گنگا اور بھیشم | میر تشق لکھنوی۔ حضرت انیس |
| سمندر یاشش۔ امید وفاداری | حضرت سرمد۔ مولوی عزیز مرزا |
| مہاراجہ پرتھی راج شیواجی | بابو بانکم چندر۔ منشی احمد علی شوق |
| اندر امداس۔ جنگ یورپ | مرزا سلطان احمد۔ مرزا سودا |
| کا ایک منظر۔ ایک قدیم مشرقی | مولانا آزاد دہلوی۔ جناب چکبست |
| مدرسہ بچل کی تیاری۔ | حضرت صفی۔ ڈاکٹر اقبال۔ |
| راجہ کمانڈ کے بیٹے کا قتل | سر لارنس۔ مسٹر تلک جسٹس محمود |
| باسدیو اور دیو کی نندن | نواب محسن الملک جسٹس لاجپند |
| اکبر احمد جیتے کا شکار۔ | مسٹر گوکھلے مسٹر داس مرحوم۔ |
| عہد مغلیہ میں شاہی سواری کا جلوس | مہاتما گاندھی پنڈت موتی لال نہرو |
| محاصرہ چتوڑ۔ ٹیپو سلطان | لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر سپرو |
| پیدائش شاہزادہ سلیم | راجہ محمود آباد۔ لارڈ سنہا۔ سر آغا خان |
| دربار جہانگیر میں سفیر فارس | مولانا محمد علی۔ سوامی شردھانند |

ملنے کا پتہ منیجر زمانہ پریس کانپور

## ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن لمیٹڈ

صیغہ نمبر ۶۷ — پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

پچاس برس سے مشہور لاثانی دیسی پیٹنٹ دواؤں کا وسیع ہندوستانی کارخانہ




# خوفناک موت سے ہوشیار

## کافو Regd.

اصل عرق کافور ہیضہ گرمی کے دست پیٹ کے درد سوء ہضمی وغیرہ روکنے
(اور آرام کرنے کی ہندوستانی بے خطا دوا)

ہیضہ کے اچانک حملوں سے بچنے کے لئے ہر ایک عیالدار اور مسافر کو بہتر ہے کا فو کی ایک شیشی اپنے پاس رکھنی چاہیئے۔ پچاس برس سے ہیضہ کے لئے صرف یہی ایک دوا مفید ثابت ہو کر شہرت حاصل کر چکی ہے جہاں کہیں ہیضہ پھیلا ہو اس کی ایک دو بوند روزانہ استعمال کرنے سے ہیضہ میں مبتلا ہونے کا خوف نہیں رہتا۔ ہیضہ ہوتے ہی اس کے استعمال سے لاکھوں جانیں بچ چکی ہیں۔ نقلی عرق کافور سے ہوشیار۔ قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶/ ڈاک محصول تین شیشیوں تک سات آنہ ۷/

## یورا

(پیشاب اتارنے کی دوا)

ہیضہ ہونے پر پیشاب عموماً بند ہو جاتا ہے اور بے چینی بڑھ جاتی ہے ایسے موقع پر اسے استعمال کرنے سے پیشاب کھلکر آنے لگتا ہے۔ اس لئے ہیضہ کے موسم میں اسے بھی پاس رکھنا ضرور ہے ہیضہ کے علاوہ سوزاک یا اور کسی سبب سے پیشاب کم یا بند ہو جائے تو استعمال کریں فائدہ ہوگا۔

قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶/
ڈاک محصول سات آنہ ۷/

**نوٹ** دوائیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدتے وقت اسٹار ٹریڈ مارک اور ڈاکٹر برمن نام ضرور دیکھ لیا کریں۔

**کانپور نیا گنج کے ایجنٹ محمد حفیظ محمد نصیر صاحب**

# کسان

## (اُس کے افلاس کے وجوہ اور اُن کا علاج)

مصنفہ

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی

مترجمہ جناب محمود علی خاں صاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اس کو خوشحالی سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت کتنی دردناک ہے کہ اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی اس کا اصل سبب کیا ہے اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہے؟

اِن سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے۔ کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے، کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہے۔ لہٰذا جو لوگ موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں اُنھیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ یقین ہے کہ اس موضوع پر اُردو میں اس سے بہتر کتاب ابتک پیش نہیں کی گئی ہے۔ کتابت طباعت۔ کاغذ اعلیٰ۔ ضروری ہے کہ ملک کا ہر بہی خواہ اسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن دوبارہ پھر جائیں۔ کتاب پریس میں جاچکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگی۔ فوراً فرمایش بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت عمر

قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو محصول ڈاک معاف

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی

پرنٹر۔ پنڈت شری ولبھ بھیروال پریس کانپور کوٹھی کانپور
پبلشر منشی دیا نرائن نگم بی۔ اے۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

# زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔اے،

جلد ۶۵ | جولائی سنہ ۱۹۳۵ع | نمبر ۱

## فہرست مضامین

تصویر:- شمس العلما سید ممتاز علی مرحوم۔



زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۸ شلنگ ششماہی ۴ شلنگ۔ ہندوستان کیلئے ششماہی ۳ روپیہ

# بزمِ نیم شبی

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

متاعِ حلقۂ ادراک و نقدِ عالمِ ہوش
فدائے ساقیٔ ساغر بدست و زلف بدوش

زمانہ ذوقِ سماعت سے پی رہا ہے شراب
سُنا رہی ہے ایک افسانہ چشمِ بادہ فروش

یہ بزمِ نیم شبی ہے یہ وقتِ رامش و رنگ
امامِ شہر، خبردار! محتسب خاموش!

مچا رہے ہیں تلاطم شراب خانے میں
مغنّیانِ بہار و بتانِ عشوہ فروش

کئے ہوئے ہے زمان و مکاں سے بیگانہ
شمیمِ گل کا تلاطم، صدائے نے کا خروش

کسی جبیں سے نمایاں نہیں وبائے خرد
کسی نگاہ میں باقی نہیں ملامتِ ہوش

اُبل رہی ہیں بہاریں برس رہی ہے شراب
مچل رہی ہے کلیجوں میں بانگِ نوشانوش

شرابِ کہنہ و مہتاب و ساقیٔ نوخیز
چمن میں آج یہ سب نعمتیں ہیں دوش بدوش

رگوں میں بادہ ہے، پہلو میں یار، سر پہ قمر
زمیں کنیز ہے آج، آسمان حلقہ بگوش

ہے آج مطربۂ چرخ گوش بر آواز
اس آرزو میں کہ سُن لے کلامِ مفرحِ جوشؔ

# اُردو ہندی قضیہ

(از مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی۔ اے، ایل ایل، بی۔)

سب سے پہلے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ اس مضمون میں مَیں جو کچھ لکھونگا وہ اُردو ہندی دونوں زبان کے رسالوں کے مضموں نگار کی حیثیت سے لکھونگا ہیں اُردو رسالے اور اخبار بھی پڑھتا ہوں اور ہندی اخبار اور رسلے بھی۔ میں جس مقام میں رہتا ہوں (یعنی ریاست جودھپور) وہاں سرکاری زبان ہندی ہے، مگر اُردو جاننے والے بھی ہیں۔ بہر حال مجھے اُردو، ہندی دونوں کے حامیوں کی حماقتوں اور دشواریوں کا اندازہ ہے۔ میری دانست میں اُردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی لوگ ہیں جو اپنے کو اُردو ہندی کا ادیب کہتے ہیں۔ یہ فرقہ انتہا درجہ کی ضد اور تعصّب سے کام لیکر در اصل دونوں زبانوں کو سخت نقصان پہونچا رہا ہے۔ اُردو اور ہندی دو جداگانہ چیزیں بنکر تیار ہو چکیں، اور یہ کہنا کہ جھگڑا صرف رسم الخط کا ہے واقعات کی پردہ پوشی ہے۔ جیسا میں عرض کرچکا ہوں، خطا اُردو اور ہندی ادیبوں دونوں کی ہے، مگر زیادہ سرزنش کے قابل اُردو کے حامی خصوصاً ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔ بدقسمتی سے گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں اخباروں پر مولوی صاحبان کی خاص عنایت ہو رہی ہے۔ اور جب سے اخبارات کی زبان ان حضرات کے زیر اثر آئی ہے اُس میں غیر مانوس عربی ترکیبیں ٹھونس دی گئی ہیں۔ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں اُردو کے حامیوں بالخصوص مسلمانوں نے اُردو میں اتنے نئے عربی الفاظ ٹھونس دیے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے میں بڑی دقّت ہوگئی ہے۔ وہ زمانہ گیا جب ہندو عربی فارسی جانتے تھے اور دنیاوی اغراض کے لئے عربی فارسی پڑھتے تھے اور ادھر انھوں نے اس کو چھوڑا اُدھر مسلمانوں نے اُردو میں نہ صرف نئے عربی الفاظ ٹھونسے بلکہ یہ بدعت شروع کردی کہ ان لفظوں کو جو عرصۂ دراز سے اُردو میں داخل ہوگئے تھے نکالکر پھینک دیا اور اُن کے بدلے عربی الفاظ ٹھونس دئے۔ مثلاً لفظ "اڈیٹر" عرصہ سے اُردو میں آچکا تھا۔ اس لفظ کی خوبی دیکھئے کہ بنگالی۔ مرہٹہ۔ تامل۔ تلنگی۔ مارواڑی کوئی قوم ایسی نہیں جو اسے نہ سمجھتی ہو۔ یہ لفظ بالکل لایعنی

اور "اسٹیشن" کی طرح اُردو میں کھپ گیا تھا، لیکن ظلم دیکھیے کہ ہمارے مولوی صاحبان نے اس لفظ کو نکال پھینکا اور اس کے بدلے میں لفظ "مُدیر" ٹھونس دیا۔ کیا کوئی صاحب لفظ "مدیر" یا "مدیر مسئول" کسی اخبار یا رسالہ میں اب سے پندرہ برس پہلے دکھا سکتے ہیں۔ خزانچی کے بجائے "خازن" لکھنے لگے۔ قوم بوہرہ کے فرد بوہرہ کی جمع "بوہروں" کے بجائے "بواہیر" اور مہر کی جمع مہروں کے بجائے "مواہیر" ہوگئی، اور یہ سب لفظ میں نے خود ان اخباروں میں پڑھے ہیں جو عربی داں مولویوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ہندو مجبور اور تنگ کئے جانے لگے۔ وہ ہندو جو عربی فارسی سے واقف نہ تھے مگر اُردو جانتے تھے ان کو مجبوراً اُردو ناقابل فہم قرار دیکر چھوڑنا پڑی۔ اس کا جواب مسلمان یہ دیتے ہیں کہ ہندوؤں نے بھی تو ہندی میں یہی کیا ہے کہ مروجہ فارسی عربی لفظ نکال کر سنسکرت لفظ ٹھونس دیئے ہیں۔ میرا کہنا ہے کہ آپ کو اس سے کیا بحث، آپ ہندی کب پڑھتے ہیں۔ بقول آپ کے ہندی نہ عوام کی زبان ہے اور نہ مشترکہ زبان ہی ہے۔ بہرحال عوام کو کوئی شکایت نہیں اگر اس میں سنسکرت ٹھونس دی گئی، مگر آپ یہ بتائیے کہ عام فہم اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کے مروجہ لفظوں کو نکال کر عربی لفظ ٹھونس کر آپ نے ہندوؤں کو ملک کی واحد مشترکہ زبان سمجھنے سے کیوں محروم کر دیا در اصل رونا ذہنیت کا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے ضلع جونپور میں ایک گاؤں کا قدیمی نام "ٹیڑھ گواں" تھا۔ یعنی ٹیڑھا گاؤں۔ بدقسمتی سے یہاں مسلمان تعلیم یافتہ اور معزز شرفا کی کافی بستی ہے۔ یہاں کے اکثر باشندے وکیل، بیرسٹر، ڈپٹی کلکٹر اور بڑے بڑے گورنمنٹ عہدہ دار ہیں۔ اُنھوں نے قدیم نام ناپسند کرکے نیا نام "کج گواں" تجویز کیا اور رسوخ اور روپیہ کے زور سے تحصیل اور ڈاکخانہ اور ہر محکمہ میں کوشش کرکے نام بدلوا ڈالا۔ چنانچہ اب اس گاؤں کا نام سرکاری کاغذات میں بھی "کج گواں" ہے۔

یہ ذہنیت عموماً مسلمانوں خصوصاً ادیبوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ جب ہندو دنیاوی وجوہ کی بنا پر عربی فارسی چھوڑ چکے تو مسلمانوں نے اُردو میں نہ صرف نئے لفظ عربی کے ٹھونسنا شروع کر دیئے بلکہ جمع بنانے کے اُردو قاعدے اور پُرانی ترکیبیں بھی بدل ڈالیں اور پرانے مروجہ لفظ نکال کر پھینک دیئے۔ ان کی دانست میں ہندوؤں کو چاہیئے کہ اُردو کی نئی بندشوں اور ترکیبوں کے لئے فارسی عربی شروع کریں ورنہ اُردو چھوڑ دیں۔ ادھر ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ گو وہ اُردو جانتے ہیں مگر عبارت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ گویا اُردو سمجھنے کی شرط ہی یہ ہوگئی ہے کہ عمر کا ایک بڑا حصہ عربی فارسی سیکھنے میں صرف کیا جائے۔ آپ انصاف سے اُس ہندو کے بارہ میں کیا کہیں گے

جس نے اسکول میں فارسی کے بجائے سنسکرت لی ہے۔ باوجود اس کے وہ ان عام عربی فارسی لفظوں کو جانتا ہے جو اُردو میں پُرانے ہو گئے ہیں لیکن اس مصیبت کا وہ کیونکر سامنا کرے کہ ہر روز ایک نیا عربی کا لفظ اُردو میں موجود ہو جاتا ہے اور پُرانے لفظ نکالے جا رہے ہیں۔

ہر زبان کے لئے وہی لفظ مفید ہوتا ہے جسے دنیا کے دوسرے زبان داں بھی سمجھ سکیں اور جو ہماری زبان میں بھی آسانی سے کھپ سکتا ہو۔ مثلاً "تھرمامیٹر"۔ اس کے بجائے ہمارے ادیبوں کو "مقیاس الحرارت" کی ترکیب سوجھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ہر ہندو اس عبارت کو سمجھ سکتا تھا اور اب معمولی اُردو داں ہندو کے لئے سمجھنا درکنار اس لفظ کا پڑھنا لکھنا بھی دوبھر ہو گیا۔ آخر وہ کونسے وجوہ تھے جن کی بنا پر لفظ تھرمامیٹر کو نکال پھینکا گیا اور عربی و فارسی نہ جاننے والے ہندوؤں کے لئے اُردو زبان مشکل بنا دی گئی۔ ہندی کے حامیوں کی نسبت اُردو کے حامی کہتے ہیں کہ جو وہ خود بولتے ہیں وہ نہیں لکھتے، بالکل اسی طرح جیسے روزمرہ میں تھرمامیٹر بولتے ہیں لیکن ادبی زور دکھانے اور ہندوؤں کو اُردو سے حیران کرنے کے لئے تحریر میں "مقیاس الحرارت" لکھا جاتا ہے۔

میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اصل رونا ذہنیت کا اور واقعی ماتم ضد اور تعصّب کا ہے۔ آجکل ہر اُردو کا ادیب ٹھیٹھ عربی ترکیبوں پر فدا و فنا ہے۔ ذہنیت بگڑی ہوئی ہے۔ خود عربوں کو دیکھیے اُنھوں نے انگریزی لفظوں کو بجنسہٖ عربی میں لے لیا ہے۔ مثلاً "ٹیلیگرام"۔ عرب مجبور ہیں، اُن کی زبان سے "ٹ" نہیں نکلتا اور "گاف" سے مجبور ہیں لہٰذا انھوں نے "تلغراف" یا "تلغرام" بنا کر حتی الوسع اس کو اُسی شان سے رہنے دیا۔ مگر اُردو ادیب کی ذہنیت کا ماتم کیجئے کہ "ٹ" بھی بول سکتا ہے لیکن عربی پر فدا ہے اور وہ بھی "تلغراف" کہتا ہے۔ ملکہ مصر "کلوپیٹرا" کو "قلوپطرہ" کہتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ "اُردو اکاڈی" کے بجائے "اُردو اکادمی" لکھا جاتا ہے اور "ڈ" کے بجائے "د" محض اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ اُردو کا ہندی سے حتی المقدور زیادہ سے زیادہ بُعد ہو جائے اور ہماری زبان عربی کی طرف زیادہ جھکتی ہوئی معلوم دے۔ میں نہیں کہتا کہ ایسا کرنا درست ہے یا نادرست لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کی حرکتیں کم از کم اُردو ادیبوں کی قابل ملامت ذہنیت کو ضرور ظاہر کرتی ہیں اور یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ اُردو کو دیدہ و دانستہ عربی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر اُسے خوب مشکل بنایا جا رہا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ عام ہندو عربی فارسی دنیاوی وجوہ کی بنا پر چھوڑ چکے ہیں اور محض اُردو کی خاطر وہ عربی پر اپنا وقت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

بہر نوع مستقبل کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ "اَیروپلین" کے بجائے "ہوائی جہاز" ناپسند ہے
یارہ" زیادہ پسند ہے۔ اگر ہندو ہندی میں "وبوان" کہتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ
کے جواب میں "طیارہ" کہنے میں حق بجانب ہونگے۔ یہ خیال ہے تو پھر یہ دعویٰ چھوڑ دیجئے کا
دوؤں کی بھی مشترکہ زبان ہے۔ مستقبل زیادہ تاریک ہے کیونکہ یورپ کی ہر ایجاد کے ساتھ
انگریزی لفظ اُردو میں آجاتے ہیں۔ وائرلیس کے ساتھ ریڈیو۔ لاوڈ اسپیکر۔ ریسیور اور
بنوں دوسرے لفظ اُردو میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس رفتار سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لفظ
زیری کے آگئے ہیں۔ اُردو کے حامی جس راستہ پر جارہے ہیں اُس کے معنی یہ ہیں کہ جتنے لفظ
رزیری کے اس طرح آئیں گے اُن کی عربی کردی جائیگی۔ گویا اُتنے ہی عربی لفظ نئے داخل ہو
یں گے۔ چنانچہ اسی اُصول پر عثمانیہ یونیورسٹی والے اُردو کی ایک لغت تیار کر رہے ہیں جس
ذریعہ سیکڑوں ہزاروں عربی لفظ اُردو میں لائے جائیں گے۔ تب جا کر شاید صاحبان لغت کے
یک اُردو عام فہم ہوجائیگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا عربی اور فارسی نہ جاننے والے ہندو بھی اس لغت کو ماننے اور ہزاروں
الفاظ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اُردو کے حامیوں کے نزدیک ہر ہندو کا قومی فرض ہے کہ
س خوفناک اُردو کی حمایت کرے۔ آخر وہ کون سی وجہ ہے جس کی بنا پر اُردو کے حامی اِس
ن میں عام پسند اور مروّجہ انگریزی لفظوں کے بجائے عربی بیدشیں ٹھونس رہے ہیں
یہ ناقابل برداشت اور ناقابل عمل تجویز اس درجہ ترقی کر رہی ہے کہ طبی اور دوسری
طلاحیں بھی جو اُردو میں رائج کی جانا تجویز ہوئی ہیں، وہ اسی ذہنیت کے ماتحت طے ہوئی
کہ انگریزی کے بجائے سب اصطلاحیں عربی سے بنالی جائیں۔ اس طرح مستقبل قریب میں
دو بیچاری میں "اگر" "مگر" "لیکن" کے سوائے اور سبھی لفظ عربی کے ہوجائیں گے۔ مجھے اس
ئے مستقبل میں اُردو کی موت نظر آرہی ہے۔ یہی حال رہا تو بس شعر کہنے کے لئے اُردو رہجائیگی
بول چال اس کی ایک عرب زیادہ آسانی سے سمجھ سکے گا۔

دس پندرہ سال کے ادبی رسالوں کی فائل اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُردو نے کم از کم
عام فہم لفظ نکال پھینکے ہیں، محض اس لئے کہ اب وہ فصیح نہیں رہے۔ کانپنے کے بجائے
رِتش۔ ناچ کے بجائے رقص۔ وغیرہ وغیرہ درجنوں نہیں سیکڑوں لفظ ہیں جو اُردو میں بالکل

مولویوں نے اسکا نام آلہ مکبر الصوت رکھا ہے اور اس کو اُردو کہتے ہیں۔

سنئے ہیں اور جنھیں کم از کم ادیب ضرور استعمال کرتے ہیں۔

جمع بنانے کا اُردو قاعدہ بھی قصۂ ماضی ہوچکا ہے۔ لفظ کی جمع بلاضرورت "الفاظ" ہے "لفظوں" یا جمع کے صیغہ میں بھی "لفظ" کم از کم ایک ادیب کے لئے لکھنا معیوب ہے۔ چندہ سالانہ کے بجائے کوئی صاحب "اشتراک بدل" لکھ رہے ہیں، کوئی اور رفدائے ایران و توران" رسالہ" کے بجائے "مجلہ" لکھتے ہیں کتاب کے دیباچوں کے درجنوں نام مقرر ہوئے ہیں جو کبھی سننے میں بھی نہیں آئے تھے۔ غرض عجب کیفیت ہے۔ ہندو درکنار خود مسلمان کے لئے اُردو وبال جان بنائی جارہی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ اُردو کا کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہیں ہے جسمیں کوئی نیا عربی لفظ یا بندش موجود نہ ہو۔ اُردو کے نئے رسالوں کو دیکھیئے پہلے ہی نمبر میں کوئی نئی عربی ترکیب کسی نئے انداز کے ساتھ ضرور موجود ہوتی ہے۔

اب ذرا غالب کی اُردو دیکھیئے، حالی کی زبان ملاحظہ کیجئے، ڈاکٹر نذیر احمد کی عبارت پڑھیئے ڈاکٹر نذیر احمد کا ترجمہ قرآن دیکھیئے اور ترجمہ موضح القرآن ملاحظہ کیجئے تو آپ قائل ہوجائیں گے کہ اُردو کے حامیوں نے اُردو کی موجودہ صورت وہ کردی ہے گویا گھوڑے کو عربی اونٹ بنا دیا ہے اور اب اس اونٹ پر مولوی صاحبان لالہ صاحبان کو زبردستی بٹھا رہے ہیں۔

موجودہ دور میں معدودے چند جو ہندو اُردو کی حمایت کرتے نظر آرہے ہیں اور اُردو سے محبت کرنا اپنا شعار سمجھتے ہیں اُن کا دم غنیمت ہے۔ یہ سب حضرات اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن بہت جلد صورت حال دوسری ہونیوالی ہے ہندوؤں کی نئی پود فارسی سے نابلد ہورہی ہے اور موجودہ اُردو کے رجحانات دیکھتے ہوئے ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ فارسی نہ جاننے والے کے لئے موجودہ زمانہ کی اُردو ایسی ہوگئی ہے کہ اگر وہ اُردو لکھے یا اُردو سے محبت رکھے تو اُس پر خوب پھبتیاں کسی جائیں گی اور اس کا مذاق اڑایا جائیگا۔ دراصل جو شخص فارسی نہیں جانتا اُس کو اُردو ادب سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوگا۔ نہ وہ اُردو میں کوئی تصنیف ہی کرسکے گا اور نہ اپنے خیالات کا بخوبی اظہار کرسکیگا

اُردو کا موجودہ دور اور ہندی سے کشمکش دیکھیئے اور دیکھیئے کہ آجکل اُردو کے مستند اور مقتدر معیاری رسالے اپنے صفحے کے صفحے اس مسئلہ پر سیاہ کررہے ہیں کہ فلاں فلاں عربی اور فارسی لفظوں نے اُردو میں آکر قدرے صورت بدل لی ہے جو ناقابل معافی ہے اور اسی بنا پر اُردو کے درجنوں دلپسند محاورے "غلط" کہکر یہ کہا جاتا ہے کہ اسکی عربی شان یا فارسی شان

بدستور ٹھیٹھ عربی اور فارسی قواعد کے مطابق قائم رہنا چاہیئے۔ بعض حضرات نے اس قسم کے مضامین پنجاب کے رسالوں میں شائع کرکے اُردو کو عربی بنانے کی خاص کوشش کی ہے۔ اور دوسرے بیکار حضرات بھی نہایت تندہی سے یہ "دھندا" کر رہے ہیں اور امید قوی ہے کہ ان کی کوشش سے وہ عربی اور فارسی لفظ جو اپنی قدیم شان کھو چکے ہیں اور اُردو میں گھل مل گئے ہیں خالص عربی اور فارسی شان اور ترکیبوں کے ساتھ اُردو میں آجائیں گے۔ بہت سے لفظ اور محاورے اُردو میں عربی اور فارسی مرکب الفاظ کے ٹکڑے ملاکر صدیوں کے استعمال سے اُردو کا ایک مستقل لفظ بن گئے ہیں، مگر اب ایسے لفظوں کو غلط بتایا جا رہا ہے۔ اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عربی فارسی کا لفظ اس طرح ملانا عربی قواعد کی رو سے غلط ہے۔ چنانچہ اس اصول کے ماتحت اُردو کی تنقیدوں میں ادیبوں کی غلطیاں نکالی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اس سلسلہ میں زیر و زبر تک کا جھگڑا بھی کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اگر اُردو داں طبقہ کسی لفظ کو زیر سے پڑھتا ہے اور عربی میں وہ زبر ہے تو اب اصرار یہ ہو رہا ہے کہ اُردو میں بھی زبر سے پڑھو۔ قصہ مختصر موجودہ دور میں اُردو کو ہر پہلو سے مشکل اور ناقابل فہم بنایا جا رہا ہے اور اس کو عربیت میں ایسا ڈبویا جا رہا ہے کہ بہت جلد ہماری روزمرہ زبان بگڑی ہوئی عربی بنکر رہجائیگی۔

اب اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی دیکھئے۔ بعض اُردو اخبار ہندوؤں کی ملکیت ہیں مسلمانوں کو شکایت ہے کہ اُردو داں ہندو اُردو میں غیر مانوس سنسکرت لفظ ٹھونس کر اُردو کو بھدا کر رہے ہیں۔ یہ الزام کسی حد تک سچ ہے، مگر کیا کبھی معترضین نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ ایسی اُردو لکھنے سے کیا فائدہ جسے لوگ نہ سمجھیں۔ ہندوؤں کے ہر خاندان میں دو چار ایسے لوگ ہیں جو فارسی نہیں جانتے۔ وہ نوجوان جنھوں نے اسکول میں سنسکرت لی ہے اِس بھدی اُردو کو ٹکسالی اُردو کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کی بدعت ہندو اخبار غالباً لاچار ہو کر کرتے ہیں۔ لیکن یہ مسلّمہ ہے کہ ایسا کرنے سے اُردو رسم الخط کی اُن لوگوں میں تبلیغ ہوتی ہے جو کسی طرح ہماری عربی نما اُردو نہیں سمجھ سکتے اور فارسی عربی سے قطعی نابلد اور دراصل ہندی کے شیدا ہیں۔ مگر اس عذر کے جائز ہونے پر بھی میں دیکھتا ہوں کہ سنسکرت لفظ ضرورت سے زیادہ ہیں۔ دراصل یہ لوگ آج کل کی شدھ ہندی کو اُردو رسم الخط میں لکھنا چاہتے ہیں مگر اس میں کیا مضائقہ ہے۔

بہرحال اُردو کے موجودہ دور کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرائن و آثار ایک نئی زبان کی

پیدائش کا پیش خیمہ ہیں۔ وہ تمام اسباب موجود ہیں جو اُردو کی پیدائش کے وقت موجود تھے فارسی کی جانشین موجودہ اُردو ہے جو بہت جلد تمام ہندوستان کے ہندوؤں کے لئے ناقابل فہم چیز ہونیوالی ہے اور ہندی اردو داں طبقہ کے لئے ویسے بھی ناقابل فہم ہے۔ اُس کا لازمی نتیجہ اُس زبان کی پیدائش ہے جسے "ہندوستانی" کہتے ہیں۔ دراصل یہ زبان جنم لے چکی ہے حتیٰ کہ اس کا کورس بھی اُردو رسم الخط میں مرتب ہوگیا ہے اور صوبۂ متحدہ کے نصاب میں داخل ہوگیا ہے۔ مجھے تو یہی زبان مستقبل قریب میں ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار پاتے نظر آتی ہے اُس میں نہ عربی کے ثقیل لفظ ہیں اور نہ سنسکرت کے۔ اُردو کے تمام دلکش محاورے اُسی طرح غائب ہیں جس طرح عربی اور فارسی کے محاورے اُردو سے۔ موجودہ اُردو اور موجودہ ہندی ادیب دونوں اُسے غلط کہیں گے، مگر دونوں اُسے سمجھ سکیں گے۔ اس میں اُردو داں اور ہندی داں دونوں کے لئے یکساں سہولت ہوگی۔ موجودہ زمانہ کو اس زبان میں خط وکتابت کرنے سے اُسی طرح عار ہوگا جیسے کسی زمانہ میں اُردو میں لکھنا عار تھا۔ اس میں انگریزی لفظ زیادہ ہونگے۔ لفظ ایڈیٹر جو اُردو اور ہندی والوں نے نکالکر پھینکدیا ہے اُس میں ضرور رائج ہوگا۔ اس کا رسم الخط بہت جلد انگریزی ہوجائیگا اور یہ درۂ خیبر سے راس کماری تک بولی اور سمجھی جائیگی، دکن میں دکن کا مقامی اثر قبول کریگی، پنجاب میں پنجابی کا اور بنگال میں بنگالی کا۔"

ممکن ہے میرا خیال غلط ہو مگر میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آجکل ایک دیوبندی مولوی اور ہندو نوجوان جس نے سنسکرت لیکر ایم۔ اے کیا ہے مترجم کے بغیر قطعی بات چیت نہیں کرسکتے۔ اور نہ ایک ہندی کا ادیب اُردو ادیب سے بغیر مترجم کے بات کرسکتا ہے۔ میں دونوں سے ملتا ہوں، ہندی ادیب میرے پاس جودھپور تک آتے ہیں، اور میں حیرت میں رہ جاتا ہوں کہ ان سے کس طرح بات چیت ممکن ہے۔

اُردو کے حامیوں نے یہ ترکیب خوب سوچی ہے کہ ہندی زبان کے وجود ہی سے انکار کردو۔ حالانکہ یہ زبان جس کی پیدائش کے وہ خود اور اُن کی عربی پرستی ذمہ دار ہوئی ہے، سماج کے جلسوں اور دوسری پبلک تقریروں میں برابر رائج ہے۔ مگر اردو ادیب یہ کہکر دل خوش کرلیتے ہیں کہ مقرر کی شرارت ہے جو دیدہ ودانستہ سنسکرت کے موٹے موٹے لفظ اپنی تقریر میں شامل کررہا ہے جسے اکثر سامعین نہیں سمجھتے۔ یہ صحیح ہے لیکن اُردو ادیبوں کو غالباً اس کا اندازہ نہیں ہے کہ سنسکرت کے اِن الفاظ کو کتنے فیصدی ہندو نوجوان نہ صرف صرعت سے سمجھتے جارہے ہیں بلکہ اس کا استعمال روزمرہ

بول چال میں (شاید یو۔پی کو چھوڑکر) بڑھ رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہندی میں خالص بھاشا یا سنسکرت کا لفظ عربی کے بہ نسبت زیادہ فصیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور بدقسمتی سے وہاں بھی وہی ذہنیت کارفرما ہے جو اُردو ادیبوں میں ہے۔

اس کشمکش کا نتیجہ گروہ بندی ہے۔ ایک گروہ اُن لوگوں کا ہے جن کو عربی فارسی سے تعلق ہے، دوسرا گروہ ان کا ہے جو عربی فارسی قطعی نہیں جانتے۔ اُردو اور ہندی میں جس سرعت سے عربی اور سنسکرت کے الفاظ آرہے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں کی زبان بھی مختلف ہوجائیگی۔ جیسا میں عرض کرچکا ہوں موجودہ زمانہ میں اُردو کا ادیب ہندی کے ادیب سے بات چیت نہیں کرسکتا لہذا ایسی صورت میں لامحالہ آپس میں وہ زبان بولنا پڑے گی جس کو ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔ یہ عمل یو۔پی اور پنجاب میں دیر میں ہوگا لیکن اور دوسرے مقامات میں شروع ہوگیا ہے۔

میری دانست میں اُردو کی بقا کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کے حامی اعتدال سے کام لیں عربی نوازی چھوڑدیں۔ جمع بنانے کی عربی ترکیب اُردو میں غلط قرار دیجائے۔ جہاں انگریزی اور عربی لفظ کا سوال ہو اُردو میں انگریزی لفظ عربی روغن پھیرے بغیر لیا جائے۔ تحریر کے عربی قاعدے اُردو سے خارج کردیئے جائیں مثلاً "بالکل" بھی صحیح مانا جائے اور اگر کوئی "بلکل" لکھے تب بھی صحیح مانا جائے۔ اُردو کی تحریر میں زائد "الف" یا "لام" وغیرہ سے تحریر میں جو دشواری پیدا ہوجاتی ہے اُس کو اُڑادیا جائے۔ املا میں "ذ" اور "ز" اور "ض" کا فرق اُڑادیا جائے۔ بظاہر یہ کارروائی اُردو کے حامیوں کو پسند نہ ہوگی لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے لوگوں نے انگریزی زبان کے ساتھ اسی قسم کی کارروائی کرکے اس کو آسان بنالیا ہے۔ امریکن کتابوں کو دیکھئے تو سہولیت کا اندازہ ہو جائیگا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اُردو میں عربی لفظوں کی درآمد رک جائیگی اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم عربی لفظ اُردو میں آتے ہی "مورد" ہوجائیگا اور فوراً ہی اُس پر اُردو کا رنگ غالب آجائیگا۔



# اُردو

از جناب محمود اسرائیلی

صورتیں اور بھی دنیا میں ہیں گویائی کی　　پر عجب شان ہے اُردو تری زیبائی کی
دھوم عالم میں مچی ہے تری یکتائی کی　　تیری شوخی کی، نزاکت کی، دل آرائی کی

تیرے انداز نرالے، تری گھاتیں پیاری
تیرے مضمون انوکھے، تری باتیں پیاری

رونق بزم جہاں حُسنِ لطافت تیرا　　چرخ اقلیم سخن، اوج بلاغت تیرا
چشمۂ فیض ہے آئین سلاست تیرا　　مایۂ ناز ہے گلزار فصاحت تیرا

یہ تری طرز ادا! یہ تری شیریں گفتار!!
کون ہے جو نہ اس انداز پہ ہوجائے نثار؟

جو ملا تجھ سے وہ تفریق جہاں بھول گیا　　قومیت بھول گیا، نام ونشاں بھول گیا
صوبہ و ملک کجا، اپنا مکاں بھول گیا　　مختصر یہ ہے کہ وہ اپنی زباں بھول گیا

جملہ اقوام کو آپس میں ملایا تونے!
آکے دنیا میں یہ اعجاز دکھایا تونے؟

# ایڈورڈ فٹز جیرالڈ

(از جناب محمد اسحاق صاحب ایم۔ اے)

ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کی شہرت تمام و کمال عمر خیام کی رباعیات کے ترجمہ کی بدولت ہوئی ہے اُس نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن سب طاق نسیاں کے سپرد ہوگئیں۔ مگر عمر خیام کی رباعیات کے بے بہا ترجمے نے اس کے نام کو زندہ جاوید کر دیا۔ فٹز جیرالڈ نے فارسی نظموں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس کے ایک دوست کو بوڈلین کی مشہور لائبریری (Bodlien Library) میں عمر خیام کی رباعیوں کا خود نوشت نسخہ دستیاب ہوا جو سفید کھال پر سیاہ روشنائی سے لکھی ہوئی تھیں اور اس پر کچھ طلائی کام بھی تھا جس کی وجہ سے فٹز جیرالڈ کی توجہ اس نسخہ کی طرف مبذول ہوئی

فٹز جیرالڈ اور عمر خیام دونوں فطرتاً ہم مذاق تھے۔ فٹز جیرالڈ کا بیان ہے کہ عمر کی رباعیات سے مجھے بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے، عمر خیام فوری جذبات کا آدمی تھا۔ حسن و عشق سے اُسے دلی لگاؤ تھا وہ خوبصورتی کا دلدادہ تھا، یہی حال فٹز جیرالڈ کا تھا عمر کے خیالات پر ایک خاص طرز کے توہم فلسفہ کا تسلط تھا اسکا فلسفہ انسان کی روحانی کشمکش کے مخمصوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ فٹز جیرالڈ بھی اسی عقدۂ مالا ینحل کی بھول بھلیاں میں بھٹک رہا تھا۔

آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ فٹز جیرالڈ نے جو اس وقت تک ایک کہنہ مشق پختہ کار اور کامل شاعر ہو چکا تھا قدرے غور و فکر اور اصلاح و ترمیم کے بعد خیام کے خیالات کو ایسے لفظوں میں انگریزی میں پیش کیا، جو علم و معرفت سے بھرپور تھے۔ اُس نے متین سنجیدہ اور شاندار الفاظ میں خیام کے شاعرانہ جذبات کی ترجمانی کی۔ اس کا طرز بیان فلسفیانہ ہونے کے باوجود لطافت کے لحاظ سے فطرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اور اس میں ایک خاص قسم کا سوز و گداز بھی تھا۔ جو پڑھنے والوں کو سرشار کر دیتا تھا۔

عمر خیام حقیقی معنوں میں شاعر تھا، اس کا علمی مذاق قابل قدر تھا اور سلطان کے وزیر کی طرف سے اُسے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ مغرب میں وہ صرف منجم اور مہندس کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یہاں

تک کہ فیٹز جیرالڈ نے اس کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اُسے شاعر کا خطاب دیا۔ اگرچہ بعض نقاد فن اسے ایسا صوفی بتاتے رہے ہے جو معبود برحق کو اپنے مبہم الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔ لیکن فیٹز جیرالڈ نے اُسے ایسے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو در اصل ملحد ہے لیکن جس نے زندگی و موت کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کے جذبات ہرگز روحانی یا وجدانی نہیں ہیں، وہ صرف گذشتہ زندگی اور جوانی کی اُمنگ کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا، اور ایام عیش و عشرت پر نظر کرتا ہے۔ زندگی کی خوشی اور دُنیوی لذتیں اُسے وجد میں لاتی ہیں، اس کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی لذتیں اور خوشیاں چند روزہ ہیں اس لئے اُن سے پرہیز کیا جائے، بلکہ وہ ان لذائذ میں سرتاپا غرق رہنا چاہتا ہے۔ عالم سفلی کی خوبصورت اور لذیذ چیزیں کس طرح اس قدر جلد زوال پذیر ہوسکتی ہیں؟ یہ عمر خیام اور فیٹز جیرالڈ دونوں کے لئے ایک معمہ ہے۔ کسی لذت کو کیوں ترک کیا جائے۔ یا اسکو کسی دوسرے نادیدہ دَور کی امید میں کیوں خیرباد کہا جائے۔ خیالات کو واقعیت کا جامہ کیوں نہ پہنایا جائے۔ اپنی امیدوں اور آرزوؤں سے اپنے لئے عیش و نشاط کی محفل کیوں نہ آراستہ کیجائے۔ یہی اِن دونوں کا فلسفۂ زندگی ہے۔

---

ایڈورڈ فیٹز جیرالڈ ۱۸۰۹ء میں وڈبرج کے قریب سفوک (Suffolk) میں پیدا ہوا یہیں اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ معاش کی طرف سے وہ بیفکر تھا بلکہ اس کی زندگی عیش و آرام میں بسر ہوئی جو اُسے خود بھی بہت پسند تھی لیکن وہ ہمیشہ اس سے مزید آسایش کا جویا رہتا تھا۔ لوگوں نے اُسے وہمی کا خطاب دے رکھا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ آوارہ گردی کرتا رہا۔ نامور مصنفین کی کتابوں کو جنھیں وہ خود پسند کرتا بے ترتیبی کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ اسکا اشتیاق تصویر سازی، راگ رنگ اور تغزل کی طرف تھا۔ اُسے سیاسی اور سماجی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جو اس کے دوسرے ساتھیوں کو مرغوب تھیں اُسے پسند نہ تھیں، وہ چلتا پھرتا باتیں کرتا اور اپنے احباب کے کمروں میں گشت لگاتا۔ سگار پیتا، گیت گاتا تھا اور اپنی تحریریں تھیکرے[1] کو دکھاتا۔ وہ مالدار تھا لیکن سلیقہ سے خرچ کرنے سے ناواقف تھا۔ اس کی علادت تھی کہ جب کسی کتاب کا کوئی خاص حصہ اسے پسند آتا تو پھاڑ کر اُسے رکھ لیتا اور باقی کتاب کو پھینکدیتا اس طرح اس کے پاس مکمل کتابوں کی جلدیں بہت ہی کم تھیں اپنے ذاتی رکھ رکھاؤ اور لباس

---

Wood Bridge سلہ Thackeray[1] سلہ

سے وہ اس درجہ بےفکر تھا کہ ایک مرتبہ جب اُس کی ماں اپنی چار گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر شہزادی کی طرح کیمبرج پہنچی اور اپنے بیٹے سے ملاقات کے لئے کہلا بھیجا تو اُس وقت اس کے پاس کوئی جوتا بھی نہ تھا۔

اکیس سال کی عمر میں اُس نے ڈگری حاصل کی جس کے بعد وہ ایک طرح کی خود فراموشی اور آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگا۔ جو اُس کی موت کے ساتھ ختم ہوئی۔ وہ خلوت پسند واقع ہوا تھا اور اس کی سرشت غم پسند تھی، چنانچہ تمام عمر ایسی ہی کیفیت قائم رہی، وہ سماجی قیود سے بالکل آزاد اور دنیوی بندشوں سے متنفر رہنا چاہتا تھا۔

تیس سال کی عمر میں اُسے اپنا گھر بنانے کا شوق ہوا گو اُس کا پُرانا گھر بہت بڑا تھا لیکن اب وہ ایک چھپر کے جھونپڑے میں رہنے لگا۔ جس میں صرف دو کمرے تھے۔ یہ جھونپڑا اس کے گھر کی عمارت کے دروازے پر بنا تھا۔ یہاں شیکسپیئر کی تصویر، ایک بلّی ایک کتا، اور ایک طوطے کے ساتھ رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) کی زندگی بسر کرتا تھا، اس کے خادم دو میاں بیوی تھے جو اسی کی ریاست میں ملازم تھے۔ جھونپڑی بے ترتیبی کی زندہ مثال تھی، اس میں تصویریں اور کتابیں بکھری ہوئی پڑی تھیں، ایک میز یا Piano پر متعدد لاٹھیاں رکھی ہوئی تھیں، ایک طرف تیر کا پیپا جو اس کے عیش و عشرت کا واحد ذریعہ تھا اُدھکا پڑا تھا۔ فٹز جیرالڈ یہیں بیٹھتا، اُس کے بال بکھرے رہتے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی، اسی جھونپڑی میں وہ خواب کے لباس میں جوتیاں پہنے ہوئے ملتا یا باغ میں گشت لگاتا نظر آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ پڑوس میں چکر لگا کر اپنے دوستوں سے ملتا۔ گرجا وہ شاذ و نادر ہی جاتا تھا، تاہم نہایت بےلوث زندگی بسر کرتا تھا اور ہر وقت ادبی جوش میں سرشار رہتا تھا۔

فٹز جیرالڈ ہر وقت مصروف رہتا تھا، طبیعت خوش کرنے کو وہ عمر خیام کی رباعیات پر طبع آزمائی کرنے لگتا تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ ٹینی سن، کارلائل، تھیکرے اور جارج براؤن کا دلدادہ ہوتا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب ٹینی سن سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے دوستوں میں سے کس کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے تو اُس نے کہا کہ "یقیناً میں فٹز جیرالڈ کو بہت چاہتا ہوں"۔

درحقیقت فٹز جیرالڈ کے سبھی دوست اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی تنقیدی قابلیت کے معترف تھے۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھا۔ اس کی طبیعت میں انسانی ہمدردی اور محبت بھری ہوئی تھی۔ گو وہ عزلت پسند تھا تاہم اپنے وقت کا بیشتر حصہ ملاحوں کے ساتھ وہین Deben ندی

میں اپنی کشتی پر گذارتا تھا۔ زندگی کے تمام ضروری کاموں سے بے تعلق سا رہتا، رسمی چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا۔ مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ اس کی شادی ادھیڑ عمر میں ہوئی مگر یہ اس کے حق میں کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ اُسنے مس بارٹن سے کسی وعدہ کی بنا پر بیاہ تو کرلیا لیکن چھ ماہ کی قلیل مدت میں اس نے علحدہ ہوکر اپنا راستہ علحدہ اختیار کرلیا اور وہ غور و خوض کی تفکرانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ اور اس کی بیوی نے اپنی سابق زندگی اختیار کرلی۔ تھوڑے دنوں تک تو وہ خط و کتابت کرتی رہی لیکن پھر کبھی یکجا نہ ہوئے۔

عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ فیٹز جیرالڈ نے سب سے پہلے فریزر میگزین[1] میں چھپنے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن جب دو سال تک نظمیں شائع نہ ہوئیں تو فیٹز جیرالڈ نے اُنھیں واپس لے لیا اور اس مجموعہ کو خود اپنے خرچ سے شائع کرایا۔ لیکن کتاب فروخت نہ ہوئی۔ اور کتب فروش کو آرچ نے کتب خانہ نے باہر ایک پیسہ والے طاق میں رکھدیا۔ خوش قسمتی سے اُسے راسیٹی نے مول لیا اور اپنے دوستوں سے بھی اس کے خریدنے کی استدعا کی۔ اور اس طرح اسکی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

---

اس محنت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جو فیٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیات کو انگریزی کا جامہ پہنانے میں اُٹھائی۔ اُس نے رباعیات کی بار بار ترمیم اور اصلاح کی۔ اسکی زندگی میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے فیٹز جیرالڈ اور عمر خیام فطرت کے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کی خوشی کی تمام گھڑیاں اس خیال سے منغص تھیں کہ ہر چیز فانی اور آنی ہے۔ یہ خیال اس کے دل پر بُری طرح مسلط تھا اور ساتھ ہی اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اگر کوئی نظم فطرت کی سچی ترجمان ہو تو وہ ضرور مقبول ہوگی

آخر ایام میں فیٹز جیرالڈ غم و اندوہ کا ایک پتلا نظر آتا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں چوہتر سال کی عمر میں نارفوک میں وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تو اچانک اُس کا انتقال ہوگیا۔ وہ رات کو اچھا خاصہ سویا تھا۔ صبح کو گھر کا ایک خادم اُسے اُٹھانے کے لئے گیا تو معلوم ہوا کہ رات کو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ بہرحال

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

---

[1] Fraser Magazine

خیال ہے کہ معدودے چند شعرا کے سوا کوئی رباعی کہنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔ لیکن ایسا نہیں۔ آپ کی رباعیاں متقدمین و متاخرین دونوں میں نمایاں خصوصیت رکھتی ہیں۔ آپ کا مجموعۂ کلام "روح رواں" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے آپ کی بلند پروازی کا پتہ چلتا ہے۔ شاعری کی تمام خوبیاں آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ کہیں جوش و خروش میں آبشار کا سا انداز ہے۔ کہیں سلاست و روانی کا دریا موجیں مار رہا ہے کہیں حقیقت عالم اور فلسفہ و حکمت پر بحث ہے۔ "روح رواں" میں سب سے پہلے مجموعۂ نظم ہے۔ اس میں "نظم شاعری" بہترین شاعری کا نمونہ ہے۔ جو کیننگ کالج بورڈنگ ہاؤس یا دشاہ باغ لکھنؤ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔ ؎

شاعری کیا ہے اک احساس قوانین وجود — دل کے جذبات کا اظہار بتائید قیود
برہمن ہے دل شاعر بت فطرت معبود — جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسن نمود
جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اُتر آتی ہے

شاعری کو "احساس قوانین وجود" کہنا بقول حضرت عزیز لکھنوی بلاغت کی آخری منزل ہے۔ شاعر کا کام قوانین وجود کو محسوس کرنا اور اُس سے پیدا شدہ جذبات کو وزن و قافیہ کی قید کے اندر نظم کرنا ہے۔ تیسرے مصرع میں شاعر کو برہمن کہا ہے جو قدرت کا پرستار ہے۔ اسی لیے اِس میں حسن ازل نمایاں ہے۔ جب نظر حقیقت عالم تک پہنچ جاتی ہے تو دل کے آئینہ پہ تصویر اُتر آتی ہے۔

تیسرا بند ہے ؎

دل ہے شاعر کا اک منزل انوار جمال — اور جولانگہ دل وسعت میدان خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مست سخن صاحب قال — بزم فطرت میں ہر اک چیز کو آجاتا ہے حال
کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

شاعر کا دل کیا ہے انوار جمال کی منزل، جس وقت شاعر بزم فطرت میں نغمہ زنی کرتا ہے تو ذرہ ذرہ کو وجد آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس موسیقی کے اثر سے کوہ جھک جاتے ہیں اور بہتے ہوئے چشمے رُک جاتے ہیں۔ اِس فلک پیما تخیل تک پہونچنا جناب رواں کی فکر

بلند کا معجزہ ہے - ساتویں بند میں زمانہ حال کی شاعری کی طرف اشارہ ہے - ؎

اللہ اللہ زہے وسعتِ دامانِ غزل بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم ہو جائے دو عالم پہ ہو پایانِ غزل پوچھیے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل
ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

کل نظم پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے - ابھی چونکہ اور کلام پر نظر کرنا ہے اس لیے چند ہی بند ہدیۂ ناظرین کیے گئے -

"لاوارث بچہ" ایک پُر درد نظم ہے - جو ایک حسرتناک واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی - ایک نوزائیدہ خوبصورت بچہ کو چوکیدار گھورے سے اُٹھا کر لایا تھا - بچہ سے مخاطب ہوتے ہیں - ؎

آہ اے نو واردِ بزمِ رباطِ روزگار آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار
آہ اے دیباچۂ شرحِ کتابِ دردِ دل آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل

لاوارث بچہ کو "شرح کتاب درد دل" اور "عنوان باب اضطراب جانگسل" کہنا واقعات کی بدیہی مثال ہے - اسکے بعد پوچھتے ہیں - ؎

حیف کیا ماں باپ ہیں دنیا کے لوگوں کی دلیل تجھکو سمجھوں ثمرۂ بدکاریٔ نفسِ ذلیل
حیف ہے لیکن اگر لوگوں کا کہنا ٹھیک ہو حیف ہے گر آدمی کی عقل یوں تاریک ہو

پھر انسانی کمزوریوں پر اظہار افسوس کرتے ہیں - ؎

ہائے کیا انساں کا ہو سکتا ہے یوں بھی خونِ سفید ڈال دے گھورے پہ اپنا مرکزِ جذبِ اُمید
توبہ توبہ حضرتِ انساں کی یہ کمزوریاں اور اس پر اشرف المخلوقات ہونے کا گماں
باپ ماں کے نفسِ سرکش کی کہانی ہائے ہائے اے معاذ اللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے

اتنی کمزوریوں کے باوجود انسان اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے - آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

چند روز اس عالمِ سفلی کا ہے مہماں تو جائیگا دنیا سے لیکر حسرت و ارمان تو
لطف تو جب ہے کہ ہم کو کچھ بھی تیرا غم نہ ہو رونے والے روئیں لیکن آنکھ اپنی نم نہ ہو
کوئی گر پوچھے رواں ہم سے کہ یہ کیا ہو گیا؟ ہم کہیں دریا سے قطرہ مل کے دریا ہو گیا

دنیا بچے کی موت پر ماتم کرے - لیکن جناب رواں کو کچھ بھی غم نہ ہو گا - کیونکہ وہ ایک قطرہ تھا جو

دریا سے مل کر دریا ہو گیا۔ کس قدر بلند تخیل اور صحیح حقیقت ہے۔ ؎

"ہم کہیں دریا سے قطرہ مل کے دریا ہو گیا"

"نظم آنسو" میں آپ آنسو کی حقیقت یوں ظاہر کرتے ہیں۔ ؎

ایک وہ اشک جو ہوں قوم کے غم میں جاری  جس سے سیماب کے ہو قلب پہ حالت طاری
غیر کے درد میں گر خونِ جگر ہو پانی  رونے والے کو گدائی میں ملے سلطانی
رات ہو، بند ہوں آنکھیں کوئی آوازہ نہ ہو  اور بجز ذاتِ خدا ہمدم و ہمراز نہ ہو
یہی آنسو ہیں جو مقبولِ خدا رہتے ہیں  یہی آنسو ہیں کہ جن کے لیے ہم کہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ جو آنسو قوم کے غم میں یا کسی کی تکلیف دیکھ کر جاری ہوتے ہیں وہی آنسو قابلِ قدر ہیں۔ اور وہی بارگاہِ ایزدی میں مقبول۔

باؔلی کی موت کا نظارہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

سکر تو چُپ تھا باؔلی کے قاتل خموش تھے
چہرہ کا رنگ بن کے اُڑے سب کے ہوش تھے

چہرہ کا رنگ بن کے اُڑنا کتنی نادر تشبیہ ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

دل سے حضور کے مری اُلفت جُدا ہوئی
قالب سے روح، پھول سے نکہت جُدا ہوئی

مصرعۂ ثانی غور طلب ہے اسکے دو معنی ہیں۔ باؔلی کے دل سے تاؔرا کی محبت اس طرح جُدا ہوئی جس طرح قالب سے روح اور پھول سے نکہت جُدا ہوتی ہے جو کبھی واپس نہیں آتی۔ دوسرے باؔلی کی محبت جُدا ہونے سے تاؔرا کے جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ اب وہ ایک پژمردہ پھول ہے جسکی نکہت اُڑ گئی یعنی زندگی کی ساری رنگینیاں جاتی رہیں۔ لاجواب مصرعہ ہے

"قالب سے روح پھول سے نکہت جُدا ہوئی"

"شکتی بان" کے ایک بند میں دُنیا کی حالت کا کتنا سچا نقشہ کھینچا ہے۔ ؎

دُنیا میں ہم پیالہ اور ہمسفر بہت ہیں  جو یارِ مال و دولت مشتاقِ زر بہت ہیں
اُلفت نواز ظاہر خواہانِ شر بہت ہیں  المختصر شریکِ فتح و ظفر بہت ہیں
لیکن شریکِ کلفت۔ تکلیف دوستاں میں
عنقا سے بھی زیادہ کمیاب ہیں جہاں میں

حقیقت میں دنیا کا یہی رویہ ہے۔ اس موقع پر والد صاحب کا ایک شعر یاد آگیا۔ ؎

کون ہوتا ہے مصیبت میں جگرؔ آہ شریک
خون بھی اپنا جراحت سے گریزاں نکلا

"روحِ رواں" میں نظموں کے بعد غزلیں ہیں جس میں بہ نسبت دیگر نظموں کے زیادہ کامیابی نمایاں ہے۔ انسان اپنی حالت میں خوش ہے۔ زمانہ اُسے بہائے لیے جا رہا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس طرف ؎

لب تبسم ریز چہرہ شاد دل بہکا ہوا — جا رہا ہوں کس طرف کس رنگ میں ڈوبا ہوا

دنیا کی رنگینیوں سے طبیعت سیر ہوگئی اب اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ؎

اور اب کوئی ورق اے کاتبِ قدرت اُلٹ — اسکو کیا دیکھوں جو ہے سو بار کا دیکھا ہوا

انسان اپنی زندگی کی شادمانیوں پر ناز کرتا ہے۔ حالانکہ جیسے جیسے وہ خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ غلامی کی زنجیر میں جکڑتا جاتا ہے۔ ہندوالوں کے لیے بصیرت افروز سبق ہے۔ ؎

اس نشاطِ زندگی پر ناز ہے تم کو رواںؔ
وقفِ تدبیرِ غلامی جس کی گھڑیاں ہوگئیں

ایسی روح کی بھی کوئی ہستی ہے جو زندگی کے قفس میں مقید ہے اور ایسے دل سے کیا فائدہ جو صدہا غم و آلام میں مبتلا ہو۔ ؎

روح کیا روح جو ہو قیدیِ زندانِ حیات — دل وہ کیا دل جو غمِ دہر سے آزاد نہیں

تین اشعار اور ملاحظہ ہوں۔ ؎

اب خزاں آئے چمن میں کہ رہے فصلِ بہار — مجھ سے کیا واسطہ جب دل مرا آزاد نہیں
وقت جو یاد ہو اب تک اسے ضایع نہ کہو — ہاں وہ ضائع ہوا جو وقت کہ اب یاد نہیں
سب جنھیں سمجھے ہیں قیدی وہ نہیں ہیں قیدی — جنکو سب کہتے ہیں آزاد وہ آزاد نہیں

کوئی دل باختہ اپنے کھوئے ہوئے حواس جمع کر رہا تھا کہ محبوب سے اُس کا سامنا ہوگیا غضب ہوگیا۔ ؎

بس یک جا ہی کرتا تھا اپنے حواس — کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا

آنکھیں تو ہیں لیکن اسرارِ حقیقت کچھ نظر نہیں آتے۔ شاعر اس راز کو سمجھنا چاہتا ہے، لیکن اپنی معذوری کا اظہار کرتا ہے۔ یعنی تابِ دیدار لا نہیں سکتا۔ ؎

کیا غضب ہے ہوں تو آنکھیں دیکھنے کے واسطے / اور ہم چاہیں کہ کچھ دیکھیں مگر دیکھا نہ جائے

دُنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ دلی جذبات بھی ناپائدار ہیں۔ اس لیے اپنی کامیابی پر اظہار مسرت کرنا ناکامیابی پر افسوس کرنا عبث ہے۔ کیونکہ خوشی و رنج کے جذبات بھی اک روز فنا ہو جائیں گے۔ ؎

جب فنا ہونا یقینی ہے دلی جذبات کا / یاس کا غم کامیابی کی مسرت کیا کریں

دیر و حرم کعبہ و بتخانہ سب ایک ڈھکوسلا ہے جسکے باعث اکثر شدید خونریزیاں ہوئی ہیں اور فرقوں میں ناچاقی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ جب اُسکا جلوہ ہر جگہ موجود ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ مندر یا مسجد ہی میں سر جھکایا جائے۔

ہم نہ بتخانہ کے بندے ہیں نہ کعبہ کے مرید / ہو جہاں نورِ حقیقت سر جھکانا چاہیے

ایک شعر کتنا پُر معنی ہے۔ ؎

سہل سی اک بات ہے مرنا مگر اُف قیدِ زیست / روح کے آزاد ہونے کو زمانہ چاہیے

اشعارِ ذیل سے شاعر کی خودداری اور اعلیٰ تخیلات کا پتہ چلتا ہے۔ ؎

سنگِ زمینِ کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے / ایسے بھی چند سجدے ہیں نامۂ نیاز میں

عظمتِ روح کا احساس بھی باقی نہ رہا / ہم کو برباد کیا مشقِ جبیں سائی نے

کائنات کا ذرہ ذرہ ایک راز ہے جو کسی کے سلجھائے نہیں سلجھتا بلکہ کشودِ راز کی کوشش سے پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عقدہ کشا خود راز بن جاتا ہے۔ ؎

ناخنِ امتیاز کی عقدہ کشائیاں کجا / آپ ہی راز بن گیا سعیِ کشودِ راز میں

لیکن اس میں بھی انسان کا قصور ہے ورنہ سارا عالم سمجھ میں آجائے۔ ؎

نہیں ہے چشمِ انساں درخورِ کیفِ نظر ورنہ / ہر اک خاموش نقطہ میں ہے عالم محشرستاں کا

وہ عالم گر نظر آجائے جو آنکھوں سے پنہاں ہے / ابھی سارا بھرم کھل جائے دنیائے نمایاں کا

زندگی و موت کیا ہے صرف اُن عنوانوں کا نام ہے جو زندگی کے باب میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ؎

کوئی تفسیرِ بابِ زندگانی کی نہیں ممکن / حیات و موت بھی اک نام ہے تبدیلِ عنواں کا

بادِ بہاری کا کام پژمردہ پھولوں کو شگفتہ کرنا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دلِ پژمردہ ہی کو وہاں کیوں نہ لے جائیں جہاں سے بادِ بہاری آئی ہے۔ ؎

چلو وہیں دلِ پژمردہ لے چلیں اپنا / جہاں سے بادِ بہاری چمن میں آئی ہے

بہار کا پیش خیمہ آفتاب کی پہلی کرن ہے جو روز اول سے اس کام پر معمور ہے۔ ؎

ازل سے ہی یہی باب بہار کی سرخی جو آفتاب کی پہلی کرن میں آئی ہے

زندگی فانی نہیں ہے۔ ؎

یہ گل ہوئی ہی نہ شمع حیات گل ہو کی ہزار بار یونہی انجمن میں آئی ہے

کیونکہ ؎

مرگ بے ہنگام کہتے ہیں جسے آج اہل درد کل یہی صورت بدل کر زندگی ہو جائیگی

گردش پرکار لکھی ہے مقدر میں رواں نقطۂ انجام ہستی سرحد آغاز ہے

دنیا کی کوئی چیز جب ایک حالت پر نہیں رہتی تو کس کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ؎

نفس نفس متغیر ہے عالم فانی کسی کو آئے تو کس طرح اعتبار آئے

انسان کی امیدیں کبھی ختم نہیں ہوتیں وہ اس عالم میں سیکڑوں امیدیں لیے ہوئے آیا ہے، اور صدہا آرزوئیں لئے ہوئے واپس جائیگا۔ ان امیدوں کی دلکش دنیا کے لیے شاعر اپنے خالق کے کرم پر نثار ہوتا ہے۔ ؎

ترے کرم کے تصدق ترے کرم کے نثار امیدوار گئے ہم، امیدوار آئے

انسان پر جب تک مصیبت نہیں آتی وہ راہ راست پر نہیں آتا اس لیے اُسے غم کا احسانمند ہونا چاہیے ؎

پیہم نے وہ درد کہ انساں بنا دیا منت پذیر ہوں ستم روزگار کا

ایمان پر ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ ؎

شعاع نور ایماں دل تک آتے دیر لگتی ہے بڑی دشواریوں سے روشنی آتی ہے اس گھر میں

فرائض انسانی کو پورا کرنا زندگی اور نہ پورا کرنا موت ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنے فرائض کی تکمیل تا حد امکان نہ کی تو وہ زندہ درگور ہے۔ فرائض کو پورا کرنے والا مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ؎

اسیکا نام ہے مرنا اسی کا نام ہے جینا ادائے فرض انساں تا حد مقدور ہو جانا

غزلوں کے بعد مرحوم کی رباعیات ہیں۔ جن سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ تشریح سے مضمون طولانی ہو جائیگا۔ اہل نظر دیکھیں اور لطف اندوز ہوں۔

(منظر نگاری)

کس کے جلووں کی یہ فراوانی ہے کیسی آخر یہ بزم نورانی ہے

یہ ماہ دو ہفتہ اور یہ صبح جمیل کس کا رخسار کس کی پیشانی ہے

ہر قلب پہ بجلیاں گراتی آئی  اک آگ سی ہر طرف لگاتی آئی
بکسے جاتے ہیں زخمہائے کہنہ  پھر صبح بہار مسکراتی آئی

---

فطرت کہتی ہے ظلمتوں کے پسِ پشت  کیا ہو باراں نور اگر ہو یکشت
ہنگامۂ طور کر رہی ہے برپا  صبح خنداں کی اک حنائی انگشت

(جذبات نگاری)

مانا کاوش بھی کاوشِ غم تو نہ تھی  گریہ تھا مگر نوائے ماتم تو نہ تھی
بچپن میں جو بات تھی جوانی میں کہاں  خندہ بھی تھا فغانِ پیہم تو نہ تھی

---

کچھ وقت اگر خوشی میں کٹ جاتا ہے  تسکین ہوتی ہے رنج بٹ جاتا ہے
اکثر تو کچھ ایسا حال ہوتا ہے رواں  بالکل دنیا سے جی اُچٹ جاتا ہے

(موت ارتقائے حیات اور علاج غم ہے)

کیوں تیشۂ باغباں سے دل مضطر ہو  شائد یہ قلم بھی نخل بار آور ہو
مقراض اجل ہے قاطعِ شاخ حیات  ممکن ہے اسی میں رازِ جانِ عمر ہو

---

دل مائل گریہ کس لیے ہوتا ہے  کیوں بے سبب آنسوؤں سے مُنہ دھوتا ہے
لاحل نہیں عقدۂ صعوبات جہاں  جب موت یقینی ہے تو کیوں روتا ہے

---

آخر میں رواں کی جوانمرگی پر انھیں کی رباعی سے تسکین ہوتی ہے۔

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی؟  بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی؟
یہ گل کی مہک تھی - وہ ہوا کا جھونکا  اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

---

# مرقع عبرت

(از مولانا اظہار الحق صاحب سہیل عباسی امروہوی)

گھڑی، گھنٹے، پہر، دن رات ہفتے — مہینے، سال، صدیاں، قرنہا قرن
اُجالا دن کا اور شب کا دھندلکا — شفق کا رنگ اور تاروں کی جھل مل
وہ سورج کی تپش اور سخت گرمی — زمین و آسماں میں آگ ہی آگ
غضب کی چلچلاتی دھوپ پڑنا — تھپیڑے لُو کے اور آندھی بگولے
زمانہ بھرکا اور برسات کی رُت — خزاں کی آمد اور پت جھڑ کا موسم
کڑاکا سخت سردی سنسناہٹ — گرج بادل کی اور بجلی چمکنا

یہ سب چیزیں گذرتی جارہی ہیں
نصیحت کا سبق سکھلا رہی ہیں

ہوا کا شور اور بوندوں کی چھم چھم — گھٹا گھنگھور ہر سو گھُپ اندھیرا
شب مہتاب اور وہ چاندنی رات — زمین و آسماں میں بقعۂ نور
مہک پھولوں کی اور غنچوں کی رنگت — چمن کا لطف اور سبزے کی رونق
سماں اور قحط اور اچھے بُرے دن — ولادت کی خوشی اور موت کا غم
مصیبت درد دکھ تکلیف وا دیار — غم و رنج و الم حیرانی و فکر
خوشی آرام بے فکری سُکھ اور چین — حکومت زور اور اقبالمندی

یہ سب چیزیں گذرتی جارہی ہیں
نصیحت کا سبق سکھلا رہی ہیں

وہ شادی خانہ آبادی کے جلسے — وہ دولھا کا دُلھن کو بیاہ لانا
وہ منہ مانگی مرادوں کا بر آنا — وہ دن دونی محبت اور چاہت
وہ فرش خواب پر پھولوں کی سیجیں — کسی نازک بدن کا بستر ناز

چہیتی دلہنوں کی چاند سی شکل  رخ نازک پہ تل ہونٹوں پہ مسّی
سجیلی اور نکیلی اور غضب کی  نشیلی آنکھ میں سرمہ کی دھاری
کرن پھول اور جھومر کی وہ زینت  پری چھن اور پازیبوں کی جھنکار
بناوٹ اور سجاوٹ اور لگاوٹ  وہ زیبائش و آرائش کے ساماں
لباسِ فاخرانہ ناز و انداز  تکلف آن بان اور عزت و شان

یہ سب باتیں گذرتی جارہی ہیں
نصیحت کا سبق سکھلا رہی ہیں

کسی کے ہجر کی جانکاہ تکلیف  کسی پیارے کا پیارے سے بچھڑنا
وہ گرمِ شمارات دن کا دل ہی دل میں  غموں کی چوٹ اور وہ صبر کی سِل
کسی کے ایک ایک بچے کا مرنا  اُجڑنا کوکھ، ہونا گود خالی
وہ ماں جائے کا غم، بیرن کا لاشہ  چہیتی بہن کا داغِ جدائی
جنازہ لاڈلے بیٹے کا اُٹھنا  دہاڑیں مارنا، کھانا پچھاڑیں
وہ ننھے ننھے بچوں کی یتیمی  وہ دکھیا ایک بیوہ کی تباہی
وہ آدھی رات کا اُٹھ اُٹھ کے رونا  تڑپنا فرطِ غم سے بستر پر
نمیتا[1] اور لاوارث کی آہیں  سسکنا اور بلکنا اور بچھڑنا

یہ سب چیزیں گذرتی جارہی ہیں
نصیحت کا سبق سکھا رہی ہیں

وہ مارے بھوک کے آنکھوں میں حلقے  وہ بچپنے میں کہنا ہائے میّا
پھٹے کپڑے پہننا عید کے دن  وہ غیروں کی طرف حسرت سے تکنا
نئی بیاہی دُلھن کا وہ رنڈاپا  جگر کا داغ اور وہ دل کا ناسور
وہ جب خلقت پڑی سوتی ہو شب کو  کسی بیوہ کا چپکے چپکے رونا
تڑپ کر لوٹ کر رو کر سسک کر  جوانی کا نہ کٹنا پر نہ کٹنا
سمندر کا سفر طوفان کا زور  بھنور میں پھنس کے نیّا کی تباہی
مسافر کا وطن سے دُور ہو کر  کسی آفت میں گھر کر جان دینا

یہ سب چیزیں گذرتی جارہی ہیں
نصیحت کا سبق سکھلا رہی ہیں

[1] بچہ جسکی ماں مرگئی ہو۔

# دو ڈاکٹر[ل]

(ایک قصہ)

(۱)

ان میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

دونوں ڈاکٹر تھے۔ دونوں ایک ہی محلہ میں رہتے تھے۔ دونوں نے ایک ہی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ فائنل امتحان پاس کیا تھا۔ اب دونوں ایک ہی بازار میں پریکٹس کرتے تھے اور دونوں کی دوکانیں آمنے سامنے تھیں۔

مگر پھر بھی ان میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک کا نام فقیر چند تھا اور دوسرے کا امیر چند۔ ایک پرانی لکیر کا فقیر تھا دوسرا آزاد خیال۔ ایک مذہب کے نام پر جان دیتا تھا دوسرا اسکا مذاق اُڑاتا تھا۔ ایک پوجا پاٹ کیے بغیر مُنہ میں پانی ڈالنا بھی گناہ سمجھتا تھا دوسرے کا خیال تھا کہ یہ طریق عبادت زمانۂ جاہلیت کی ایک یادگار ہے۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک تھے۔ یہ بات دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی کہ وہ طور طریق کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اتنے دُور، لیکن دل سے ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ آگ اور پانی کا ایسا میل لوگوں نے کم دیکھا ہوگا۔

ایک دن فقیر چند نے امیر چند سے کہا۔ ایک بات کہوں۔ مانوگے؟۔

امیر چند نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے سگریٹ جلایا اور فقیر چند کی طرف بولے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی خاص بات ہے۔ فرمائیے۔ کیا حکم ہے؟۔

---

ل یہ قصہ ہندی اُردو کے مشہور فسانہ نگار جناب سدرشن کا لکھا ہوا ہے۔ جسے رسالہ وشال بھارت کلکتہ سے حضرت عظمت الہ آبادی نے ہندی سے ترجمہ کرکے ہدیۂ ناظرین زمانہ کیا ہے۔

فقیر چند۔ پہلے وعدہ کرو۔ مانو گے۔ پھر کہونگا۔
امیر چند۔ اگر ماننے کے لائق ہوگی تو ضرور مانونگا
فقیر چند۔ اسکی شرط نہیں۔ پہلے وعدہ کرو۔
امیر چند نے سگریٹ کی راکھ زمین پر گراکر کہا۔ "کورے کاغذ پر دستخط کرانا چاہتے ہو؟
فقیر چند۔ اب یہی سمجھ لو۔ اگر مجھ پر اعتماد ہے تو کردو، نہیں تو نہ کرو۔ بولو کیا کہتے ہو؟
امیر چند۔ اور اگر تم دو چار ہزار کا پرونوٹ لکھالو تو پھر کیا کرونگا؟ میں لاکھ کہوں کہ صاحب!
کورے کاغذ پر دستخط کردیے تھے مگر کون مانے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ بکتا ہے۔
اُس وقت روپیہ لے لیا۔ اب مانگا تو لگا بہلنے بنانے۔
فقیر چند۔ (کندھے سے پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوے) اس طرح رہائی نہ ہوگی۔ وعدہ کرو نہیں تو
کھانا پینا ترک کردونگا پھر منانتے پھرو گے۔
امیر چند۔ (متانت سے) تم ڈاکٹر ہو یا کوتوال؟
فقیر چند۔ تم کو توال ہی سمجھ لو۔ مگر وعدہ کرنا ہوگا۔ لو اب میرا وقت برباد نہ کرو۔ کہو جو کہوگے مانونگا۔
امیر چند۔ (مجبور ہوکر) اچھا بھئی۔ وعدہ۔ کہو کیا کہتے ہو؟۔
فقیر چند۔ کہتا یہ ہوں کہ تم نے آج تک پوجا نہیں کی۔ نہ کبھی مندر گئے ہو لیکن کل جنم اشٹمی
کا دن ہے۔ کل تمھیں پوجا کرنی ہوگی۔ بتاؤ کروگے نا؟۔
امیر چند۔ اب میرے بتانے کی بات ہی کہاں رہ گئی ہے؟ تم نے وعدہ ہی لے لیا ہے
لیکن اس سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا؟ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔
فقیر چند۔ مجھے روحانی مسرت حاصل ہوگی۔ میرا پرماتما خوش ہوگا کہ چلو ایک بار تو تم نے
اس کے سامنے سرنیاز خم کیا۔
امیر چند نے فقیر چند کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر بولے کہ "تمھاری
بہشت میں میرا جانے کا ارادہ تو نہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے تم گھسیٹ کرلے جاؤگے۔ اب
نہ مانوں تو منہ بنالوگے۔ دودن کھانا نہ کھاؤگے۔ تمھارا کیا بگڑیگا؟ بھابی البتہ خفا
ہو جائینگی۔ یہ مشکل ہے۔ خیر پوجا کرلیں گے۔"
یہ کہہ کر وہ سگریٹ کا دُھواں اُڑانے لگے۔ فقیر چند نے کہا "آج تم نے میرا جی خوش
کردیا ہے۔"

امیر چند۔ مگر اس پوجا کا طریقہ کیا ہے۔ یہ تو بتا دو۔
فقیر چند۔ اشنان کرکے تنہائی میں بیٹھ جاؤ اور مالا پھیرو۔ اسکے ساتھ ہی رادھا کرشن کا نام لیتے رہو۔ یہی پوجا ہے۔
امیر چند۔ بس اسی سے پرماتما خوش ہو جائیگا۔ یہ تو بہت سہل نسخہ ہے بھئی!
فقیر چند۔ (مسکراکر) تم نے کیا سمجھا تھا کہ گلے میں رسا ڈالنا ہوگا۔ (تھوڑی دیر بعد) تمھارے پاس مالا ہے یا نہیں؟
امیر چند۔ ہمارے جیسے بے دینوں کے پاس یہ مقدس چیز کہاں۔ مالا بھیج دوگے پھیرونگا نہ بھیجوگے نہ پھیرونگا۔ اب اگر ہم نے کل مالا نہ پھیری تو اسکا گناہ تمھارے ذمہ۔ ہم پرماتما سے صاف کہدینگے کہ اسے پکڑو۔ اس نے مالا کیوں نہیں بھیجی۔ ہم تو بھگت راج بننے کے لیے بیٹھے تھے۔

(۲)

دوسرے دن امیر چند نے غسل کیا اور مالا لیکر ایک الگ کمرہ میں چلے گئے۔ بیوی، ماں اور نوکر سے کہدیا کہ "ہم رادھا کرشن کی یاد کرینگے۔ کوئی ملنے آئے تو کہدینا کہ اس وقت نہیں مل سکتے۔ پھر آنا"۔
یہ حکم دے کر امیر چند نے کمرے کے دروازے اندر سے بند کرلیے اور آسن پر بیٹھکر مالا پھیرنے لگے۔ ان کی بیوی ساوتری باہر ایک چوکی پر بیٹھ گئی اور بچہ کا سوئٹر بننے لگی۔
یکایک ماگھی بھنگی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا اور کچھ دور ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ گھبراہٹ اتنی تھی کہ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔
ساوتری نے سلائی سے تاگے کو گرہ دیتے ہوئے ایک بار اسکی طرف دیکھا اور پھر سوئٹر بنتے ہوئے کہا "کیوں ماگھی گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"
ماگھی نے دونوں ہاتھوں سے سلام کرکے کہا "ماں جی! چھوٹو کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے! رات کو کھس کھس (خوش خوش) سویا تھا، صبح اُٹھکر دیکھا تو بیہوس (بیہوش) پڑا ہے۔ پہلے گرم تیل کی مالس (مالش) کرتے رہے کہ شاید ہوس (ہوش) آجائے۔ مگر سنکتا ہی نہیں۔ اب یہاں آیا ہوں (ادھر اُدھر دیکھکر) ڈاکڈر صاحب (ڈاکٹر صاحب) کہاں ہیں؟"
ساوتری نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سوئٹر بنتے ہوئے

بولی "ذرا دھیرے دھیرے بولو۔ مالا پھیر رہے ہیں۔ کب سے بیہوش ہے؟"
ماگھی گڑگڑا کر بولا۔ "ماں جی! ہمیں کیا معلوم۔ سویرے اٹھ کر جھاڑو دینے چلا جاتا تھا
آج دن چڑھے تک سوتا رہا تو میں نے آپ کی بھنگن سے کہا۔ اسے جگا۔ کب تک سوتا رہیگا۔
اٹھ کر دیکھا تو وہ بے ہوس (بے ہوش) پڑا تھا۔"
یہ کہہ کر ماگھی نے مضطربانہ کمرے کی طرف دیکھا۔ مگر اسکے کواڑ اب بھی بند تھے۔
ساوتری نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "رات کو شراب تو نہیں پی گیا۔ تمہارے ہاتھ میں پیسہ
آجائے تو شراب پیتے دوڑتے ہو۔"
یہ کہہ کر پھر سوئٹر بننے لگی۔
ماگھی۔ (ہاتھ باندھ کر) "نہیں۔ ماں جی۔ جھوٹا ایسا نہیں ہے۔ وہ مر تا مر جائیگا لیکن نسا
(نشہ) پانی نہ کریگا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"
ساوتری۔ "چل جھوٹا۔ قسم کھا سکتا ہے۔ بیٹے کے لیے کون جھوٹ نہ بولیگا۔ بڑا دیوتا آیا ہے۔"
ماگھی۔ "خیر جھوٹا ہی سہی۔ اب تو ڈاکدر صاحب پر آسا ہے (ڈاکٹر صاحب کا آسرا ہے)
چل کر دیکھ لیں تو چین آئے۔ چھوکری کی ماں اور بہنیں تو مری جا رہی ہیں۔ (کچھ
دیر کے بعد) یہ مالا کب تک کھتم (ختم) ہو گی۔ ماں جی آپ جرا (ذرا) کہہ دیں
تو پہلے دیکھ آئیں۔ دیر کرنے سے کچھ اور کھرابی (خرابی) نہ ہو جائے۔"
ساوتری نے سوئٹر بننا بند کر دیا اور سلائیاں سنبھالتے ہوئے بولی۔ "ارے کس کی
شامت آئی ہے جو ان کو اس وقت بلانے جائے۔ ایک گھنٹہ سے پہلے باہر نہ نکلیں گے
کسی اور کو لے جا۔"
ماگھی۔ (پھر گڑگڑا کر) "پرمیسر (پرمیشور) دونا اقبال کرے، میں بڑی آسا (امید) لیکر
آیا تھا۔ اور کس کے پاس جاؤں۔ آپ کا گلام (غلام) ہوں۔ آپ کے پاس آیا ہوں۔"
ساوتری۔ "تو بیٹھ۔ مالا پھیر کر نکلتے ہیں۔ تو نے جانا۔ تجھے کون دفتر جانا ہے؟"
ماگھی۔ (کمرے کی طرف دیکھ کر دھیرے سے) "ماں جی! ڈاکدر صاحب (ڈاکٹر صاحب)
تو کبھی مالا نہ پھیرتے تھے۔ آج ہی سرو (شروع) کیا ہے۔"
ساوتری۔ (مسکرا کر) "اگر معلوم ہوتا کہ تو آئے گا تو آج بھی نہ شروع کرتے۔"
ماگھی۔ (پھر ہاتھ جوڑ کر) "نہیں۔ ماں جی! میرا یہ منہ کہاں۔ پر یہ کھوب (خوب) ہے

کہ کہیں اور کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔ ورنہ آپ حکم دیں تو سارا دن دروجے (دروازے) پر پڑا ہوں۔ آپ ہی کا کھدمتگار (خدمتگار) ہوں“۔

یہ کہہ کر غریب نے پھر اس کمرے کی طرف دیکھا جسکے اندر ڈاکٹر صاحب بیٹھے مالا پھیر رہے تھے۔

ساوتری۔ ”ذرا بیٹھو۔ ابھی نکلتے ہیں“۔

یہ کہکر ساوتری اندر چلی گئی۔ مالگی دھوپ میں بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں اور جس وفور شوق اور عقیدتمندی سے وہ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا شائد ہی کبھی کسی پوجاری نے اپنے معبود دیوتا کی طرف دیکھا ہو۔ مگر دروازہ کسی بدقسمت کے نصیب کے مانند کھلتا ہی نہ تھا۔ مالگی سوچتا تھا۔ امیر لوگ جب مالا پھیرتے ہیں تب بھی غریبوں کو تکلیف ہی ہوتی ہے۔ اگر میری جگہ کوئی امیر ہوتا تو فوراً مالا چھوڑکر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ہم غریب ہیں ہماری کوئی پروا نہیں کرتا۔

اتنے میں بھنگن نے آکر کہا۔ ”تو عجب پھکڑ ہے وہاں گھر میں بیٹا مر رہا ہے تو یہاں بیٹھا ہے“۔ مالگی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرکے آہستہ سے کہا ”ہماری قسمت ہی کھوٹی ہے۔ ڈاکدر صاحب (ڈاکٹر صاحب) نے آج تک کبھی مالا نہ پھیری تھی آج ہی مالا پھیرنے بیٹھ گئے ہیں۔ کھتم (ختم) ہو تو لیکر چلیں۔ بتلا۔ اب چھوٹو کا کیا حال ہے؟“

بھنگن بھی اپنے بھنگی کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور بلند آواز سے بولی۔ ”وہی حال ہے۔ نہ بولتا ہے نہ ہلتا جلتا ہے۔ تم ڈاکدر صاحب (ڈاکٹر صاحب) کو بلا کیوں نہیں لیتے“۔

مالگی۔ ”بہت خفا ہونگے“۔

بھنگن۔ ”وہاں بچے کی جان پربن رہی ہے۔ تمہیں کھپگی (خفگی) کی پڑی ہے۔ چل۔ دے آواز اُٹھکر یا میں بلاؤں“۔

مالگی۔ ”اور جو کہہ دیں کہ میں نہیں جاتا تو پھر۔ اتنا سوچ لو“۔

بھنگن۔ ”یہ تمہارا وہم ہے۔ یہ ایسے آدمی ہی نہیں ہیں“۔

مالگی۔ ”پہلے اُن دوسرے ڈاکدر صاحب (ڈاکٹر صاحب) کے یہاں گیا تھا۔ وہ پوجا کرنے جارہے تھے۔ صاف کہ دیا کہ میں پوجا کیے بغیر گھر سے باہر نکلونگا لاکھو منت سماجت کی اُنھوں نے ایک نہ سُنی“۔

بھنگن۔ "اُن میں اور اِن میں بڑا پھرک (فرق) ہے"۔

ماگھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کہتے تھے۔ تمھارا بیٹا مَرے یا جئے مجھے اسکی پروا نہیں ہے۔ میرے لیے پہلے پوجا ہے بعد میں اور کچھ"۔

بھنگن۔ "تم ایسے جالم (ظالم) قصائی کے پاس گئے کیوں؟"

ماگھی۔ "میں نے سوچا تھا۔ یہ آدمی پوجا پاٹ کرتا ہے، غریب کی پکار سُن کر کرپا کریگا"۔

بھنگن۔ "میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو بہت پوجا پاٹ کرتے ہیں وہ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے اتنا بھی نہ سوچا کہ اسکے سامنے ایسی بات نہ کہوں۔ اسکے دل کو لگ جائیگی۔ اور تو نے یہ سب کچھ سُن لیا؟"

ماگھی۔ (سرد آہ بھر کر) "گریبوں (غریبوں) کو سب کچھ سُننا ہی پڑتا ہے"۔

بھنگن۔ "مگر کیا گریبوں (غریبوں) کو اور کسی پرمیشر نے بنایا ہے۔ پوجا تو پھر بھی ہو سکتی تھی۔ پرمیشر کہیں بھاگا نہ جاتا تھا۔ پہلے دیکھ آتا تھا پھر مجے (مزے) سے بیٹھکر تمام دن پوجا کرتا۔ کون روکتا تھا"۔

ماگھی۔ (دروازے کی طرف دیکھ کر) "آج مالا کھتم (ختم) ہی نہیں ہوتی"۔

ماگھی جانتا تھا۔ اس وقت بُلانا مناسب نہیں۔ بہت ناراض ہونگے۔ عجب نہیں مار کر نکال دیں۔ مگر وہ باپ تھا اور اسکا بیٹا بدحواس پڑا تھا۔ اس کے دل کو لگی تھی۔ اس سے بیٹھا نہ جاتا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال سے بھی بڑھ کر تھا۔ کچھ دیر دل اور دماغ میں لڑائی ہوتی رہی۔ اسکے بعد وہ اُٹھ کر دروازے کے پاس چلا گیا اور ڈرتے ڈرتے مگر عاجزانہ لہجہ میں بولا۔ "ڈاکدر صاحب (ڈاکٹر صاحب)"

ڈاکٹر صاحب نے مُنہ سے جواب نہ دیا۔ صرف کھانس کر خاموش ہو گئے۔ مگر ماگھی میں اتنی عقل کہاں کہ اس اشارہ کو سمجھتا۔ وہ دروازے کے اور قریب بڑھ گیا اور پھر بولا۔ "ڈاکدر صاحب (ڈاکٹر صاحب)!"

ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو گئیں۔ سوچنے لگے۔ کیا مجھے اب اتنا بھی اختیار نہیں ہے کہ ایک گھنٹہ تنہائی میں بیٹھ کر مالا پھیر سکوں۔ سب کہہ دیا تھا کہ کوئی نہ بلائے۔ پھر بھی آ گیا۔

کچھ دیر توقف کے بعد اُنھوں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا اور دہلیز پر کھڑے ہو کر

ماگھی کی طرف دیکھنے لگے۔ خاموش لیکن خشمناک نگاہیں گویا اس سے سوال کر رہی تھیں۔
"بول کیا کہتا ہے؟"
اب ماگھی کے منہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی اور نہ بھنگن میں طاقت گویائی تھی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے کانپ رہے تھے۔
امیر چند نے غصہ سے کہا "کیا ہے؟ کیا کسی نے تم سے کہا نہ تھا کہ مالا پھیر رہے ہیں"
ماگھی نے بھنگن کی طرف ایک بار دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ بھنگن نے آگے بڑھ کر کہا "سرکار!"
آپ کی کھدمت کھوسامد (خدمت خوشامد) کرتے ہیں۔ آپ کے پاس نہ آئیں تو اور کہاں جائیں۔ چھوٹو بے ہوس (بے ہوش) پڑا ہے۔"
امیر چند نے جواب نہ دیا۔
ماگھی بولا "ایک ہی بیٹا ہے گریب نواج! (غریب نواز) اگر اسے کچھ ہو گیا تو ساری زندگی کھراب (خراب) ہو جائیگی۔ مالس (مالش) کر کر کے ہار گئے ہیں۔ جرا (زرا) حرکت نہیں کرتا۔ سِل کے مانند پڑا ہے سرکار!"
ساوتری روٹی بنانے کے لیے جا رہی تھی یہ آواز سن کر تولیہ لیے ہوئے آنگن میں چلی آئی اور بولی۔ "ماگھی! تو تو بڑا ڈھیٹ ہو گیا ہے۔ کیا میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ مالا پھیر رہے ہیں۔ ذرا رُک جا۔ تم لوگوں سے جتنی نرمی کی جائے اُتنا ہی سر پر چڑھتے جاتے ہو۔"
جواب میں بھنگن کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ امیر چند نے اشارہ سے اُسے روک دیا۔ اور ذرا نرم ہو کر بولے۔ "کسی اور کو لے گئے ہوتے۔ میں مالا پھیر رہا تھا۔"
ماگھی۔ "سرکار! ہم گریبوں (غریبوں) کی کون سنتا ہے! آپ ایسے آپکے پاس چلے آئے۔"
اب امیر چند کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔ مسکرا کر بولے "مگر کیا ایک آدھ گھنٹہ انتظار نہ کر سکتے تھے! بتاؤ!"
ماگھی۔ (گڑگڑا کر) "بالکل بے ہوس (بے ہوش) پڑا ہے سرکار! جرا (زرا) چل کر دیکھ لیں تو۔ جندگی (زندگی) بھر دعائیں دیتا رہونگا۔ ساری عمر کی کمائی ہے۔ ابھی اُسکے بیاہ کو ایک ہی مہینہ ہوا ہے۔"
امیر چند نے مالا رکھ دی اور سوٹ پہن کر اُسکے ساتھ ہو لیے۔ ہوش میں لانے کی کچھ

دوائیں بھی ساتھ لے لیں۔

جب لوٹے اس وقت ایک بج چکا تھا۔ اس وقت تک بھوکے پیاسے وہیں بیٹھے۔ اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ اب وہ ہوش میں تھا اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ بھنگی اور بھنگن کا رُواں رُواں امیر چند کو دعائیں دے رہا تھا۔

امیر چند دس گیارہ بجے کھانا کھایا کرتے تھے۔ مگر آج انھیں اس قاعدے کے ٹوٹنے کی بھی پروا نہ تھی۔ آج بھوکے پیاسے ہوئے پر بھی وہ مطمئن اور مسرور نظر آ رہے تھے۔ آج انھوں نے غریبوں کی پکار سُنی تھی۔ آج انھوں نے فیس نہ لی تھی بلکہ اسکے عوض دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعائیں لی تھیں۔

(۳)

امیر چند جب کھانا کھا کر دوکان پر پہونچے۔ اس وقت انکی کلاک میں سوا دو بج چکے تھے۔ کمپونڈر نے کہا سب مریض لوٹ گئے۔

امیر چند نے کوٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا "کوئی پروا نہیں"۔

کمپونڈر نے ایک خط اُنکے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "سیٹھ منگل داس کا آدمی آیا تھا کہتا تھا۔ جس وقت آئیں اُسی وقت بھیج دینا۔ انکی بیٹی بیمار ہے"۔

امیر چند نے رومال سے مُنہ صاف کر کے خط لے لیا اور اُسے پڑھے بغیر میز پر رکھدیا۔

کمپونڈر نے کہا "سیٹھ صاحب کا آدمی دو بار آ کر لوٹ گیا ہے۔ بڑی تاکید کر گیا ہے کہتا تھا "فوراً آ جائیں"۔

امیر چند نے کرسی پر بیٹھ کر جواب دیا۔ "اچھا"۔

اتنے میں ڈاکٹر فقیر چند نے اپنی دوکان پر سے پکار کر پوچھا "ابھی آئے ہیں یا نہیں؟ آئے ہوں تو بھیج دو"۔

کمپونڈر نے جواب دیا "ابھی آئے ہیں۔ (امیر چند سے) کیا جواب دوں؟ آپ کو بُلا رہے ہیں"۔

امیر چند نے سگریٹ جلا کر دیا سلائی زمین پر پھینکی اور اسے پاؤں سے مسل کر کہا۔ کہو "یہاں آ جائیں"۔

کمپونڈر نے بلند آواز سے کہا "آپ کو بُلا رہے ہیں"۔

امیر چند نے دل میں کہا۔ "آج جنگ عظیم ہو گی"۔
دو منٹ بعد فقیر چند نے آکر پوچھا۔ "آج تو بڑی دیر میں آئے۔ ابھی تک مالا پھیر رہے تھے۔ یا کسی کو دیکھنے چلے گئے تھے؟"
امیر چند نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور اس طرح جیسے کوئی کسی کی شکایت کرتا ہے بولے "بھئی۔ کیا کہوں۔ ان مریضوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ دروازہ بند کر لیا تھا۔ سب کہہ دیا تھا کہ ہمیں کوئی نہ بلائے۔ مگر کون سنتا ہے ایک آدمی آکر دروازہ توڑنے لگا۔ جی تو چاہتا ہے کہ ڈاکٹری چھوڑ کر کوئی اور کام شروع کر دوں۔ یہ بھی کوئی پیشہ ہے۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ کوئی چھ گھنٹے کا نوکر ہے کوئی آٹھ کا۔ یہاں چوبیس گھنٹے کے غلام ہیں۔ مالا پھیرنے کی بھی فرصت نہیں۔ کوئی ایسا کام بتاؤ جس میں کوئی وقت اپنا بھی ہو۔ یہاں تو کل وقت دوسروں کا ہے۔
فقیر چند نے سر ہلایا۔ گویا کہہ رہے تھے۔ مجھے پہلے ہی امید نہ تھی۔ پھر کہا۔ "کون آیا تھا؟ کوئی امیر ہو گا؟"۔
امیر چند۔ "امیر ہوتا تو صاف جواب دیدیتا۔ کہہ دیتا کسی اور کو لے جاؤ"۔
فقیر چند۔ "تو کیا کوئی بھیک منگا تھا جسکے لیے مالا دھری رہ گئی"۔
امیر چند۔ "وہی اپنا بھنگی ماکھی۔ بڑا گڑ گڑاتا تھا اور گڑ گڑا کر روتا تھا۔ اُسکا ایک ہی لڑکا تھا وہ بیمار تھا۔ مجھے رحم آگیا۔ سوچا۔ کوئی امیر ہو تو معمولی بات ہے۔ جسے فیس دے لیجائے۔ مگر اس کے پاس فیس کہاں! جانا پڑا"۔
فقیر چند۔ "میرے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے تو صاف کہہ دیا۔ پہلے پوجا کر لوں، پھر چلونگا۔ وہ اصرار کرنے لگا۔ میں نے نوکر سے کہا۔ باہر نکال دو۔ دُم دبا کر بھاگ گیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کوئی وقت معبود کی پرستش کے لیے بھی دینا چاہیے یا نہیں۔ دنیاداری تو رات دن ہوتی رہتی ہے۔ وہاں کتنی دیر لگی؟"۔
امیر چند۔ "اب آیا ہوں"۔
فقیر چند۔ "جی چاہتا ہے تمہارا کبھی منہ نہ دیکھوں۔ تم نے کل مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا؟"۔
امیر چند۔ (کان پکڑ کر) "بیشک بھول ہو گئی۔ اس دفعہ معاف کر دو"۔
فقیر چند۔ "تمہاری کل زندگی اسی طرح ختم ہو جائیگی۔ چوبیس گھنٹے دنیا کا کام کرتے ہو

کیا دو چار گھڑی بھی تم پرمیشر کی یاد نہیں کر سکتے۔ مروگے تو جہنم کے کندے بنوگے"۔

امیر چند۔ (مسکرا کر) "وہاں تو ہزاروں بیمار ہونگے۔ میں اکیلے کیا کرونگا۔ ہم تم دونوں ہوں تو کسی طرح کام چلا لیں گے۔ چلو گے نا؟"

فقیر چند۔ "تم ہنستے ہو۔ مجھے زہر چڑھتا ہے۔ اب رات کو مندر میں درشن کرنے بھی چلوگے یا نہیں؟ اگر نہ گئے تو یاد رکھو ہم سے کوئی واسطہ نہیں"۔

امیر چند۔ "چلو۔ مان لیا۔ کے بجے چلوگے؟"۔

فقیر چند۔ "یہی آٹھ سوا آٹھ بجے اور کیا۔ کہیں غائب نہ ہو جانا"۔

امیر چند۔ "میری مجال ہے"۔

مگر آٹھ بجے امیر چند دوکان پر نہ تھے۔ کمپونڈر نے کہا۔ "ماگھی آیا تھا اسی کے ساتھ گئے ہیں"۔

فقیر چند۔ "کچھ کہہ گئے ہیں۔ یا نہیں؟"

کمپونڈر۔ "کہتے تھے اگر میں ایک گھنٹہ تک نہ آؤں تو دوکان بند کر کے چلے جانا۔ میرا خیال ہے چھوٹا پھر بیمار ہو گیا ہے"۔

فقیر چند۔ "ذرا سوچو۔ ساری دنیا بھگوان کرشن کے درشن (زیارت) کو جا رہی ہے۔ لالہ صاحب بھنگیوں کے مکان کی سیر کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے تھے یہ بھی درشن کر لیں۔ مگر جب قسمت ہی بگڑی ہو تو کوئی کیا کرے۔ ہم نے اپنا دوستانہ فرض ادا کر دیا۔ ہمیں اسی کا اطمینان ہے"۔

کمپونڈر۔ "سویرے سیٹھ منگل داس کا آدمی آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ آئیں تو بھیج دینا۔ جب چلنے کو تیار ہوئے تو وہی ماگھی آ گیا اور رونے لگا۔ بس سیٹھ کے یہاں جانا ملتوی کر کے اسی کے ساتھ چلے گئے"۔

فقیر چند۔ (تعجب سے) "ارے اتنی بے پروائی۔ یہی لچھن ہیں تو پریکٹیس چل چکی۔ پھر کہیں گے ہمیں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ارے بابا۔ جب تم اپنے آپ کو خود نہیں پوچھتے تو تمھیں دوسرے کب پوچھینگے۔ کیا یہی بھنگی چمار انھیں کھانا دیدیں گے؟ میرا تو اس آدمی سے جی بیزار ہو گیا۔ جنم اشٹمی کے دن بھی یہ حال۔ نہ سویرے مالا پھیری نہ رات کو بھگوان کے درشن کیے۔ پورا بے دین ولامذہب ہے۔ ایسے آدمی کی صورت دیکھنا بھی گناہ ہے"۔

(۴)

مگر دوسرے دن ابھی سورج بھی طلوع نہ ہوا تھا کہ انھوں نے امیر چند کو جا جگایا۔
امیر چند نے انھیں اپنے پلنگ پر بیٹھنے کو جگہ دیتے ہوئے کہا "بھئی۔ مجھے بہت ندامت ہے کہ میں رات تمھارے ساتھ نہ جا سکا۔ وہ ناگھی پھر آکر گڑگڑانے لگا۔ میں نے خیال کیا کہ دس بارہ منٹ میں واپس آجاؤنگا۔ مگر وہاں ساڑھے بارہ بج گئے۔ اب کس منہ سے کہوں۔ معاف کرو!"۔
فقیر چند۔ "میں نے تو عہد کر لیا تھا کہ تم سے بات بھی نہ کرونگا۔ جو آدمی وعدہ کر کر مکر جائے اُسکا کیا اعتبار!"۔
امیر چند۔ (مسکرا کر) "بھئی۔ بولنا بند کر دو لیکن اس وقت ایک مرتبہ اپنی صورت دکھا جایا کرو۔ بس میرے لیے اتنا ہی بہت ہے"۔
فقیر چند۔ (سُنی ان سُنی کر کے) "جانتے ہو میں اس وقت کیوں آیا ہوں؟"
امیر چند۔ "کوئی نیا عہد لینے آئے ہوگے؟"۔
فقیر چند۔ "نہ بابا۔ میں باز آیا۔ عہد لینے سے۔ میں اس وقت تمھیں ایک عجیب و حیرتناک خبر سُنانے آیا ہوں"۔
امیر چند نے جسم پر کپڑا لپیٹ لیا اور بولے۔ سُناؤ۔
فقیر چند۔ "ایسی عجیب بات ہے کہ چونک پڑو گے۔ میرا تو خیال ہے کہ شاید تمھیں یقین ہی نہ آئے سمجھو گے ہنستا ہے۔
امیر چند۔ "تو اس طویل تمہید کی کیا ضرورت ہے۔ کہو بھی بات کیا ہے"۔
فقیر چند نے کہا "تمھیں یہ تو معلوم ہے کہ میری نگاہوں میں پوجا پاٹ کی بہت قدر و منزلت ہے مگر میں اُٹھتا آٹھ بجے ہوں۔ خدا جانے کیوں آج میری آنکھ تین بجے ہی کھُل گئی۔ سوچا کہ لاؤ آج اسی وقت پوجا کر لیں۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد میں پوجا کے کمرے میں چلا گیا اور پوجا کرنے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کمرہ کسی مقدس نور سے معمور ہو گیا ہے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے سری کرشن جی کی مورت اپنی نورانی شکل میں کھڑے مُسکرا رہی تھی
امیر چند۔ (حیرت سے) "خود سری کرشن کھڑی مُسکرا رہے تھے!"
فقیر چند۔ "میں نے انکی طرف دیکھا اور اُنکے قدموں پر گر گیا۔ اس وقت میرے قلب میں جو

مسرت کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں ان کو بیان نہیں کرسکتا۔ سمجھا کہ برسوں کی ریاضت کام آگئی۔ بھگوان اپنے بھگت کو درشن دینے آ گئے۔ دوسرے لمحہ میں بھگوان نے مجھے اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اور میری طرف دیکھا۔ اب انکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں بولے "تو ہم سے مذاق کرتا ہے"۔ مجھے اپنے جسم کا لہو سرد ہوتا نظر آیا۔ میں بولنا چاہتا تھا۔ لیکن میری طاقت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُن کی طرف دیکھا اور گردن جھکالی۔ اُنھوں نے کہا۔ "آج اس شہر میں ہزاروں نے میری پوجا کی ہے لیکن وہ درحقیقت ریا و نمائش ہے سچی پوجا صرف ایک شخص نے کی ہے اور وہ تیرا گنا ہگار دوست امیر چند ہے۔ اگر مجھے خوش کرنا چاہتا ہے تو جا کر اپنی تلخ گفتاری کی اُس سے معافی مانگ۔ وہ میرا بھگت نہیں بھگت راج ہے۔ یہ کہکر بھگوان نے میری پشت کو پیار سے تھپکی دی۔ دیکھتے دیکھتے مجھ پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جب ہوش آیا تو وہی کمرہ تھا، سامنے وہی سنگین مورت اور وہی لیمپ۔ چاروں طرف تجسس کی نگاہ ڈالی۔ سری کرشن کہیں بھی نہ تھے۔ خدا معلوم کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے"۔

کچھ دیر دونوں دوست گردن جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ اسکے بعد امیر چند بولے۔ "میں سمجھ گیا یہ خواب تھا۔ تین بجے اُٹھے تھے پوجا کرتے کرتے جھپکی آگئی۔ ورنہ ہماری قسمت ایسی کہاں کہ سری کرشن ہمیں اپنا بھگت سمجھیں۔ ضرور خواب تھا"۔

فقیر چند نے امیر چند کو معتقدانہ نگاہ سے دیکھا اور کہا "تم اسے خواب بتلاتے ہو میں سمجھتا ہوں میری ساری زندگی میں یہی گھڑی ہوش و حواس کی تھی۔ آج میں نے حقیقت کو پا لیا۔ آج میں اسکی گہرائی تک پہونچا ہوں۔ میں تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔ آج میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آج مجھے صداقت کی روشنی مل گئی"۔

یہ کہتے کہتے فقیر چند نے اپنے دوست کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا آج تک تم میرے پیارے تھے، اب میرے بھگوان کے پیارے ہو۔

اس وقت انکی آنکھوں میں عقیدتمندی اور ارادت کے آنسو لہرا رہے تھے۔

---

۸ / ۱۹

# انقلاب

(از مسٹر راجندر ناتھ شیدا مظفرنگری)

ادھر ظلمت ہوئی رخصت، چھپا ایک ایک ستارہ
ادھر رک رک کے نکلا آفتاب آہستہ آہستہ
الٰہی بخشدے مجھ ناتواں کو تابِ نظارہ
کسی نے رخ سے سرکایا نقاب آہستہ آہستہ

---

نسیمِ صبح سوئے باغ کیا اترا کے چلتی ہے
جوانانِ چمن بھی دیکھکر آوازہ کستے ہیں
گلوں کے پاس سے کس کس طرح ہو کر نکلتی ہے
مجھے معلوم ہیں بادِ صبا جو تیرے رستے ہیں

---

شفق کی روشنی تالاب کے آبِ مصفّا پر
گھنے پتوں سے چھن چھن کر نرالے گل کھلاتی ہے
یکایک بھاگتی ہے سوئے ساحل موج گھبرا کر
کنول کی پنکھڑی جب قطرۂ شبنم گراتی ہے

---

چمن سے دور اور صیاد کے گھر قید خانے میں
کوئی ناشاد تیرہ بخت وقفِ آہ و زاری ہے
مگر پھر بھی کسی ہمدم سے کوئی آشیانے میں
کہیں یہ بھی نہ کہہ دینا کہ اس پر رات بھاری ہے

---

کسی نے لو لگا رکھی ہے اس محبوبِ مطلق سے
ترقی دے رہا ہے کوئی شغلِ مے پرستی کو
کسی نے عشقِ ساقی سے کسی نے الفتِ حق سے
مزے لے لیکے لوٹا ہے غرض دنیائے ہستی کو

---

دلوں کے غنچۂ معصوم کھلنے بھی نہ پائے تھے
عروسانِ چمن پر ہاتھ ڈالا آ کے گلچیں نے
زہے اقبال بدبختوں کو ایسے دن دکھائے تھے
مگر دھوکا دیا ملکر لباسِ سرخ و زریں نے

---

غرض اس عالمِ موہوم کی ہر چیز فانی ہے
شہنشاہِ جہاں کیا اور خاکِ زیرِ پا کیا ہے
تو پھر او مستِ گل بیکار زعمِ نوجوانی ہے
کبھی سوچا تو ہوتا تو نے تیرا مدعا کیا ہے۔

# شمس العلما سیّد ممتاز علی مرحوم

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے شمالی ہندوستان میں ایسے بزرگوں کی ایک معقول تعداد موجود تھی جنھوں نے اُردو ادب اور قومی خدمت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ مثلاً نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا حافظ نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی سید ممتاز علی وغیرہ۔ یہ سب بزرگ سر سیّد مرحوم کے رفیق کار و ارادت کیش تھے۔ مگر اس محفلِ ادب کے یہ منور چراغ ایک ایک کرکے گُل ہو گئے۔ شمس العلما، مولوی سیّد ممتاز علی اِس بزم ادب کے نام لیوا باقی تھے۔ افسوس وہ بھی ۱۵۔ جون ۳۵ء کو داغ مفارقت دے گئے۔ اب یہ پُرانی محفل ویران ہو گئی، اور ان زندہ دل بزرگوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا۔

سید ممتاز علی مرحوم ۷۔ ستمبر ۱۸۶۰ء کو عین میلاد النبی کے دن پیدا ہوئے تھے، عجیب بات ہے کہ آپ کا انتقال بھی جس دن ہوا وہ میلاد النبی سے اگلا روز تھا۔ گو آپ کی عمر کا بہت بڑا حصہ لاہور میں گذرا، لیکن آپ کا اصلی وطن دیوبند ضلع سہارنپور تھا۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار سید ذوالفقار علی پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے، لیکن تیرہ برس ہی کی عمر میں شفیق باپ کا سایہ آپکے سر سے اُٹھ گیا اور آپ وطن آکر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اور مدرسہ کے مشہور بانی حضرت مولانا محمد قاسم کی نگرانی میں عربی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں آپ نے انگریزی پڑھنا شروع کی، اور ۱۸۸۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان دیا، مگر کامیاب نہ ہوئے آخر یہ سلسلہ بھی یہیں ختم ہو گیا۔

۱۸۸۰ء میں آپ کی شمس العلما مولوی سید محمد حسین آزاد دہلوی سے ملاقات ہوئی، آپ کے والد سید ذوالفقار علی اور آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا گہرا دوستانہ تھا۔ اب دونوں کے صاجزادوں میں بھی پُرخلوص تعلقات قائم ہو گئے، اور سید ممتاز علی نے مولانا آزاد کو اپنا اُستاد بنایا۔

مذہبی مباحثوں اور مناظروں سے آپ کو خاص شوق تھا۔ اس زمانہ میں عیسائی پادریوں کی جدوجہد زور شور سے جاری تھی اور مرحوم کو بھی بعض اوقات پادریوں سے بحث کرنے کا موقع

مل جاتا تھا۔ اسی بحث ومباحثہ سے سید ممتاز علی کے دل میں اسلام کی طرف سے بعض شکوک پیدا ہو گئے۔ آپ نے سرسید کے نام ایک لمبا چوڑا خط لکھکر اپنے شکوک پیش کئے۔ خط موصول ہونے پر سرسید نے مرحوم کو اپنے پاس کلکتہ بلا لیا اور تقریباً ڈیڑھ مہینہ تک اپنی صحبت میں رکھا۔ اس طرح ہر وقت کی صحبت میں مباحثہ ومناظرہ ہوکر مرحوم کے تمام شکوک رفع ہو گئے۔ سرسید پر بھی مرحوم کے تبحرِ علمی اور تحقیق مذہبی کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ اپنی تفسیر میں اکثر اوقات مرحوم سے مشورہ لینے لگے۔

تعلیم سے فارغ ہوکر مرحوم پنجاب چیفکورٹ کے مترجم مقرر ہو گئے اور ۱۸۸۶ء میں آپ کی شادی بھی ہو گئی، لیکن ۱۸۹۱ء میں آپ کو علالت کی وجہ سے ملازمت چھوڑنا پڑی۔ اس کے بعد سرسید نے مرحوم کو اپنے پاس بلا لیا، اور ۱۸۹۵ء میں دوسرا صدمہ ہوا یعنی آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور آپ دو سال تک مرحومہ کے سوگ میں مبتلا رہے، بعدہٗ ۱۸۹۷ء میں آپ کا سید احمد شفیع اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صاحبزادی محمدی بیگم صاحبہ سے عقد ہوا۔ اس شادی نے مولانا کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

سید ممتاز علی صاحب سرسید کی صحبت سے کافی فیضیاب ہو چکے تھے۔ سرسید نے مسلمان نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے علیگڈھ میں کالج قائم کیا تو سید ممتاز علی کے دل میں مسلم خواتین کو تعلیم دینے کا شوق پیدا ہوا جس میں آپ کو اپنی بیوی سے جو بہت ہی لائق اور فاضل خاتون تھیں بہت کچھ تقویت پہونچی ۱۸۹۸ء میں آپ نے مطبع رفاہ عام قائم کرکے ایک پبلشنگ ہاؤس کی بنیاد ڈالی، اور تہذیب نسواں ایک ہفتہ وار زنانہ اخبار جاری کیا۔ جو آج سینتیس ۳۷ برس کے بعد بھی پوری کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

غرض جس طرح مسلمانوں کو جدید علوم اور انگریزی تعلیم سے شوق سرسید احمد خان بہادر کی مبارک کوششوں کی بدولت پیدا ہوا، اسی طرح مسلم عورتوں میں تعلیم کا چرچا بھی بہت کچھ سید ممتاز علی مرحوم کی مبارک جاں فشانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اپنی تمام زندگی عورتوں کی فلاح وبہبود کی فکر میں صرف کر دی۔

تصنیف وتالیف کے لحاظ سے بھی سید ممتاز علی صاحب اُردو کے ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں "حقوق نسواں"۔ "زاد المعاد"۔ "رد الملاحدہ"۔ تذکرۃ الانبیا۔ اُردو ریڈریں وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ لیکن آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تفضیل البیان" ہے، جس کی ترتیب وتالیف میں آپ نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا۔ اس کتاب کی مدد سے

قرآن شریف کی ایک مطلب اور موضوع کی تمام آتیں ایک منٹ میں سامنے آجاتی ہیں۔ آپ
کو اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے اس قدر شوق تھا کہ ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود آخر
وقت تک اس کی ترتیب میں مصروف رہے۔

تہذیب نسواں کے علاوہ سید ممتاز علی مرحوم نے مسلمان بچوں کے لئے بھی ایک اخبار
"پھول" کے نام سے جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔ مرحوم کے دو صاحبزادے سید حمید علی اور
سید امتیاز علی تاج دونوں تعلیم یافتہ اور بہت لائق نوجوان ہیں۔ حمید علی صاحب کی اہلیہ محترمہ
آصف جہاں بیگم صاحبہ آجکل تہذیب نسواں کی ایڈیٹری کر رہی ہیں، اور تاج صاحب کی رفیق زندگی
اردو کی مشہور فسانہ نگار حجاب اسمٰعیل صاحبہ ہیں۔ اس لئے ہم کو امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ
یہ صاحبان مولانا کے لگائے ہوئے علمی باغ کی خاص کوشش سے آبیاری کرتے رہیں گے
تاکہ مرحوم کی روح اپنے باغ کو پھولا پھلا دیکھکر جنت میں خوش رہے۔

---

# مولانا مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی مرحوم

افسوس کہ ۳۱ جولائی کو لکھنؤ کے مشہور و معروف ادیب اور شاعر نغز گو مولانا محمد ہادی
صاحب عزیز کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرحوم لکھنؤ کے ثقات اہل زبان میں سے تھے اور آپ کی
زباندانی اور قابلیت مسلّمہ تھی۔ اردو کا کیا ذکر عربی، فارسی میں بھی آپ مہارت کامل رکھتے تھے۔
آپ ایک عرصہ دراز تک امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کے ہیڈ مولوی کی خدمات انجام دیتے رہے
اس سے سبکدوش ہونے کے بعد مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد نے ازراہ قدردانی محمود آباد
اورنٹیل لائبریری کا انتظام اور نگرانی آپ کے سپرد کردی۔ آپ ریاست محمود آباد ہی کے زیر
سایہ زندگی بسر کرنے لگے، کمال فن اور علمی فضیلت کے اعتبار سے آپ کا شمار اساتذہ لکھنؤ میں تھا
آپ کا دیوان گلکدہ چھپکر مقبول خاص و عام ہوچکا ہے، آپ کے قصائد کی جو اہل بیت کی شان
میں کہے گئے ہیں خاص طور پر شہرت ہے۔ چنانچہ صحیفۂ ولا کے نام سے ان کا بھی ایک قابل قدر
مجموعہ چھپ چکا ہے۔ آپ نے ایک چھوٹی سی اردو لغت بھی لکھی تھی۔ رسالہ "زمانہ" کے قدیم عنایت
فرما تھے اور آپ کی بہترین نظمیں اسی ناچیز رسالہ میں شائع ہوئی ہیں۔ دو سال ہوئے آپ نے مرزا
غالب کے متعلق ایک مفصل سوانحی و تنقیدی مضمون بھی "زمانہ" کے لئے لکھا تھا۔ اس طرف کچھ عرصہ سے

صحت نے جواب دیدیا تھا اور آپ کی طولانی علالت نے مرض الموت کی صورت اختیار کرلی۔ اور پچاس سال کی عمر میں آپ رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ آپ کی وفات اُردو ادب اور اُردو شاعری دونوں کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ آپ کی ذات والاصفات اُردو ادب کی توسیع و ترقی کے حق میں اس سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوتی، لیکن فکرِ معاش اور ترددات خانگی کی وجہ سے آپ کو کبھی یکسوئی کے ساتھ ملک کی علمی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ محمود آباد لائبریری میں بیٹھکر آپ کو تصنیف و تالیف کا خاطر خواہ موقعہ ملا تھا لیکن علالتِ مزاج کا سلسلہ شروع ہوگیا جس سے آپ بہت کچھ مجبور رہے۔ آپ کی روزمرہ زندگی مشرقی اخلاق و تہذیب کا نمونہ تھی مزاج میں خودداری کو بہت دخل تھا۔ اور عوام سے اپنی روش ہمیشہ بلند رکھنا چاہتے تھے، لیکن دوستوں سے کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ افسوس آپ کی ناوقت موت نے ان تمام امیدوں کا جو آپ کی ذات والاصفات سے وابستہ تھیں خاتمہ کردیا۔

مرحوم کے دیوان گلکدہ سے انتخاب کرکے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے چند شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا خیر گذری کہ تو خدا نہ ہوا

ہر اِک قدم ترے کوچہ میں ایک عالم ہے کہاں تک اب میں چلونگا چلا نہیں جاتا

دل کی چمک میں جب تری صورت نظر پڑی ثابت ہوا کہ حُسن کا پردہ ہی درد تھا

پُردرد کوئی شے مرے سینہ میں کبھی تھی سوچا تو بہت یاد مگر نام نہ آیا

وصال دائمی کیا ہے؟ شبِ فرقت میں مرجانا قضا کیا ہے؟ دلی جذبات کا حد سے گذر جانا

مجھ سے قاتل کی ندامت تو نہ دیکھی جائیگی جی میں آتا ہے بتادوں روزِ محشر کا جواب

اُبھری جاتی ہوئی دنیا، یہ منظر دیکھ لے ایک ہچکی مجھ کو آئی، کھل گئے گیسوئے دوست

وعدہ کیا تھا پھر بھی نہ آئے مزار پر ہم نے تو جان دی تھی اسی اعتبار پر

نگاہِ ناز بتادے تلاش کرکے تو ہی کوئی جگہ دل خانہ خراب کے قابل

لرز رہا ہے کسی مست کا شکستہ دل یہ دستِ ساقیِ پیماں شکن میں جام نہیں

اور دب جائیں خفتگانِ لحد نیچی نظروں سے تم اگر دیکھو

بنے ہیں شرخ ڈورے آنکھ کے تحریرِ میخانہ نشیلی انکھڑیاں ساقی کی ہیں تصویرِ میخانہ

تھی صبح اور ستارے کچھ جھلملا رہے تھے بیمارِ شامِ فرقت دنیا سے جارہے تھے

# تنقیدِ کتب

## مؤرخین ہند[1]

یہ کتاب حیدرآباد دکن کے مشہور مؤرخ و ماہر آثار قدیمہ حکیم سید شمس اللہ قادری کی تصنیف ہے، جسے ایک قسم کی "تاریخ التاریخ" کہنا چاہیئے - اس کے مطالعہ سے سرسری نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے عہد اسلامی میں کون کون سے مستند مورخین تھے۔ کس کس نے کونسی تاریخ کب اور کس طرح لکھی - اِن مورخین کی تاریخوں پر فاضل مؤلف نے مختصر تبصرے بھی کئے ہیں۔ لیکن تبصروں کے لئے صرف ایسی کتابیں منتخب کی گئی ہیں جو طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور ہر جگہ مل جاتی ہیں یا جن کے قلمی نسخے ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس طرح یہ کتاب چوہتر تاریخی و جغرافیائی کتابوں کی ایک مستند فہرست ہے جس میں ہر کتاب کا مختصر خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ اِن چوہتر کتابوں میں نو کتابیں ہندو مصنفین کی بھی ہیں، مثلاً :-

| | |
|---|---|
| ۱ - خلاصۃ التواریخ | منشی سوجان رائے |
| ۲ - چہار گلشن | رائے چترمن |
| ۳ - حقیقت ہائے ہندوستان | لالہ لچھمی نراین شفیق |
| ۴ - مآثر آصفی | " |
| ۵ - لبا لطّ الغنائم | " |
| ۶ - تاریخ شاہ عالم | رائے منا لال |
| ۷ - خلاصۃ التواریخ | مہاراجہ کلیان رائے |
| ۸ - تذکرۃ الامرا | منشی کیول رام |
| ۹ - تاریخ ظفرہ | لالہ گردھاری لال |

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، حجم ۱۳۲ صفحات - سائز ۲۰×۲۶ - قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ :- دفتر تاریخ حیدرآباد دکن۔

اور ایک کتاب " ہمایوں نامہ " شہزادی گلبدن بیگم کی لکھی ہوئی ہے۔
کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ اُن مصنفین کے ناموں کا دیا گیا ہے جن کا ذکر متن میں آیا ہے۔ دوسرے ضمیمہ میں ان کتابوں کے نام ہیں جن کا کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے۔ جن حضرات کو ہندوستان کی تاریخ سے شوق ہے اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ درحقیقت یہ کتاب حوالہ کی کتابوں کے سلسلہ میں لائبریریوں کے قابل ہے۔

## دیوان معروف[1]

یہ نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں والیِ فیروزپور جھرکا و لوہارو کے چھوٹے بھائی نواب خواجہ الٰہی بخش خاں صاحب المتخلص بہ معروف کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جنھیں حضرت شاہ نصیر دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت معروف، مرزا غالب کے خسر تھے اور آپ کا انتقال ۱۲۴۲ھ میں ہوا تھا جسے اب ۱۳۵۴ھ میں ایکسو بارہ سال ہوئے اور چونکہ وفات کے وقت آپ کی عمر اسّی برس کی تھی اس لئے سنِ شعور تک پہونچنے کا زمانہ چھوڑ کر آپ کا کلام تقریباً پونے دوسو برس پُرانا ہے معروف کے زمانہ کی شاعری سنگلاخ زمینوں میں قافیہ پیمائی کی شاعری تھی۔ مثلاً ؎

جائے حیرت ہے جو رہوے دلِ دلگیر کھلا — ہم نے دیکھا نہ کہیں غنچۂ تصویر کھلا
گلشنِ تن میں سپاہی کہ رکھے ہے یکدست — گل ہر زخم کو آبِ دمِ شمشیر کھلا

---

پکڑنے سے ہیں کاکل کو تیرے ہاتھ کیا آیا — مگر یہ زہر کھاتے ہیں سپیرے ہاتھ کیا آیا
گرے انجم پہ کب یہ مرغِ دل بن خالِ مہ رویاں — فلک نے اس قدر ڈالے بکھیڑے ہاتھ کیا آیا

---

مذکور جبکہ تیرے تبسم کا آپڑا — گلشن میں طفلِ غنچۂ گل کھلکھلا پڑا
داغی ہے یہ غلام فلک پر کہاں ہے ماہ — ہالہ نہیں یہ پاؤں میں ہی اک کڑا پڑا

---

تیری آنکھیں دکھتیاں ہیں دیکھ مت جا دھوپ میں — ضد نہ کر صید زبوں ہے تجھکو پھرنا دھوپ میں
اس دوپہری میں کہاں مُرغ اڑانے جائیے ہے — چھوڑتی ہے چیل بھی اسوقت انڈا دھوپ میں

لیکن حضرت معروف کے دیوان میں کہیں کہیں سلاست زبان اور روزمرہ کے محاورے بھی چٹخارے

---

[1] حجم ۲۲۶ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍ ملنے کا پتہ :- نظامی پریس بدایوں۔

دے رہے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

دِل رو کے ہجرِ یار میں پُورے کئے تو کیا     جینے کا لطف وصل میں تھا یوں جئے تو کیا

---

کہاں دل کی صورت، کہاں آئینہ کی     یہ دیکھو اسے اس نے تنہا نہ دیکھا
تجھی میں تو وہ جلوہ فرما ہے، اے دل     جسے تو نے غفلت سے سمجھا نہ دیکھا

---

رُوٹھ کر اس سے سخت پچھتائے     اب منانا نظر نہیں آتا

---

کہاں تک رازِ عشق افشا نہ کرتا     مثل ہے یہ کہ مرتا کیا نہ کرتا

---

نہ کھا نامہ بر اُن کے آنے کی قسمیں     نہ باور کیا ہے، نہ باور کروں گا

---

کر گئی جانِ حزیں تن سے سفر اچھا ہوا     تھی امانت جسکی پہونچی اُس کے گھر اچھا ہوا

---

عشق کی ذات نہیں جس پہ دل آیا، آیا     عیب کی بات نہیں جس پہ دل آیا، آیا

---

ہو گیا حد سے زیادہ دلِ ویراں آباد     بس غم و یاس و الم، خانۂ احساں آباد

---

یوں سوزِ دل سے جا کے لگی اب جگر کو آگ     پاس ایک گھر کے جیسے لگے اور گھر کو آگ

---

سگِ لیلےٰ کے نقشِ پا ہیں ہم     یعنی مجنوں کے رہنما ہیں ہم

---

کس طرح لوگوں میں حالِ زار میں تم سے کہوں     تم اگر تنہا سنو، سو بار میں تم سے کہوں

یہ دیوان عرصہ سے کمیاب تھا، مگر اب اسے مولانا عبدالحامد صاحب قادری بدایونی نے حیدرآباد دکن سے بہم پہونچا کر بعد تصحیح شائع کیا ہے۔ اگرچہ دلدادگانِ تغزل کے لئے اس مجموعہ میں بہت کم

سامان دلچسپی ہے، لیکن جن حضرات کو اُردو زبان کی ریسرچ کا شوق ہے اُن کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

## حامد کے سَوْ شعر[1]

جناب منصور احمد صاحب اڈیٹر رسالہ "ادبی دنیا" لاہور نے مسٹر حامد علی خاں صاحب حامد بی۔ اے جائنٹ ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں" لاہور کے کلام کے سَوْ منتخب اشعار کو دس صفحہ کے فاضلانہ دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حامد صاحب پنجاب کے شاعروں میں ممکن ہے کوئی خاص پوزیشن رکھتے ہوں لیکن ہمارے لئے ان اشعار کے مطالعہ سے آپ کی نسبت کوئی خاص رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ ناظرین کرام مندرجہ ذیل چار شعروں سے خود اندازہ فرما سکتے ہیں :۔

جو مرنا ہی مقدر تھا تو میں پہلے ہی مر لیتا نہ یوں ناحق عذابِ زندگانی اپنے سر لیتا

یہ جینا موت سے بدتر ہے یارب گر خبر ہوتی نہ یوں کاٹی ہوئی گردن کو میں شانوں پہ دھر لیتا

خبر کیا تھی جدائی اس طرح محروم کر دے گی محبت عمر بھر کی ورنہ میں اِک پل میں کر لیتا

یہ کاوش کیا، لیا ہے نام کس کا مرنے والے نے ترا ہی نام حامد نزع میں لیتا اگر لیتا

## باز کے سَوْ شعر[2]

آجکل ملک کے اکثر خوشگوار اُردو شعرا کے کلام سے سَو سَو شعر منتخب کر کے مقدمہ اور تقریظ کے ساتھ شائع کرنے کا جو رواج ہو رہا ہے، وہ اِس حد تک بہت اچھا ہے کہ اس عدیم الفرصتی کے زمانہ میں ہر شخص ایک سرسری نظر میں مختلف شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، لیکن گنتی کے چند اشعار سے کسی کے کلام کی خصوصیات معلوم نہیں ہو سکتیں۔ بایں ہمہ اس ننھے سے خلاصہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ باز صاحب کی زبان میں صفائی و سلاست اور بیان میں روانی و لطافت موجود ہے، اگرچہ اُن کے کلام پر لکھنوی رنگ تغزل بہت زیادہ غالب ہے، چنانچہ دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

یہ جَور نیا دیکھو بت ہوشرُبا کا وہ اس پہ خفا ہے کہ تو بندہ ہے خدا کا

---

دامِ گیسو کے مماثل ہیں مرے پاؤں کے پیچ دُور تک پھیلا ہوا ہے سلسلہ زنجیر کا

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸ اٰنہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ ہمایوں ۳۳ لارنس روڈ۔ لاہور۔
[2] قیمت دو آنہ۔ ملنے کا پتہ کاشانۂ باز، بازار گھانسی، حیدرآباد دکن۔

# سہرا

بتقریب کتخدائی عزیزی مسٹر برج نراین نگم ولد منشی دیانراین نگم صاحب ایڈیٹر "زمانہ"

(از جناب سید مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی)

یہ کس کا گوندھ کے لایا ہے باغباں سہرا
دل و نظر میں لئے ہے جو اک جہاں سہرا

ہے زیبِ بزمِ طرب، رشکِ بوستاں سہرا
چمن چمن ہیں بہاریں، جہاں جہاں سہرا

یہ تو نے خوب بنایا ہے آسماں سہرا
کہ طرّۂ عقدِ ثریّا ہے، کہکشاں سہرا

بنا ہے برج نراین نگم، جو نوشہ آج
کھلا رہا ہے امیدوں کا گلستاں سہرا

مبارک آج ہو بابو دیا نراین کو
یہ اپنے نورِ نظر کا گہر فشاں سہرا

چچا بھی شاد ہیں، ماں شاد، بھائی بہنیں شاد
زمانہ شاد ہے، خود بھی ہے شادماں سہرا

بڑے ادب سے گیا ہے یہ فرقِ نوشہ تک
کہ خاندانِ نگم کا ہے ترجماں سہرا

ہے کانپور سے تا لکھنؤ مہک اس کی
ہے عطر بیز برابر یہاں وہاں سہرا

خوشی سے آج یہ پھولا نہیں سماتا ہے
ہر ایک پھول سے کرتا ہے شوخیاں سہرا

گندھے ہوئے ہیں ستارے شعاعِ زریں میں
فلک سے نذر کو لائی ہے کہکشاں سہرا

ہر اک کلی میں ہے دنیائے رنگ و بو پنہاں
لئے ہے دامنِ عشرت میں گلستاں سہرا

کھلے ہوئے ہیں جو اوراق دفترِ گل کے
سنا رہا ہے محبت کی داستاں سہرا

نسیم لے گئی خوشبو اڑا کے سہرے کی
مہک رہا ہے جہاں میں کہاں کہاں سہرا

بہار، باغِ تمنا میں لے کے آیا ہے
یہ گل طراز و گل افروز و گل فشاں سہرا

ترانہ سنجِ مسرت ہیں زہرہ و ناہید
زمیں سے پہونچا ہے اب تا بہ آسماں سہرا

ہر ایک تار سے پیدا صدائے بہجت ہے
عجیب شان سے ہے آج نغمہ خواں سہرا

نہ کم ہوئی ہے نہ کم ہوگی اس کی ضو پاشی
گہر فشاں ہی رہیگا گہر فشاں سہرا

دعا کے ساتھ لکھو وصل مصرعِ تاریخ
خدا کرے ہو مبارک یہ دلستاں سہرا

۱۹۳۵ء

# عالمِ نسواں

صوبہ متحدہ میں عورتوں کے امداد باہمی کی تحریک کی باقاعدہ ابتدا ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ اور سب سے پہلے اٹکونجہ اور دھارنپور میں بالغ عورتوں کے مدرسے قائم کئے گئے۔ جس کے بعد کئی اور مقامات میں بالغ عورتوں کے لئے اسکول کھولے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ضلع اوری میں "سگھڑ جیون سبھائیں" قائم کی گئیں۔ اس سال مسز کھریگھاٹ کی صدارت میں کوآپریٹیو سوسائیٹیوں کی تمام لیڈی ممبروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو بہت کامیاب ہوئی۔ ایک ٹریننگ اسکول بھی عورتوں کو سپروائزری کی تربیت دینے کے لئے قائم ہے۔ اور ٹریننگ کلاسوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ٹرینڈ سپروائزر خاتونیں اضلاع۔ لکھنؤ۔ مرادآباد، اوئی۔ فیض آباد۔ پرتاپگڈھ اور مین پوری میں تعینات ہو چکی ہیں۔ اور آجکل ضلع گونڈہ اور ریاست بلرامپور میں بھی اس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس طرح ۳۰۔ جون ۱۹۳۴ء تک چھپتر رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ سوسائیٹیاں قائم ہو چکی ہیں اور ممبروں کی تعداد ایک ہزار دوسو ترانوے تک پہونچ گئی ہے۔ ان سوسائیٹیوں کے جلسوں میں کبھی کتھائیں ہوتی ہیں اور کبھی سماجی مسئلوں پر مباحثے ہوتے ہیں اور ممبروں کو کشیدہ کاری، سینا پرونا، سوزن کاری، چکن سازی، بچوں اور اہل خاندان کے متعلق فرائض اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ ایک گشتی لائبریری بھی قائم ہے۔ اور طلسمی لالٹینوں کے ذریعہ سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس وقت عورتوں کو گھریلو حرفتوں کی تعلیم دینے کی تجویز زیر غور ہے

---

انڈین وومنس یونیورسٹی پونہ کے جلسۂ تقسیم اسناد وانعامات میں تقریر کرتے ہوئے سر سی۔ وی۔ رامن نے گریجویٹ خاتونوں کو سمجھایا کہ ہندوستان مغربی ممالک کی طرح اپنی لڑکیوں کو تعلیم دیکر جنسی تنازعات کے بھنور میں پھنسانا نہیں چاہتا۔ بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں میں ایسے جھگڑے ہی پیدا نہ ہوں جن سے ملک کے آباد گھر اجڑ جائیں۔ تعلیم ضروری چیز ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیئے کہ تعلیم یافتہ عورتیں اور مرد اس قدر خود رائے اور سرکش ہو جائیں

کہ ہر شخص اپنا اپنا الگ راستہ اختیار کرلے۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملنا چاہیئے۔ لیکن اس جدوجہد میں باہمی تنازعات کی بدولت ملک بھڑوں کا چھتہ نہ بن جائے۔ غرض ملک کو ایسی تعلیم کی ضرورت ہے، جو پُرانی روایات اور قدیم شائستگی کے خلاف نہ ہو۔ اور زمانہ کی رفتار کا بھی ساتھ دے۔ سر آمن کے یہ قابل قدر الفاظ تعلیم نسواں کے حامیوں کے غور و خوض کے مستحق ہیں۔

---

صوبہ بنگال میں ۱۹۳۳ء کے اختتام پر ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم کے اٹھارہ ہزار پانسو اڑتیس مدرسے تھے۔ جن میں پانچ لاکھ تین سو سات لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ اور مخلوط اسکولوں میں تعلیم پانے والی لڑکیوں کی تعداد ساٹھ ہزار دو سو چھتیس تھی۔ ان میں دو لاکھ چھپن ہزار ستاسی لڑکیاں ہندو اور باقی مسلمان تھیں۔ ہندو لڑکیوں کی تعداد میں ۲۵ فیصدی اور مسلمان لڑکیوں کی تعداد میں ۳۰ فیصدی اضافہ ہوا اور اس وقت تناسب آبادی کے لحاظ سے ہر قوم کی تعداد فیصدی برابر ہے۔ اس تعلیمی ترقی سے پردہ آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا ہے اور بچپن کی شادیوں کا رواج بھی کم ہوتا جاتا ہے۔

---

لکھنؤ میں آئندہ انتخابات لیجسلیٹیو کونسل کے لئے ووٹ دینے کی حقدار عورتوں کی فہرست بنانے کے واسطے عورتوں کا ایک خاص عملہ مقرر کیا گیا ہے جو محلہ محلہ گھوم کر ووٹ دینے والی عورتوں کے نام قلمبند کریں گی۔

---

ٹرکی کی دیکھا دیکھی اب ایران نے بھی عورتوں کو حقوق دینا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب وہاں بھی برقعہ کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ حکومت نے دیہات میں بھی زنانہ اسکول کھول دیے ہیں۔ تعلیم یافتہ شریف زادیوں کو تکمیل تعلیم کے لئے یورپ بھیجا جا رہا ہے۔ ایران کی عورتوں میں ہوا بازی اور شہسواری کا بھی شوق پیدا ہو رہا ہے۔ چنانچہ شاہی خاندان پہلوی کی شاہزادیاں بھی شہسواری کی شائق ہیں۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے، اور متعہ کا طریقہ بھی قانوناً مسدود کیا جا رہا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی سے اس سال (۱) مس منورما مہتہ (۲) مس لیلا فرینک (۳) مس منوہنی مُلاّ (۴) مس لنکا داس (۵) مس سیتا چودھری (۶) مس گوڈوو۔ دی۔ کالے نے ایم۔ اے کا اعلیٰ امتحان پاس کیا ہے۔

---

صوبہ کے تعلیمی ٹریننگ کالج میں تربیت پانے کے لئے اس سال مندرجہ ذیل سات لیڈیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔(۱) مس ٹی۔ چیمبر (۲) مس ای۔ لارنس (۳) مس نازہ انوالہ (۴) مسز سو دکھشنا ورما۔ (۵) مس نرملا مکرجی (۶) مس گوڈ و۔ دی۔ کالے اور (۷) مس منورما مہتہ

---

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے گذشتہ امتحان میٹریکولیشن میں مس طاہرہ بٹ سب سے اول پاس ہوئیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی مس۔ ای۔ بی۔ مکند کو دو سال کے لئے یورپ جاکر مغربی طریقۂ تعلیم سیکھنے کے لئے سرکاری وظیفہ ملا ہے۔

گورو کل کانگڑی ہردوار کی مس چندراوتی لکھن پال کو ان کی ہندی تصنیف "سکھشا منو وگیان" پر بارہ سو روپیہ کا منگل پرشید انعام ملا ہے۔ یہ دوسرا انعام ہے جو مس موصوفہ کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ملا ہے۔

راجکماری کرشن کماری عرف اکّا صاحب بنت ریاست آوندھ فنون لطیفہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اٹلی تشریف لے گئی ہیں۔

مس انسوئیا دیوی کو اندھرا یونیورسٹی کے طلبا کی کانفرنس نے ان کے کمالات موسیقی پر طلائی تمغہ عطا کیا ہے۔

شری متی ان پورنا دیوی اہلیہ محترمہ مسٹر اجودھیا داس بار ایٹ لا میونسپل بورڈ گورکھپور کی ممبر نامزد ہوئی ہیں۔



# علمی خبریں اور نوٹ

زمانہ بابت اپریل ۳۵ء میں منشی پریم چند صاحب کا ایک مضمون "اُردو۔ہندی اور ہندستانی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں صاحب ممدوح نے مشترکہ زبان کے مسئلہ کے متعلق اظہار خیالات کیا تھا۔آپ کی رائے میں حب الوطنی کے خیال سے اُردو میں ضروری ترمیم اور اضافہ کرکے اُسے ہندی سے متصل کر لینا چاہیئے۔اسی طرح ہندی کو بھی اُردو سے ملا دیا جائے۔ تاکہ یہ مشترکہ زبان سارے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے اور ہمارے مصنفین جو کچھ لکھیں وہ کسی مخصوص طبقے کے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے ہو۔"

اِس مضمون نے بہت سے اہل الرائے اصحاب کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہے۔چنانچہ اس کے متعلق "زمانہ" میں کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔جون نمبر میں افسر صاحب میرٹھی نے مشترکہ زبان کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سررشتہ تعلیم کے غور کے لئے ایک نہایت اہم تجویز پیش کی ہے۔اس نمبر میں ہمارے نوجوان دوست مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اس مبحث پر ایک قابل قدر مضمون لکھا ہے،جس میں آپ نے اردو ہندی کے قضیئے کے متعلق نہایت صفائی کے ساتھ اظہار خیالات کیا ہے۔آپ نے حامیان اُردو کے غور کے لئے کئی نہایت اہم تجویزیں پیش کی ہیں۔ہم کو امید ہے کہ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا۔آئندہ نمبر میں ہم اس مسئلہ کے متعلق ایک اور نوجوان ادیب کے خیالات ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ہماری خواہش ہے کہ دیگر اہل الرائے اصحاب بھی اس طرف توجہ فرما کر اپنی رائے سے ناظرینِ زمانہ کو مطلع فرمائیں۔ہم خود بھی اس کے متعلق کسی آئندہ نمبر میں مفصل لکھیں گے۔

---

ہم شکرگذار ہیں کہ ہمعصر نیرنگ خیال لاہور نے جون۔جولائی نمبر میں منشی پریم چند کی تجویز کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے اور بعض ضمنی باتوں سے اختلاف رائے کے باوجود نفس مضمون کی پُرزور تائید کی ہے۔ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال کی رائے میں اُردو والے ہندی کی طرف طبعاً مائل ہیں

اور اُردو انشا پرداز بھی ہمیشہ ہندی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب نے اسی پرچے میں تفصیل کے ساتھ حقیقت حال ظاہر کر دی ہے، اور اس بارے میں ہم کو ان سے اتفاق رائے ہے۔ بہرحال سوچنے کی بات یہ ہے کہ پریم چند صاحب کی تجویز کہاں تک مناسب اور قابل عمل ہے اور کیا ہمارے رہنما مشترکہ زبان کی خاطر کچھ قربانی کرنے کو تیار ہیں یا نہیں؟

---

خوشی کی بات ہے کہ اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال نے اپنی جیب خاص سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کو پانچ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ تاحین حیات عطا فرمایا ہے تاکہ وہ فارغ البال ہو کر ملک اور قوم کی اَدَبی خدمت انجام دے سکیں۔

---

دنیا میں جس قدر زیادہ اشاعت بائبل کی ہوئی ہے اُتنی کسی دوسری کتاب کی نہیں ہوئی۔ چنانچہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے انجیل مقدس کی ۱۹۳۲ء میں سات لاکھ ستانوے ہزار پانسو اُنہتر اور ۱۹۳۳ء میں دس لاکھ ترانوے ہزار تین سو تین جلدیں شائع کیں۔ ۱۹۳۳ء میں بائبل کا گیارہ نئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اب تک دنیا کی چھ سو اٹھتر زبانوں میں بائبل کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

---

کئی سال سے مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی لکھنؤ سے "سچ" نامی ایک اخبار نکالا کرتے تھے جو اُردو میں اپنے رنگ کا ایک خاص پرچہ تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس کی اشاعت بند ہے لیکن آپ نے "صِدق" نام سے پھر اسی طرز کا ایک پرچہ لکھنؤ ہی سے جاری کیا ہے۔ اس کی سالانہ قیمت تین روپیہ ہے۔ شائقین منیجر "صدق" لکھنؤ کے پتے سے طلب فرمائیں۔

---

شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور اُردو مصنفوں کے پُرانے قدردان ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر اقبال کا اُردو کلام، مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمۂ قرآن اور شرر مرحوم کی تمام تصانیف کو نہایت اہتمام کے ساتھ از سر نو چھاپا ہے۔ اب آپ نے حضرت حفیظ جالندھری کا مشہور و معروف شاہنامۂ اسلام اور اُن کی دیگر تصانیف بھی خرید لی ہیں۔

---

ہمارے معزز دوست حضرت جوش ملیح آبادی "کاخ بلند" کے نام سے ایک معیاری مصوّر رسالہ جاری

کرنا چاہتے ہیں جس کا حجم ۱۰۸ صفحات ماہوار ہوگا اور چندہ دس روپیہ سالانہ۔ جوش صاحب جو نہ صرف اُردو کے شاعرِ اعظم بلکہ ایک بہترین ادیب اور اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز بھی ہیں۔ اپنے مجوزہ پرچہ کے لئے ایک ہزار ایسے خریدار چاہتے ہیں جو اپنا سالانہ چندہ پیشگی ادا کردیں تاکہ ابتدائی مالی مصارف سے مستغنی ہوکر وہ ملک کی ادبی خدمت کر سکیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ قدر دانانِ اُردو جوش صاحب کی پورے طور پر حوصلہ افزائی کریں گے۔

---

آجکل مولوی سید حسن صاحب برنی، بی۔اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ بلند شہر امیر خسرو کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں، جس کے بعض اجزا معصر الناظر لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں۔

---

مولانا عبدالقوی صاحب فانی۔ ایم۔اے لکھنؤ یونیورسٹی "ہندوستانی ڈرامہ کی تاریخ" پر ایک ضخیم کتاب تصنیف فرمارہے ہیں جو عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔

---

رسالہ "رہبر نسواں" دہلی میں ہمارے دوست صابری صاحب نے جو پندرہ سولہ برس کی عمر سے مولانا حسرت موہانی صاحب کے پاس رہے ہیں، بیگم حسرت کی زندگی کے دلچسپ و سبق آموز حالات لکھے ہیں جس طریقے سے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں اُس سے یہ سوانحعمری اُردو میں ایک نئی چیز ہے اور اس سے موجودہ زمانہ کی اکثر قومی تحریکوں کے اصلی حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

---

پچھلے سال مشہور بدھ بھکشو راہولا سنکرتن سات ماہ تک ملک تبت کی خانقاہوں اور عبادتگاہوں کی سیر کرتے رہے ہیں۔ آپ کو وہاں سنسکرت کے بعض بہت قدیم نسخوں کی سیر کرنے کا موقعہ ملا جو کسی زمانہ میں ہندوستان سے تبت بھیجے گئے تھے لیکن اب عرصہ سے یہاں ناپید ہو گئے ہیں۔ ان پراچین کتابوں میں سے آپ چند کی نقلیں اور فوٹو لائے ہیں۔ ان میں سے ایک "دھرم کیرتی" ہے جس کا مصنف ساتویں صدی عیسوی میں نالندہ یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر تھا۔ دوسری کتاب "تتو سنگرہ" ہے جسکا مصنف بھی نالندہ کا ایک مشہور عالم اور پنڈت "سنت رکشن" نامی تھا۔ تیسری کتاب دھرم کیرتی کے مصنف کی تصنیف ہے جس پر نالندہ یونیورسٹی کے ایک اور سنت پروفیسر پرچھن گپت نے شرح لکھی ہے۔ ان کے علاوہ سنسکرت شاعری کے بعض دیگر نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

"دنیائے راز" جو ہمارے دوست حضرت راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی نظموں کا ایک دلکش مجموعہ اور موجودہ زمانہ کی ترقی یافتہ شاعری کا قابل قدر نمونہ ہے) کی قیمت پہلے ایک روپیہ تھی مگر اب صرف دس آنہ فی جلد کر دی گئی ہے۔ جن حضرات نے اب تک اس کو ملاحظہ نہیں کیا ہے وہ اس رعایت سے فائدہ اُٹھائیں اور "زمانہ بک ایجنسی کانپور" سے طلب فرمالیں۔

---

ہمعصر "ریاست دہلی" نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اخبار نویسی کی تربیت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کچھ آدمی ایسے مل سکتے ہیں جو کالجوں میں پڑھنے کے بعد بیکار پھر رہے ہیں۔ ان کے اندر جرنلسٹ بننے کی اہلیت ہے اور ان کو مضامین لکھنے کا بھی شوق ہے۔ اگر وہ چند ماہ کسی اخبار میں کام کریں اور شوق کے ساتھ کام سیکھیں تو اچھے اور کامیاب جرنلسٹ بن سکتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں میں سے چار لڑکوں کو دفتر ریاست کام سکھانے کو تیار ہے۔ اور دس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ دفتر "زمانہ" میں بھی اس قسم کے دو تین تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورت ہے جو اپنی زندگی اُردو ادب کی توسیع و ترقی کے لئے وقف کرنے کو مستعد ہوں اور ادنیٰ التعصبات سے بالاتر ہو کر دو سال تک صرف معمولی الاؤنس پر محنت و جانفشانی کے ساتھ کام سیکھنے کو تیار ہوں حال میں ایک نوجوان نے ہمارے یہاں کام کرنا شروع کیا ہے، لیکن ابھی ہم کو دو تین اور اصحاب کی ضرورت ہے۔ جو خلوص اور ایثار کے ساتھ ملک کی ادبی خدمت کا حوصلہ رکھتے ہوں اور محنت شاقہ کر کے اس کی اہلیت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ درخواستیں ایڈیٹر "زمانہ" کانپور کے پتے سے آئیں۔

---

جس عالمانہ مضمون سے "زمانہ" جولائی نمبر کا افتتاح ہوا ہے وہ یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ متحدہ کے گیارھویں اجلاس منعقدہ مظفر نگر میں ۲۱۔ نومبر ۱۹۳۴ء کو انگریزی میں پڑھا گیا تھا۔ مضمون ہمارے صوبہ کے فاضل سویلین مسٹر این۔سی۔ مہتا کا ایک شاندار علمی کارنامہ ہے۔ اسکے ترجمے کے لئے ہم مولوی سبطین احمد صاحب بی۔اے۔ بی۔ٹی کے رہین منت ہیں۔ مضمون کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری صاحب کی اجازت و عنایت سے ہدیۂ ناظرین ہو رہا ہے۔ جس کے لئے ہم ان کے تہ دل سے شکر گذار ہیں۔

# فہرست مضامین زمانہ جلد ۶۴ جنوری لغایت جون ۱۹۳۵ء

**تصاویر:۔** تاج محل کا تخیل (رنگین) ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور۔ بھارتیندو ہریشچندر۔ فردوسی۔ سیماب اکبرآبادی ہندو فن رقص کے نمونے۔ مرزا عزیز بیگ مرزا سہارنپوری مرحوم۔ اعلیحضرت ملک معظم جارج پنجم۔

## حصۂ نثر

## حصۂ نظم

# اودھ کا سفیدہ و دسہری آم

ہمارے فارم سے جو سنہ ۱۹۲۶ء سے قائم ہے بہترین آم اور آم کے قلم اور لکھنؤ کے مشہور خربوزے کے بیج و ہر قسم کی سبزی و ترکاری کے تخم روانہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زردہ۔ قوام۔ گولی۔ تمباکو خوردنی لکھنؤ کی مشہور چکنی ڈلی و چکن کی ٹوپی کسیلے و فردیں ولحاف و رضائی چھپے ہوئے اور ہر قسم کی کھانے پینے کی تمباکو وغیرہ نہایت ارزاں فروخت ہوتی ہیں۔ تاجروں سے خاص رعایت۔

فہرست کارخانہ طلب کرنے پر مفت روانہ کی جاتی ہے

فرمائش کے ساتھ نصف قیمت پیشگی آنا چاہیئے ورنہ تعمیل سے معذوری ہے۔ ہر خط میں اپنا نام اور القاب و پتہ ڈاکخانہ و اسٹیشن صاف صاف تحریر کرنا چاہیئے۔

المشتہر منیجر ہندوستانی کمپنی۔ ملیح آباد۔ لکھنؤ

---

# روس کے ڈاکٹر ورناف ہندوستان میں

روس کے مشہور ڈاکٹر ورناف جو بندر کے غدود لگا کر از سر نو جوانی کا جوش پیدا کر دیتے ہیں ہندوستان میں آکر کسی جگہ آپریشن کر کے غدود چڑھایا اس طرح کرنے میں ہزاروں روپیہ کا صرفہ ہوا۔ بندر کا غدود چڑھانے سے خیالات میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اس طرح کی کئی باتیں اخبارات میں پڑھی گئیں اس لئے آپ بلا وجہ اس قدر صرفہ کا بار برداشت کر کے اپنے خیالات پراگندہ نہ بنائیں۔

آپ کو صرف مقویات سراج عالم آتنک نگرہ گولیوں کا استعمال کریں۔ یہ گولیاں تھوڑے ہی عرصہ میں آپکے سرد خون میں تازگی پیدا کر دینگی منی سے جسم کی رگ رگ کو پُر کر دینگی اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں جوش جوانی پیدا ہو جائیگا۔ آپکے خیالات پاکیزہ دماغ مضبوط قوت حافظہ تیز چہرہ پُر نور جسم مضبوط ہو کر لطف زندگی سے بہرہ اندوز ہو جاوینگے قیمت بھی معمولی جسکو دیکھکر شاید آپ ہنس پڑیں فی ڈبیہ ۳۲ عدد گولیاں صرف ایک روپیہ پانچ ڈبیاں صرف چار روپیہ للعہ،

اگر کوئی پوشیدہ شکایت ہو تو ایک شیشی اطلاوہ اچھی کرن استعمال کیجئے قیمت فی شیشی پانچ روپیہ صہ،

دیگر موثر زندگی معلوم کرنے کے لئے ایک عدد کتاب کام شاستر بالکل مفت منگوالیں۔

ویدشاستری منی شنکر گوندجی جام نگر۔ کاٹھیاواڑ

ایجنٹ: مسرس عبدالکریم اینڈ سنس۔ مسٹن روڈ۔ کانپور

# زمانہ بک ایجنسی کی قابل خرید بیمثل کتابیں

**مکمل عورت** دو لڑکیوں کے تعلیمی و سوشل حالات کا مقابلہ ایک کو یوروپین اسکول اور دوسری کو کنیا ودیالہ میں داخل کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالے کی لڑکی تعلیمی و سوشل حالات میں بہتر ہے قیمت ۸/

**شریمد بھاگوت گیتا** یعنی کرم یوگ شاستر المعروف غذائے روح باتصویر۔ مترجمہ جناب پنڈت پربھو دیال مصر عاشق لکھنوی۔ قیمت عہ/

**اردو مضمون نویسی** مضمون لکھنے کے متعلق بابو نانک پرشاد بی۔ اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ قیمت ۸/

**مثنوی سحر** یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ از سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ دوسرا ایڈیشن جسکی مصنف نے نظرثانی کی ہے قیمت ۸/

**مرقع ادب** حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں حصہ اول قیمت ۱۲/ حصہ دوم ۱۰/

**سیر گل** مختصر افسانوں کا مجموعہ وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی آج روسی کہانیوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت ہے لیکن انکے اولین پیش کرنیوالے کی تحریر کا اعجاز دیکھنا ہو تو سیر گل دیکھئے قیمت ۱۲/

**انتخاب حسرت** مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا انتخاب اور اس پر جلیل کے قلم کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ قیمت عہ/

**ترجمہ رامائن منظوم** بالکانڈ اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ دو اشعار میں مترجمہ مرحوم برج نرائن شاد لکھنوی قیمت ۱۲/

**خیالات عزیز** مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جسکی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے حجم دو سو صفحات ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف قیمت ۱۲/

**ہندو تیوہاروں کی اصلیت** اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے اسکے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور مذہبی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اردو مجلد ۹ ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دیگئی ہے قیمت ۱۲/

**نقش و نگار** جلیل قدوائی صاحب کی دل آویز و پر لطف نظموں و غزلوں کا مجموعہ جلیل صاحب کی نظم میں بھی وہی شان ہے جو آپکی پاکیزہ و پر سحر نثر میں ہے قیمت عہ/

**نصائح جہانگیریہ** یعنی ناموران ہند جہانگیریہ کے مشہور و معروف ہیں پنتی کا اردو ترجمہ از پنڈت سمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام قیمت ۶/

**حیات بیوہ** جسمیں مصنف نے بیوگان ہند کی حالت کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور انکی حال کاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۵/

**لسان الغیب** جلد اول و دوم حضرت حافظ شیرازی کے دیوان کے بےمثل شرح ہے جس نہایت صاف و سلیس زبان میں میر علی اللہ نے مرتب کیا ہے حافظ کے کلام کے شائقین کے واسطے عجیب تحفہ ہے حصہ اول ۱۲/ دوم ۱۲/

**طریق دولتمندی** دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں قیمت ۸/

**پریم بتیسی** یعنی اردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند صاحب بی۔ اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے۔ قیمت حصہ دوم ۱۲

**رامائن مسدس** (مصنفہ جناب منشی راجی لال صاحب کپور سیفی) اس رامائن کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رام چندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے مصنف کی جدت طراز دماغ رسا نے نازک و نادر استعارات اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں جو روحانی و وجدانی لطافت سے مملو ہیں۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں لے رہا ہے رامائن کے اندر نو تصویریں رنگین نہایت نفیس ہیں صفحات ۲۸۰ مجلد نفیس قیمت مجلد با تصویر ... بلا تصویر ... بلا جلد و تصویر ...

**بیوہ** (مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی تازہ تصنیف) اس کتاب میں بیوہ کے دردناک حالات لکھے گئے ہیں اور انکی ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کیلئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ ر

**گھر گرہستی** (مصنفہ مولوی سید بشیر حسن صاحب امروہوی مولوی فاضل) اس کتاب کے اندر قصہ اور مکالمہ کے پیرایہ میں عورتوں کو اچھی بیبیاں۔ اچھی مائیں اور رفیقۂ حیات بننے کی تعلیم دی گئی ہے ہر عمر کی عورتوں کو دلچسپ قصوں اور دلنشین مثالوں کے ذریعہ سے جملہ امور خانہ داری اخلاق و معاشرت سکھائے گئے ہیں یہ بے نظیر کتاب اس قابل ہے کہ لڑکیوں کو جہیز میں دیجائے کوئی شریف بی بی اور کوئی شریف گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہئے ہر ہائینس نواب بیگم صاحبہ رامپور کی سرپرستی میں یہ کتاب تیار کی گئی ہے قیمت ۱۲ر

# مجبور وفا

والدین اور اغیار کے ہاتھوں کیلاش اور کامنی کے سچے جذبات دلی کا کچلا جاکر ایک دردناک صورت اختیار کرنے اور آخر میں ایک کی جان پر بنجانے کا یہ الم انگیز واقعہ پنڈت کشن پرشاد کول ممبر انجمن خدام ہند لکھنؤ نے ایک دلدوز پیرایہ میں اس طرح لکھا ہے کہ انسان پڑھتے پڑھتے بیقرار ہو جاتا ہے چونکہ یہ ناول محض سوسائٹی کی اصلاح کیلئے لکھا گیا ہے اسلئے باوجود ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات کی ضخامت ہونیکے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ رکھی گئی ہے آپکا کتبخانہ اسکی ایک جلد سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔

**تاریخ ہند (عہد اسلامی)** غلام محمد ایم اے نے ہندوستان کے عہد اسلامی کی یہ مختصر تاریخ طلباء اسکول و کالج کی نفع رسانی کیلئے انگریزی زبان میں تحریر فرمائی ہے ضخامت زائد از دو سو صفحات قیمت ایک روپیہ عہ

**قربانی** یہ بھی پنڈت کشن پرشاد کول کا ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جس میں سوسائٹی کی اصلاح خصوصاً شادی بیوگان پر زور دیا ہے قیمت ۸ر

**بہار سخن** بابو شیام سندر لال صاحب برق ایڈیٹر سیتا پور کا لاجواب اور تاریخی تذکرہ جس میں نہایت تلاش و تجسس سے پانسو چھیاسٹھ ۵۶۶ ہندو شعراء ماضی و حال کے سوانح حیات و منتخب کلام درج ہے ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے جس سے فہرست دیکھتے ہی فوراً شاعر کا حال معلوم ہو جاتا ہے پرائیویٹ کتبخانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کی چیز ہے قیمت دو روپیہ عار

**دنیائے راز** ابو الفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت عہ

**اختر ستان** مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پر تاثیر و نشتر ہے قیمت عہ

**سب کتابیں ملنے کا پتہ منیجر زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور**

# ڈابر رڈاکٹر ایس کے برمن) لیمیٹڈ

صیغہ نمبر ۱۱۸ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

پچاس برس سے مشہور و لاثانی دیسی پیٹنٹ دواؤں کا ہندوستانی وسیع کارخانہ




کوئی گھر ایسا نہیں جو

Regd:

## جوڑی تاپ

(تپ و لرزہ اور طحال کی دوا)

سے واقف نہ ہو



دوا کھانے سے پہلے



دوا کھانے کے بعد

ملیریا اور باری کے بخار کے لئے یہ اکسیر ہے۔ تین چار خوراک پیتے ہی ملیریا کے کیڑے مرکر بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے اس کے استعمال سے خون گاڑھا اور اجابت خلاصہ ہوتی ہے ملیریا کے لئے اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری دوا مفید نہیں ہے نقلی دوا سے ہوشیار۔ قیمت بڑی شیشی پندرہ آنہ ڈاک محصول دس آنہ ۱۰ ر چھوٹی شیشی نو آنہ ۹ ر ڈاک محصول سات آنہ ۷

Regd

## ڈابر بھاسکر لون چورن

(ہاضم اور بھوک بڑھانیوالا)

یہ باترکیب تیار ہوا ہے۔ اس کے استعمال سے بادگولہ بدہضمی اور بھوک کی کمی وغیرہ عوارض جاتے رہتے ہیں۔ روزانہ استعمال سے کسی مرض میں مبتلا ہونے کا احتمال نہیں رہتا۔ یہ کھانے میں خوش ذائقہ ہے

قیمت نو آنہ ڈاک محصول دس آنہ ۱۰ ر

نوٹ ہر جگہ ہمارے ایجنٹوں کے ہاں اور دواخانوں میں ملتی ہے۔ دوا خریدتے وقت اسٹار ٹریڈ مارک اور ڈابر نام ضرور دیکھ لیا کریں۔

(۱) کانپور ۳۹ نیا گنج کے ایجنٹ محمد حفیظ محمد نصیر
(۲) کانپور نیا گنج کے ایجنٹ رام غلام شیو غلام
(۳) کانپور کلکٹر گنج کے ایجنٹ مسرس چھوٹے لعل اینڈ سنس

# کسان

## (اُس کے افلاس کے وجوہ اور اُنکا علاج)

(مصنفہٗ)

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی

مترجمہٗ جناب محمود علی خانصاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا، اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اس کو خوشحالی سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت اتنی حد تک ہے کہ اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کا اصلی سبب کیا ہے اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہے؟

اِن سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے۔ کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے، کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہے لہذا جو لوگ موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں اُنہیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ یقین ہے کہ اس موضوع پر اُردو میں اس سے بہتر کتاب ابتک پیش نہیں کی گئی ہے۔ کتابت طباعت۔ کاغذ اعلیٰ۔ ضروری ہے کہ ملک کا ہر بہی خواہ اِسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن دوبارہ پھر جائیں۔

کتاب پریس میں جا چکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگی۔ فوراً فرمایش بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ ؏

قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو محصولڈاک معاف

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہٗ جامعہ دہلی**

پرنٹر: پنڈت سری شمبھو پرشاد [illegible] کانپور
پبلشر: منشی دیا نرائن نگم بی۔ اے

 رجسٹرڈ نمبر ۱۲۱۱

# زمانہ

مرتبہ: دیانراین نگم، بی۔ اے۔

جلد ۶۵ | اگست ۱۹۳۵ء | نمبر ۲

## فہرست مضامین

تصویر:۔ شہنشاہ، ملک حبش



زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۴ر

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۵ہ ششماہی ۵ر ہندوستان سے ششماہی تین روپیہ

# اِمداد باہمی کی تین شاندار و کامیاب سکیمیں

**اوّل ۱ - شادی فنڈ** اپنے چھوٹے بچوں کو ممبر کرا کر آپ ۵۰۰ روپے تک امداد مالی بوقت شادی ہونے کا ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ چندہ ماہواری صرف ایک روپیہ ہے۔ فیس داخلہ معمولی ہے۔

**دوم ۲ - گولڈن ایڈ سکیم** اس اسکیم میں ممبر ہو کر آپ پانچ ہزار روپیہ تک انعام حاصل کرینگے ۱۲ چالیس اور دو سو روپیہ تک قرضہ بلا سود حاصل کرنیکا ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں صرف ۱۲ روپیہ آپ کو ادا کرنے ہوں گے۔

**سوئم ۳ - موت فنڈ** اس اسکیم میں ممبر ہو کر آپ اپنے پسماندگان کیلئے ۵۰۰ روپیہ تک مالی امداد کا ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری کمپنی نے تھوڑے ہی عرصہ میں پندرہ ہزار روپے کے قریب اپنے ممبران کو تقسیم کیا ہے صرف چند کلیمز کے نتائج تحریر ہیں ان سے آپکو پتہ چلیگا کہ کس قدر شاندار اور مفید تجاویز ہیں۔

| نام و پورا پتہ متوفی ممبران جن کے ورثاء کو روپیہ دیا گیا | سرٹیفکیٹ نمبر | متوفی ممبر نے کل کتنا روپیہ دیا (روپیہ، آنہ) | تعداد روپیہ جو کمپنی نے متوفی کے وارثوں کو دیا (روپیہ، آنہ، پائی) | کمپنی نے متوفی کے روپیہ سے کتنا گنا زیادہ دیا |
|---|---|---|---|---|
| شاہ مال دیوی صاحبہ بنت خواجہ عمر و صاحب ٹھکانہ دار حکیار (کشمیر) | ۲۴۸ | ۵ — ۸ | ۱۹۲ — ۱۲ — ۱۰ | ۳۰ گنا |
| حکیم نصیر الدین صاحب بنت چودہری رسول خاں صاحب مختار عدالت کلکٹری اٹاوہ | ۴۷ | ۷ — ۸ | ۲۸۰ — ۱۳ — ۰ | ۳۷½ ″ |
| انور خانصاحب ولد شہامیر خانصاحب بدہو خاں کا مینارہ سرکل ۱۲ ناگپور | ۲۷۱ | ۷ — ۸ | ۴۵۲ — ۰ — ۰ | ۶۰½ ″ |
| محمد بابا صاحب بنت محمد علی صاحب بلیک اسمتھ گنٹور (مدراس) | ۴۱۸ | ۸ — ۸ | ۵۰۰ — ۰ — ۰ | ۵۹ ″ |
| سکینہ بی بی صاحبہ بنت سپاہی عبدالرحیم صاحب بخشی محلہ ایلور (مدراس) | ۵۶۰ | ۹ — ۸ | ۱۸۵ — ۱۱ — ۳ | ۱۹¼ ″ |
| علی بخش صاحب بنت عبدالحمید صاحب ملازم لوکوشاپ اجمیر | ۱۶۱۲ | ۱۶ — ۰ | ۶۳ — ۱۲ — ۰ | ۴ ″ |

**نوٹ:** - اس طرح آپ کی کمپنی نے قریباً پندرہ ہزار روپیہ کم از کم ½ ۱ گنا اور زیادہ سے زیادہ ۶۰ گنا تک تقسیم کیا ہے خیال کیجئے کہ اس سے بہتر اور کیا مفید تجویز ہو سکتی ہے۔ مفصل حالات معلوم کرنیکے لئے ایک کارڈ تحریر کر کے فارم داخلہ و قواعد جس قدر درکار ہوں مفت منگوالیں۔

## ضرورت ہے! ضرورت ہے!! ضرورت ہے!!!

کمپنی کو ہر قصبہ، شہر، ضلع میں بارسوخ محنتی دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے کمیشن معقول دیا جاتا ہے ہمارے ایجنٹ پچاس سو روپے ماہوار معمولی محنت سے کما سکتے ہیں مسٹر محمد مستان آف گنٹور (مدراس) نے ایکسال میں تین ہزار روپے سے زائد ہم سے کمیشن لیا ہے جلد درخواست کریں اپنے اور کاموں کے ساتھ اس کام کو کر کے اپنی آمدنی کو بڑھا سکتے ہیں ایجنسی فارم حاصل کرنیکے لئے درخواست کے ہمراہ ۲ آنے کے ٹکٹ ارسال کریں بغیر ٹکٹ موصول ہوئے ایجنسی فارم نہیں بھیجا جائیگا

**سید عباس علی شاہ "احسان" مینجنگ ڈائریکٹر**

**دی نیو امداد پراویڈنٹ انشورنس کمپنی لیمیٹڈ۔ بستی کوٹھی ۱۹ لودیانہ (ای پی انڈیا)**

**لوکل ایجنٹ:- دی ریلائینس ایڈورٹائزنگ بیورو۔ طلاق محل تاپنور**

# زمانہ

جلد ۶۵ اگست ۱۹۳۵ء نمبر ۲


# ہندی ناٹک


(از مسٹر جگدیشو رناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے ایل ایل بی)


ناٹک ادب کا اہم ترین جزو ہے۔ قدیم ہندی نقادوں کے نزدیک ناٹک (गद्य काव्य) یا نثر شاعری کے ذیل میں آتا ہے، اس کا آغاز رقص سے مانا جاتا ہے۔ جب دنیا جہل و بربریت کی معصوم تاریکی میں منہ لپیٹے پڑی تھی، اور انسان وحوش وطیور کی سی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس وقت موسمی تبدیلیاں اور دیگر فطری انقلابات اُسے ہر لحظہ لرزہ براندام کئے رہتے تھے، اور وہ اُن کے مُضر اثرات سے محفوظ و مصئون رہنے کیلئے طرح طرح کے جشن کرکے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششوں میں منہمک رہا کرتا تھا۔ شدید بارش، طوفان بادوباراں اور جاڑے کی شدت سے خوفزدہ ہوکر لوگ اپنے اپنے دیوتاؤں کی تعریف و توصیف کے راگ گایا کرتے تھے تاکہ دیوتا خوش ہوکر انھیں آفات ارضی وسماوی سے بچاتے رہیں۔ اس طرح ناٹک کے گانوں اور (गीति काव्य) (گیت کاویہ) کا ظہور ہوا۔ جو آگے چلکر ناٹک کا سنگ بنیاد بن گئے۔

جب لوگوں کی یہ کوششیں نظامِ قدرت کو بدل دینے میں ناکام رہیں، تو رفتہ رفتہ انھیں یقین ہوگیا کہ ان کے دیوتاؤں کے علاوہ کوئی اور بڑی طاقت بھی ہے جو ان تمام انقلابات کی ذمہ دار ہے چنانچہ انھوں نے اپنے گیتوں اور ناچوں کا رخ بدل دیا اور اب ناچنے گانے کا مقصد قومی فلاح و بہبود قرار پایا۔ قدیم اقوام عالم میں اس قسم کے جلسوں کا رواج عام تھا جب آفتاب برج میزان میں آتا تھا تو

الیوسس واقع یونان میں بڑا جشن مناکر زراعت کی دیوی ڈمیٹیری کی پرستش کیجاتی تھی، اور اس موقع پر طرح طرح کے کھیل بھی ہوا کرتے تھے، جنمیں سے بعض ابتدائی مذہبی ناٹکوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ان کھیلوں میں بالعموم دیوی کی ایک پجارن اسٹیج پر نمودار ہوکر ناچتی گاتی اور دعائیں پڑھا کرتی تھی۔ آریوں کی ان پورنا (अन्नपूर्णा) دیوی کو یونانی زبان میں ڈمیٹیری کہا جاتا ہے۔

چین کے معبدوں میں بھی فصل تیار ہو جانے پر دیوتاؤں کی پوجا کیجاتی تھی جس دیوتا کے مندر میں پوجا ہوتی تھی اُسی کے سوانح حیات سے متعلق روایات کو ناٹک کی صورت میں منظر عام پر لایا جاتا تھا مختلف مقامات پر مختلف دیوتاؤں کی پرستش کیجاتی تھی جنمیں سے بعض دیوتا تو فرضی اور کچھ قدیم بزرگ ہوا کرتے تھے، جن کے شاندار کارناموں کے باعث اُنھیں اوتار یا مافوق الفطرت انسان تسلیم کرلیا گیا تھا۔ برہما اور جاپان میں بھی ایسے مظاہرے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان میں مدتہائے دراز سے فصل کٹنے سے بیشتر ہولی کا تیوہار منایا جاتا ہے۔ جبکہ طرح طرح کے ناچ ورنگ کی محفلیں گرم ہوا کرتی ہیں، بعض جگہ سوانگ بھرنے اور ناٹک کھیلنے کا بھی رواج ہے۔

دنیا میں دیوتاؤں کی پرستش کی طرح ویر پوجا "ہیرو ورشپ" کا رواج بھی قدیم سے عام ہے۔ کہیں لوگ اپنے محترم بزرگوں کا بت بنا کر اُن کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کہیں قدیم مصر اور پیرو کی طرح اُن کی نعش کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں بھی ہندوستان تمام اقوام عالم سے پیش پیش ہے۔ یہاں "ویر پوجا" کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے، وہ ہر سال کرشن اور رام لیلاؤں کی صورت میں رونما ہوا کرتا ہے جن کا ناٹک سے گہرا تعلق ہے۔

جاوا اور جاپان میں فتوحات کے موقعوں پر لوگ پھیرے لگا لگا کر ناچا کرتے تھے۔ آگے چلکر ان ناچوں میں مکالموں کا بھی استعمال ہونے لگا جس سے ناچ میں ناٹک کا رنگ آگیا۔ ایسے ناٹک جاپانی زبان میں "نو" مشہور ہیں۔ پیرو، بولیویا اور برازیل وغیرہ مقامات میں بھی ایسے ناچوں کا رواج باقی ہے۔ ایلاسکا کے جنگلی اسکیمو اور بلجین کانگو وغیرہ کے غیر مہذب و نیم وحشی باشندے بھی اسی قسم کے ناچوں کے شایق ہیں۔ کمبودیا میں حکومت کی جانب سے ایک شاہی منڈوا تعمیر ہوا ہے جسکا نام "رنگ رم" ہے۔ جو وہاں کی مروجہ زبان میں "ناچ گھر" کا مرادف ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی ناٹک کی ابتدا ناچ ہی سے ہوئی تھی یا بالفاظ دیگر ناٹک ابتدائی ناچوں ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

کمبودیا میں رامائن کے ناٹک بہت کھیلے جاتے ہیں، یہ لوگ رامائن کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ یہاں

Peru in America of Hero Worship

عام ناٹکوں میں تو ناچنے گانے وغیرہ کا کل کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ لیکن راماین کے کھیلوں میں خواتین کی شمولیت سخت ممنوع ہے۔

اس بات کا مزید ثبوت کہ ناٹکوں کی ابتدا رقص یا نرتیہ سے ہوئی ہے یہ ہے کہ علمائے سنسکرت نے رقص کی دو قسمیں قرار دی ہیں:-

(۱) ناٹیہ (नाट्य) اور

(۲) اناٹیہ (अनाट्य)

کسی کے افعال کی نقل کرنا ناٹیہ کہلاتا ہے اور صرف رس یا کیفیات کا مظاہرہ کرنا یا بھاؤ (انداز) بتانا اناٹیہ کے تحت میں آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندی فنِ رقص اس درجہ مکمل بلند اور جامع ہے کہ اس کے گوناگوں کمالات کا ادراک عوام تو عوام خاص اہل کمال کے لئے بھی آسان نہیں ہے۔ شاید کتھا کلی ہی ہندوستان کا قدیم ترین ناچ ہے۔ ادا و انداز گی گوش ناآشنا زبان سے آنکھوں کو دل کی کہانی سُنانا ہی اس ناچ کا صحیح مقصد ہے۔ کتھا کلی میں رقص کنندہ اس انداز سے مصروفِ عمل ہوتا ہے کہ اس کی ہر ادا زبانِ حال سے ساری کہانی ناظرین کے پیش نظر کردیتی ہے۔ خود اداکار کو زبان تک ہلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی اس قسم کے ناچ کے ذریعہ سے پوری مہابھارت یا رامائن کی تمثیل پیش کردیجاتی تھی۔

فنِ رقص کی یہ صنف اس پایۂ کمال کو پہونچ گئی تھی کہ اس کے ذریعہ قدرت کی تمام سوئی ہوئی قوتوں کو سکوت وجمود سے بیدار کرکے حسب منشا متحرک کیا جاسکتا تھا۔ سحر طرازی اور جذبات نگاری درکنار ماہر رقص کے لئے راگ راگنیوں کو خلا میں متشکل کرکے عالمِ ارواح تک پیام رسانی کرنا اور روحوں کے خاموش پیغام کی ترجمانی کرنا بھی چنداں دشوار نہ تھا۔

اگر کتھا کلی ناچ کے جملہ مدارج پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فنِ رقص کی اس صنف کے معرض وجود میں آنے کی علت غائی بھی وہی ہے جو ناٹک کے عرصۂ ظہور میں آنے کی ہے۔ اور کتھا کلی ناچ بلا شبہ ہر حیثیت سے ناٹک کے مفہوم کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے چھایا ناٹک کا نقش اولین کہہ سکتے ہیں اور جیسا کہ آگے آئیگا ناٹکوں کے آغاز سے پہلے چھایا ناٹک ہی عام رواج میں آئے۔ واضح رہے کہ رقص انسان کے ناآشنائے زبان جذبات کے اظہار کی کاوش پیہم کا نتیجہ ہے اس لئے زبان کے اختراع و ترویج سے قبل اس فن کا مکمل ہوجانا لازمی بات ہے۔ اور جب یہ امر یقینی ہے کہ ویدوں کا نزول تہذیب و توسیع زبان کے بعد ہوا تو کتھا کلی ناچ کے ویدوں سے پہلے رائج ہونے

سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ وید انسان کے لئے آئے نہ کہ انسان ویدوں کے لئے، تو ظاہر ہے کہ ویدوں کے نازل ہونے سے قبل انسانی زبان کی تکمیل ہو چکی ہوگی۔ اور اس تکمیل سے پہلے بھی ہماری دنیا اسی طرح انسانوں سے آباد ہوگی جیسی کہ آج ہے۔ اور اس زمانہ کے انسان بھی کسی نہ کسی طرح اپنے جذبات و خیالات کو دوسروں پر ضرور ظاہر کر سکتے ہونگے۔ پس کتھا کلی ناچ اور گونگے سوانگوں کا جس میں محض بامعانی حرکات و سکنات کے ایک طویل سلسلہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اُسی عہد نامعلوم میں عالمِ وجود میں آنا اصول فطرت کے مطابق قرار پاتا ہے۔ اس لحاظ سے ناٹک کی ابتدائی صورت کا ویدوں سے بھی بہت پہلے نقش پذیر ہونا ثابت ہے۔

غالباً ویدوں کے بعد ہی لوگوں نے کتھا کلی نرتیہ اور مروجہ چھایا ناٹکوں کو باقاعدہ ناٹک کی صورت میں تبدیل کرنے کے لئے ان میں ضروری ترمیم و تنسیخ شروع کر دی ہوگی۔ کتھا کلی جن اُصولوں پر کاربند ہے اُس کا مشرح بیان بھرت ناٹیہ شاستر میں موجود ہے۔ جو اس حقیقت کا مظہر ہے کہ بھرت کے عہد میں ناچ کی یہ صنفِ لطیف معراجِ کمال کو پہونچ چکی تھی، اور یہ یقیناً کسی فرد یا جماعت کی نہیں بلکہ نہ جانے کتنی نسلوں کی سعی مسلسل کا نتیجہ ہوگا۔

سنسکرت ناٹکوں کی ابتدا ہمیشہ سوتردھارا اور استھاپک سے ہوتی ہے جو ہندی بھاشا کے نٹ نٹی کی طرح تمہید کے طور پر ناٹک کے موضوع، کہانی اور کرداروں وغیرہ سے ہمارا تعارف کراتے ہیں۔ معنی کے اعتبار سے سوتردھار و استھاپک کی خاص اہمیت ہے۔ سنسکرت میں (سوتر + دھار ڈورا + پکڑنے والا) ڈورا پکڑنے والے کو سوتردھار اور ترتیب دینے والے کو استھاپک کہتے ہیں۔ دراصل ہر دو افراد ناٹکوں میں کٹھ پتلی کے تماشہ سے مستعار لئے گئے ہیں۔ سوتردھار کا کام ڈورے کے ذریعہ سے انھیں نچانا اور متحرک رکھنا تھا۔ استھاپک پتلیوں کو کہانی کی ضرورت کے مطابق قرینہ سے سجا کر رکھا کرتا تھا۔ ناٹک میں اصولاً ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ان کی موجودگی سے ناٹک کی تاریخ بہت کچھ روشنی میں آجاتی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ناٹک کٹھ پتلی کے ناچ اور چھایا ناٹکوں کے بعد ارتقائے فن کا دوسرا قدم ہے۔

دنیا میں ہندوستانی ناٹکوں کے اولین ناٹک ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود ڈاکٹر پشل معترف ہیں کہ "ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ میں کٹھ پتلیوں وغیرہ کا جو ناچ ہوا کرتا تھا وہ اہل ہند ہی کی دیکھا دیکھی وجود میں آیا تھا۔" بالکل اسی طرح اہل یورپ پر ہمارے ناٹکوں کا بھی اثر پڑا ہے۔ شیکسپیئر کے سارے ڈراموں میں سنسکرت ناٹکوں کے معینہ اصولوں کی سختی سے پابندی

کی گئی ہے اور ان میں جن زنانے کرداروں کی تخلیق ہوئی ہے وہ سب کے سب خالص ہندی نژاد معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اہل الرائے کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ڈرامے حقیقتاً ہندوستان ہی کی پیداوار ہیں۔

ڈاکٹر پشل کی رائے ہے کہ جرمن اور انگریزی ناٹکوں میں جو کلاؤن[1] یا مسخرے پائے جاتے ہیں وہ اہل ہند کے وِدوشکوں (विदूषक) ہی کی نقل ہیں۔ ہندی ناٹکوں کے آغاز کے زمانہ کا صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں صرف اس قدر معلوم ہے کہ ہمارے ناٹکوں کی ادبی حیثیت کا آغاز بھرت منی کے عہد سے ہوا ہے۔ لیکن حال کی تحقیقات سے ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ روشنی میں آگیا ہے، جس سے متذکرہ نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رامائن کے عہد میں رامچندر کے سپہ سالار ہنومان نے فتح لنکا کے بعد مغربی گھاٹ کی چٹانوں پر تمام واقعات کو ناٹک کی صورت میں لکھکر ثبت کر دیا تھا، جسے انھوں نے سنسکرت کے امام الشعراء اور رامائن کے مشہور مصنف والمیک کو بھی دکھایا تھا۔ ادبی حیثیت سے یہ ناٹک اتنا بلند پایہ تھا کہ والمیک جیسے شاعر کو اس کے سامنے اپنی راماین جیسی تصنیف بلیغ پر پانی پھر جانے کا شبہ ہوا جس پر انھوں نے والمیک کی دلشکنی کے خیال سے اپنے ناٹک کو دریا بُرد کر دیا۔ اس ناٹک کے بعض شکستہ جز ملاحوں کو مغربی گھاٹ کے قریب سمندر کے کنارے پر پڑے ہوئے مل گئے تھے، جو اب میسور کے عجائب گھر کی زینت ہیں۔

لیکن اگر ہندی ناٹکوں کی ابتدا بھرت ناٹیہ شاستر کی تکمیل کے بعد ہی مانی جائے تو بھی ہندوستانی ناٹکوں کی قدامت پر کوئی خلاف اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ جس عہد میں بھرت ناٹیہ شاستر تصنیف ہوا تھا اُس وقت تک ایسی کتنی ہی دوسری تصانیف مکمل ہو چکی تھیں جن کا حوالہ خود ناٹیہ شاستر میں موجود ہے۔ علاوہ بریں جن مقامات اور اقوام کا شاستر مذکور میں تذکرہ ہے وہ اس قدر پرانی ہیں کہ ان میں سے کچھ تو گوتم بدھ کے زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ اور برہمنوں (ब्राह्मण ग्रंथ) نیز دیگر کلپ سوتروں تک میں ان کا بیان موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناٹیہ شاستر اس عہد عتیق کی یادگار ہے جس سے پہلے ہندی ناٹکوں کا عرصۂ وجود میں آجانا لابدی ہے۔ ورنہ ناٹکوں سے پہلے ان کی تنقید و تقریظ کا مکمل ہو جانا، رام سے پہلے رامائن کی باتیں کرنا ہے۔ آج تک دُنیا کی کسی شئے کے اصول و قواعد اس کے وجود سے پہلے مرتب نہیں ہوئے۔ پھر ناٹک کا اعلیٰ معیار اور ناٹک نویس کے اصولوں کا ناٹکوں سے پہلے قائم ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

---

[1] Clown ملاحظہ ہو تقریظ ناٹک ساگر مصنفہ کیفی دہلوی۔

تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہند قدیم میں یونانی وضع قطع کے منڈوے بھی تعمیر کئے گئے تھے اور ایسا ہونا اس سے قبل ناممکن ہے جب تک لوگ پرانی طرز تعمیر سے اکتا نہ گئے ہوں۔ اور یہ واقعہ اس امر کی دلالت ہے کہ ایک وقت میں ناٹکوں کا شوق اہل ہند میں بکثرت موجود تھا۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ کم از کم ہزار بارہ سو برس ق۔م ہندوستان میں ناٹکوں کی خاصی دھوم تھی، اور آٹھ نو سو سال قبل مسیح تک یہ فن انتہائے کمال کو پہونچ گیا تھا۔

ہندی ناٹک پر یونانی اثر

سنسکرت ناٹکوں میں پردہ کے لئے یونیکا (यवनिका) یونی (यवनी) اور شکار (शकार) وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔ بعض معترضین اس دلیل کی بنا پر حجت کرتے ہیں کہ اہل ہند نے یہ فن یونانیوں سے سیکھا تھا۔ لیکن یہ عذر بوجوہ ذیل قابل سماعت نہیں ہے:۔

یونانی ڈرامہ کی تاریخ شاہد ہے کہ خود اہل یونان نے مصریوں سے یہ فن لطیف سیکھا تھا۔ اور تقریباً ۵۳۵ ق۔م میں تھیس پس نامی شاعر نے یونانی زبان میں سب سے پہلا ناٹک تصنیف کیا تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ہندوستان میں یہ فن مدنیت وارتقا کے انتہائی مدارج طے کرچکا تھا۔

سنسکرت ناٹک اور یونانی ڈرامہ کے بنیادی اصولوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر ناٹکوں کا خوش انجام ہونا شرط ہے۔ بخلاف اس کے یونانی ناٹک (غم انجام) یا ٹریجک بھی ہو سکتے ہیں۔

اہل ہند کے نزدیک مناظر کی نمائش کے لئے پردوں کا استعمال ضروری نہیں تھا۔ پورا ناٹک مسلسل ہوتا تھا، اور بلا توقف اختتام تک چلا جاتا تھا۔ سین وغیرہ بدلے نہیں جاتے تھے بلکہ مصنف اپنے کرداروں کی زبان سے مقام ومناظر کا اعلان کرا دیا کرتا تھا۔ آجکل کے سوانگ قدیم ہندی ناٹکوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ اہل یونان کے یہاں مناظر کی تقسیم مقدم سمجھی جاتی ہے۔ لیکن قدماء ہند کے نزدیک ناٹک کے لئے مناظر کی نمائش بالکل غیرضروری اور اجنبی چیز تھی۔ چنانچہ آجتک کتھا کلی ناچوں میں جو ہندی ڈرامہ کا سرچشمہ ہیں پردوں کا استعمال ممنوع ہے۔ تاکہ مناظر کی کشش اداکار کی مساعی جمیلہ اور رقص کی فنی باریکیوں کو ناظرین کی عدم التفاتی کی نذر کرکے مدعائے عمل کو فوت نہ کردے۔ ورنہ ان اساتذہ کامل سے جنھوں نے مہابھارت ہی کے زمانہ میں منظرنگاری میں یدطولیٰ حاصل کرلیا تھا یہ کچھ بعید نہ تھا کہ مناظر کی تقسیم کرکے پردوں کا استعمال شروع کردیتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یونانیوں کے ورود کے بعد عمال حکومت کی خوشنودی کے لئے یا ہر دو اقوام کے اختلاط سے عوام کے رجحانات میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہو اس کے باعث اہل یونان کی تقلید میں "پردہ" کا رواج ہوگیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈرامہ نگاری کو سہل تر بنانے کے لئے مناظر کی تقسیم کی جانے لگی ہو اور انکے لئے پردوں کا ہونا ناگزیر تھا۔

پردہ کا استعمال بجائے خود سنسکرت ناٹکوں کے زوال پذیر ہونے کا ثبوت ہے۔ اور چونکہ مصوری ایک ایسی صنعت ہے جس کا ناٹک سے بالواسطہ کوئی علاقہ نہیں، اس لئے ممکن ہے کہ قدامت پسند حضرات نے اظہار تنفر کے لئے پردہ کو یونیکا کہنا شروع کر دیا ہو، جیسا کہ وہ ہمیشہ سے اجنبی اقوام کو یَوَن (यवन) کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اس واقعہ سے اِن قیاسات کی تائید ہو جاتی ہے کہ ایک وقت میں ناٹکوں کا دیکھنا معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔ اور ناٹک دیکھنے والوں کو مطعون کیا جاتا تھا۔ یہ ناٹکوں کے عامۃ الناس کی پست مذاقی کا شکار ہو جانے کا ثبوت ہے جس کی بہت بڑی ذمہ داری پردوں کے استعمال پر ہے۔ "پردہ" نے ناٹک نویسی جیسے دشوار مشغلہ کو بائیں ہاتھ کا کھیل بنا دیا تھا۔ اور ہر اہل و نااہل اس میدان میں طبع آزمائی کر کے دامنِ ادب کو رطب و یابس سے بھرنے لگا تھا۔

یہ دعویٰ اس وجہ سے بھی قابلِ اعتنا نہیں ہے کہ یونانی زبان کبھی سرزمینِ ہند میں رائج نہیں ہوئی، جیسا کہ اس عہد کے سکوں سے ظاہر ہے۔ کشن راجاؤں کے دربار میں ضرور کچھ عرصہ کے لئے ٹوٹی پھوٹی یونانی بولی جاتی رہی ہے جس سے ہندوستانی ہمیشہ ملیکش بھاشا سمجھکر اپنا دامن بچاتے رہے۔ اِن حالات میں یہ کب ممکن ہے کہ ہندیوں نے ناٹک جیسا فنِ لطیف یونانیوں سے سیکھا ہو۔ اور وہ بھی اُس وقت جبکہ یونانی ناٹک کی پرورش بھی مذہب کی گود میں ہوئی ہو۔ اور ہندوستانی ذہنیت دوسروں کے مذہب کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہو۔

سنسکرت علم و ادب کے اعتبار سے ناٹک روپک کی ایک قسم ہے۔ اس کے علاوہ یہ نَو قسمیں اور ہیں:- (۱) پرکرن (प्रकरण) (۲) بھانڑ (भाण) ویایوگ (व्यायोग) (۴) سموکار (समवकार) (۵) ڈِم (डिम) (۶) ایہامرگ (इहामृग) (۷) انک (अङ्क) (۸) ویتھی (वीथी) اور (۹) پرہسن (प्रहसन)۔

سنسکرت ناٹکوں کی اُپج دنیا بھر کے ناٹکوں کے خلاف نثر اور گیت کا دیہ کی رہین ہے۔ اور ادبی حیثیت سے نثر کو اولیت حاصل ہے، یہ بھی اس کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت ہے۔ اس قسم کے ناٹک آج بھی بنگال کی یاتراؤں، برج کی راس لیلاؤں، نقالی اور سوانگوں کے رنگ میں موجود ہیں۔

کچھ ضروری باتیں

ناٹیہ شاستر کی ناٹیہ شاستر[ط] کے دوسرے باب میں مرقوم ہے کہ رنگ شالائیں (منڈوے) تین طرح کی ہوتی تھیں (۱) وکرشٹ (विकृष्ट) (۲) چترشر (चतुरस्र) اور (۳) (त्र्यस्र)

ط नाट्य शास्त्र

رنگ شالا کو پریکش گرہ ( प्रेक्षागृह ) بھی کہتے ہیں۔ پہلے قسم کے منڈوے بہترین ہونے کے باعث دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھے اور دوسری قسم کے منڈوے اوسط درجہ کے مانے جاتے تھے اس لئے راجگان ورؤسا کے لئے وقف تھے۔ تیسری قسم کی رنگ شالا جو مثلث نما ہوتی تھی عام لوگوں کے لئے بنائی جاتی تھی۔

بعض منڈوے دو منزلے بھی ہوتے تھے۔ سبھی رنگ شالاؤں کا کچھ حصہ اداکاروں کے لئے بنایا جاتا تھا جس کے پچھلے حصہ کو رنگ شیرش ( रंग शीर्ष ) یا گرین روم کہتے تھے۔ یہاں اداکار حسب ضرورت تبدیل ہیئت کرتا تھا۔

ناٹک کا آغاز پوروَرنگ ( पुर्वरंग ) سے ہوتا ہے، پہلے ساز بجایا جاتا ہے، پھر گانیوالوں کو ایک ساتھ کھڑا کرکے گانا شروع کیا جاتا ہے۔ یہ تمام کارروائی پس پردہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو آدمیوں کے ساتھ سوتردھار ہار پھول لیکر داخل ہوتا ہے، اور برہما وغیرہ دیوتاؤں کی پوجا کرتا ہے پھر نانندی[1] آتا ہے اور پرروچن کے بعد استھاپک آکر ناٹک کے موضوع وغیرہ سے حاضرین کو متعارف کرتا ہے اور دھیان سے دیکھنے کی درخواست کرکے ناٹک شروع کراتا ہے۔

ناٹیہ شاستر میں یہ بھی مذکور ہے کہ اداکاروں میں کن کن صفات کا ہونا ضروری ہے، اور ان کا لباس کس کس طرح کا ہونا چاہیئے۔ اور بھی کتنے ہی ایسے نکات ہیں جن کا سمجھنا بھی اب دشوار ہو گیا ہے۔ ناٹک کے موضوع کے متعلق بتایا گیا ہے کہ کتھانک कथानक یا پلاٹ کا تعلق پُران یا تاریخ کے کسی واقعہ سے ہونا چاہیئے۔ شاعر کی طبع زاد کہانی ناٹک نہیں کہی جا سکتی۔ اس کا نایک یا ہیرو ہمیشہ کوئی دیوتا، اوتار، راجہ یا اونچی ذات کے افراد میں سے ہونا چاہیئے۔ اور اس میں شرنگار یا ویر رس کی افراط ہونا چاہیئے۔ در اصل ناٹک کی تقریب کی طرح یہ تمام قیود بھی لایعنی ہیں۔

چار انک یا ڈراپ کا ناٹک ناٹیکا ( नाटिका ) پانچ سے نو تک کا ناٹک اور دس ابواب کی تصنیف مہاناٹک کہلاتی ہے۔ دس سے زیادہ انک ناٹک میں نہیں ہو سکتے۔

**سنسکرت ناٹکوں کی اجمالی تاریخ**

کچھ عرصہ پہلے کالیداس سنسکرت کے اولین ناٹک نویس گنے جاتے تھے۔ لیکن تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ان سے چار پانچسو برس پہلے بھی سنسکرت میں اچھے اچھے ناٹک لکھے جا چکے تھے۔ کالیداس کے مال وکاگنی متر ناٹک میں اُن کے پیشرو بھاس اور سوہی پتر وغیرہ کئی مشہور مصنفین کا ذکر آتا ہے۔ اور اب تو بھاس کے تصنیف شدہ ناٹک شائع ہو کر دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

[1] नान्दी

وسط ایشیا میں بودھوں کے عہد کے تصنیف شدہ کتنے ہی ناٹکوں کے نامکمل نسخے دستیاب ہوئے ہیں جنھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے بھی برابر ناٹک لکھے جاتے رہے ہونگے۔ لیکن یہ زمانۂ قبل از تاریخ کی باتیں ہیں جو ہنوز پردۂ خفا میں مستور ہیں۔ بھاس کے متعلق علماء کا خیال ہے کہ وہ مہابھارت کے بعد ہوئے ہیں۔ کالیداس کا پہلا ناٹک مال وکاگنی متر ہے، جس کا ہیرو خود اگنی متر ہے۔ اگنی متر کا عہد کم از کم ۱۰۰ ق م مانا جاتا ہے۔ کالیداس کی دوسری تصنیف لطیف شکنتلا ہے جو دنیا کے بہترین ناٹکوں میں شمار ہوتی ہے۔ تیسرا زبردست ناٹک جو اُن کے نور قلم کا نتیجہ ہے وکرم اُروسی ہے۔

بڑے بڑے مصنفین آج تک وکرم اُروسی کی تقلید میں ناٹک لکھتے چلے آتے ہیں۔ ہرش نے ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں رتناولی اور ناگ نند وغیرہ ناٹک تصنیف کئے تھے۔ شودرک (शूद्रक) کا مرچھکٹک (मृच्छकटिक) ناٹک بھی ایک نفیس چیز ہے جسے بھاس کے دردر چار دوت (दारद्र चारुदत्त) سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔

ساتویں صدی کے آخر میں بھوبھوتی نے قنوج کے راجہ یشو ورمن کے ایما سے مہاویر چرت اُتر رام چرت، اور مالتی مادھو وغیرہ مشہور ناٹک لکھے۔ نویں صدی عیسوی کے وسط میں بھٹ نارائن کا بینی سنگھار (बरगीसहार) اور وشاکھ دت کا مُدرا راکشش بہت مشہور ہوا۔ اس کے بعد راج شیکھر نے کرپور منجری (कपुर मंजरी) بال رامائن اور بال بھارت وغیرہ ناٹک لکھکر خراج تحسین وصول کیا۔ ۱۰۰۰ء میں دھننجے (धनंजय) نے دش روپک نامی کتاب لکھی جسے دوسرا ناٹیہ شاستر سمجھا جاتا ہے۔ ۱۱۰۰ء میں کرشن مشر نے پربودھ چندر اودے ناٹک لکھا۔ افسوس بوالہوسوں نے ان تمام نفاست کو تباہ کر کے اب اسکرین اور اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے۔

گیارھویں صدی کے اختتام پر ناٹکوں کا زوال شروع ہوا اور ناٹکوں کی یاوہ گوئی نے اصحاب فن و ذوق کو اپنا قلم طاق نسیاں پر رکھ دینے کے لئے مجبور کر دیا۔ اس کے بعد باکمال حضرات نے شاید کبھی بھولے سے بھی ناٹک لکھنے کا نام نہیں لیا۔



# ہمرازوں سے التجا

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

اب زمزمۂ قصۂ پارینہ ہے بیکار ڈرتا ہوں نہ ہو جائے تمنا کہیں بیدار
بے صرفہ ہے اب تذکرۂ کاکل و رخسار کروٹ نہ کہیں، روح میں لے حسرت دیدار
پھر دل میں مچلنے نہ لگے عشق کا آزار!

اللہ رے شیریں کے لب لعل دل آویز ہر پھول ہے اس باغ کا اک دشنۂ سرتیز
یہ قصۂ رنگیں ہے قیامت کا غم انگیز چھیڑے نہ کوئی تذکرۂ خسرو پرویز
اس ذکر میں ہے تیشۂ فرہاد کی جھنکار!

افسانۂ دلدوز جوانی نہ سناؤ کس درجہ تھی وہ رات سہانی، نہ سناؤ
جوئے چمنستاں کی روانی نہ سناؤ شاخوں کے لچکنے کی کہانی نہ سناؤ
ان سوچ کی باتوں میں ہے چلتی ہوئی تلوار!

## جہانداریاں کر جہانبانیاں کر

وہ آئی گھٹا۔ رنگ ساما نیاں کر گہرپاشیاں کر، زرافشانیاں کر
وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
علم کھول کر مستیوں کی فضا میں جہانداریاں کر، جہانبانیاں کر
نگاہوں سے برسا دے ابر جوانی مَے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
مٹا داغ ہوش اور مدہوش ہو جا اُٹھا جام زر اور سلطانیاں کر
جنوں پاؤں چومے وہ ہنگامہ فرما خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر
یہ مانا کہ تا حشر سونا ہے تجھکو مگر آج تو حشر ساما نیاں کر
سمندر پہ چل اور الیاس بن جا ہواؤں پہ اڑ اور سلیمانیاں کر
کبھی مسکرا کر سکوں آفریں بن کبھی لڑکھڑا کر خوش الحانیاں کر
کبھی جوشؔ کے جوش کی مدح فرما کبھی دلبروں کی ثنا خوانیاں کر

# ضمیر کی مرثیہ گوئی

(از جناب سید محمد محسن رضوی ایم۔ اے۔ لکھنوی)

میر ضمیر سے پہلے مرثیہ گوئی کی جو حالت تھی اُس پر "بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو" کی کہاوت صادق آتی ہے۔ اُس وقت کے مرثیوں کی معنوی حیثیت پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا مقصد ایک بڑی حد تک ثواب آخری حاصل کرنا تھا گو سودا نے اس خیال کو بدل دیا تھا اور اس صنف شاعری کو بحیثیت فن اپنے ہاتھ میں لیکر داد سخن دی تھی۔ پھر بھی مرثیہ اتنی ترقی حاصل نہ کر سکا کہ اہل اسلام کے علاوہ اُردو سے ذوق رکھنے والے دوسرے طبقوں کی نظر میں بھی قابل التفات بن جائے۔ سودا چونکہ ایک زبردست شاعر تھے لہذا اُنھوں نے اپنے مرثیوں میں تنوع پیدا کرکے مرثیہ کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا۔ اُن کے مرثیوں میں وہ خامیاں بھی نہیں پائی جاتیں جو اُن کے پیشرووں کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً مشدد لفظ کو مخفف یا مخفف کو مشدد نظم کرنا۔ حرف ربط کے چھوٹ جانے کا خیال نہ کرنا اور الفاظ کو حرفوں کی کمی یا زیادتی کے ساتھ اس غرض سے نظم کرنا کہ وزن شعر پورا ہو جائے۔ ایک اور بات جو ان کے مرثیوں کو ماقبل کے مرثیوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا سلیقہ ہے جو انھیں فطری شاعر ہونے کی وجہ سے قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا اور جو ان کے کلام میں بہت نمایاں ہے۔

میر ضمیر سے پیشتر جتنے مرثیے عالم وجود میں آئے وہ زیادہ تر غزل بلکہ سلام۔ مربع۔ ترکیب بند ترجیع بند کی صورت میں لکھے گئے۔ مسدس کی صورت میں لکھے جانے کی ابتدا سودا ہی کے زمانہ میں ہوئی، مگر اُس وقت تک یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ سب سے پہلے اس شکل میں مرثیہ لکھنے کا فخر کسے حاصل ہے۔ بعض تذکرہ نویس سکندر پنجابی ہمعصر سودا کو اس مرثیہ کی بنا پر جس کا مطلع ہے

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول    اِک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول

اس کا موجد بتلاتے ہیں، اور بعض سودا کے سر اس ایجاد کا سہرا باندھتے ہیں۔ قوت شاعری۔ قوت ایجاد واختراع اور طبیعت کی جدت پسندی پر نظر رکھتے ہوئے سودا کے ہمعصروں میں کوئی اُن کا ہمسر نہ تھا

اسلئے بہت ممکن ہے کہ سوداہی نے مسدس کی شکل میں لکھنے کی ابتدا کی ہو اور سکندر نے اتباع کیا ہو بہرحال ضمیر کے ہاتھ میں یہ مسدس کی شکل میں پہونچا اور سودا کی کوششوں سے ایک وسیع دامن اختیار کئے ہوئے جس میں سیرت نگاری، جذبات دلی، مکالمہ۔ رخصت۔ آمد۔ جنگ۔ تلوار کی تعریف وغیرہ کے جراثیم ابتدائی حالت میں موجود تھے۔ اب ضمیر کا کام انھیں باتوں کو نمایاں کرنا اور سلیقہ سے نباہنا تھا۔

درحقیقت مواد کے لحاظ سے سودا مرثیوں میں بہت سی باتیں جمع کر گئے جن کے اجمال و اختصار کی تفصیل و تشریح ارتقائی حالت میں ضمیر کے مرثیے ہیں۔ اس لحاظ سے ضمیر کے ذکر میں سودا کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ اور یہ کہنا بیجا نہیں معلوم ہوتا کہ سودا مرثیہ کو ایک تبدیلی کے لئے آمادہ کر گئے تھے جو ضمیر کے ہاتھوں واقع ہوئی۔

ضمیر کو مسدس کی شکل ایسی بھائی کہ اُس میں کثرت سے مرثیے لکھے کہ پھر تو یہی عام روش قرار پا گئی۔ ان کی پیدا کردہ جدتیں جنھوں نے ان کے نام کے حق میں آبحیات کا کام کیا ہے یہ ہیں کہ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی قرار دیے، یعنی:۔

(۱) چہرہ ۔ جسے تمہید بھی کہتے ہیں۔

(۲) سراپا ۔ یعنی اُس ذات پاک کی طرف لطیف گریز سے اشارہ کرنا جس کے متعلق مرثیہ لکھنا مدنظر ہوتا ہے اور اُس کے خدوخال وابرو وغیرہ کی تعریف۔

(۳) رخصت ۔ کبھی رخصت پہلے ہوتی ہے اور کبھی سراپا، اگر سراپا رخصت کے بعد نظم ہوتا ہے تو جو اشعار تعریف میں کہے جاتے ہیں وہ عموماً فوج مخالف کے کسی شہسوار کی زبانی ادا کئے جاتے ہیں

(۴) آمد

(۵) رجز

(۶) جنگ

اس کے بعد مرثیہ کے ہیرو کا قتل ہونا، پھر نعش مبارک کا خیام حرم میں پہونچنا، اہل بیت کے ماتم اور اس کے خاتمہ پر مرثیہ کا اختتام ہوتا ہے۔ جنگ کے ضمن میں فرس اور اسلحہ جنگ کی بھی تعریفیں ہوتی ہیں اور یہی تمام باتیں آجکل مرثیوں کے لئے بہت ضروری سمجھی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئیے کہ کوئی مرثیہ ان اجزا سے خالی نہیں ہوتا مقصد صرف اس قدر ہے کہ عموماً مرثیوں میں یہ عناصر پائے جاتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ان کی مثالیں بھی پیش کر دی جائیں تاکہ بیان اور واضح ہو جائے۔

ضمیر کو حضرت علی اکبر کے حال میں مرثیہ لکھنا مقصود ہے لیکن بجائے اس کے کہ ممدوح کا نام لیکر یا

اور کسی واقعہ کے بیان سے مرثیہ کا آغاز کریں وہ اس طرح شروع کرتے ہیں کہ بظاہر اس بیان کو اصل حال سے زیادہ متعلق معلوم نہیں ہوتا، اسی طرز کے آغاز کو ہم چہرہ کہتے ہیں۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے　　جس نور سے پُر نور یہ نورِ نظری ہے
آمد ہی میں حیران قیاسِ بشری ہے　　یہ کونسی تصویر تجلّی سے بھری ہے
گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے
منبر مرا ہم مرتبۂ طور ہوا ہے

پھر متعدد اشعار کے بعد وہ سراپا نظم کرتے ہیں جس کے چند بند یہ ہیں:-

قرآن کی تشبیہ یہ اس دل نے بنائی　　پیشانیِ انور ہے کہ ہے لوحِ طلائی
ابرو سے ہے بسم اللہ قرآں نظر آئی　　جدول کشش زلف کے تارون نے دکھائی
وہ زلف وہ بینی میں الف لام رقم ہے
پھر میم دہن مل کے یہ اک شکلِ الم ہے

مانندِ دعائے سحری قدِ رسا ہے　　ماتھا ہے کہ دیباچۂ انوارِ خدا ہے
دو زلف نے اک چاند سا منھ گھیر لیا ہے　　وصلِ شبِ قدر و شبِ معراج ہوا ہے
دو زلفیں ہیں رخسار دل افروز بھی دو ہیں
یاں شام بھی دو ہیں بخدا روز بھی دو ہیں

غرضکہ اس طرح اعضائے جسم کی تعریف میں لفظی تصویر پیش نظر کر دیتے ہیں اور یہی بیان سراپا کہلاتا ہے۔ اگرچہ ان اشعار کو مرثیت سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس بیان کو حدود مرثیہ میں رکھنے کے لئے مرثیہ گو اس تصویر کے بعض حصہ کو ماتمی لباس میں ظاہر کرتا ہے چنانچہ اس سراپا میں ایک بند یہ بھی ہے ؎

برگشتہ مژہ اس کی یہ کرتی ہے اشارے　　برگشتگیِ عمر کے سامان ہیں سارے
مژگاں کے یہ نیزے جو خمیدہ ہوئے یارے　　دھڑکا ہے کہ نیزہ کوئی اکبر کو نہ مارے
یک چشم زدن میں جو فلک اس سے پھرے گا
اس چشم کے مانند یہ نیزوں سے گھرے گا

یا یہ شعر بھی اسی کی مثال ہے ؎

کیا قدر کوئی پائے مبارک کی سناوے　　یہ رکن ہیں کعبہ کے اگر فہم خدا دے

انصاف کرو تم کو خدا اس کی جزا دے اِس رُکن کو یوں امتِ بیدین گرا دے

یہی درد انگیز کنائے اور اشارے ہیں جو اس بیان کو حدود مرثیہ سے باہر نہیں ہونے دیتے، بلکہ اس کی غرض وغایت سے پیوستہ رکھتے ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ دونوں کے کلام میں اس کی نظیریں ملتی ہیں، لیکن بعد کے مرثیہ گویوں نے اس صفت کو بھلا دیا، وہ اس میدان میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے۔ اور بیان طولانی ہو کر مرثیہ کے رنگ سے دُور، غزل سے زیادہ مشابہ، ایک جداگانہ مضمون کی صورت میں نظر آتا ہے۔

سراپا کے بعد رخصت کا حال یوں بیان کرتے ہیں:۔

کیوں مومنو! تصویر پیمبر نظر آئی لیکن تمھیں کس وقت میں صورت یہ دکھائی
جب باپ میں اور بیٹے میں ہوتی ہے جدائی بس خوش ہیں کہ ہم نے بھی رضا جنگ کی پائی
خود قیدِ مصیبت سے تو آزاد ہوئے ہیں
ماں باپ یہاں مفت میں برباد ہوئے ہیں

رخصت کے بعد میدان جنگ میں آمد کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

ہے یاں کا یہ سامان، سنو دشت کا ساماں یاں جاتے ہیں خوش خوش علی اکبر سوئے میداں
سب عرش الٰہی کی سی شوکت ہے وہی شاں آتا ہے بڑی دھوم سے جیسے کوئی سلطاں
کہتا ہے نقیب اہلِ دل انصاف کی جا ہے
دیکھو کہ جواں مرنے کو کیا شیر چلا ہے

اس سے آگے چلکر کہتے ہیں:۔

نے لاکھ میں یہ رعب کی آمد ہے نہ سَو میں

مذکورہ بالا بند میں گو آمد کا حال نظم کرنا تھا لیکن بیان کو حزنیہ رکھنے کے لئے بیت میں غم والم کا شائبہ پیدا کر دیا ہے۔ ضمیر اس خیال سے کبھی غافل نہیں رہتے، بلکہ جا بجا اس قسم کے اشاروں اور کنایوں سے پڑھنے والوں کے دل متاثر کرتے جاتے ہیں تاکہ مرثیہ کی غرض وغایت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اب رجز کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

تشویش میں تھی فوج کہ اس میں علی اکبر کرنے لگے میدان میں رجز خوانیاں بڑھ کر
ہوں یوسفِ گل پیرہنِ سبطِ پیمبر جو یائے خزاں چمنِ حسرت ہیں ما
ننھیال سے ودھیال سے یہ حسب نسب ہے اک شاہ عجم ایک شہنشاہ عرب ہے

انھیں رجز خوانیوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت علی اکبر داد شجاعت دینے کے بعد قتل ہوتے ہیں اور امام حسین اُن کی نعش مبارک خیمہ میں اُٹھا لے جاتے ہیں جہاں انھیں دیکھکر اہل حرم میں شور قیامت برپا ہوتا ہے اور اسی فریاد و بکا پر مرثیہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

یہ ہیں میر ضمیر کی پیدا کی ہوئی جدّتیں جن سے لطف اندوز ہونے کے لئے پورے مرثیہ کا پڑھنا ضروری ہے تاکہ شاعر کی قوت کا بہتر اندازہ کرنے کا موقع دستیاب ہو۔ مرثیہ گو کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک بیان کو دوسرے بیان سے علٰحدہ نہ ہونے دے بلکہ اسلوب ایسا ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ ایک بیان سے دوسرا بیان پیدا ہوتا گیا ہے۔ مثال کے لئے میر انیس کے کلام سے دو بند لکھے جاتے ہیں۔ امام حسین رخصت آخری کے لئے حرم میں تشریف لائے ہیں اور ایک ایک کو تلقین صبر فرماتے جاتے ہیں جب جناب سکینہ کے پاس پہونچے تو فرماتے ہیں:۔

جانا ہے دور، شب کو جو آنا نہ ہو ادھر ضد کرکے رویو نہ، ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شب فرقتِ پدر سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت سے رکھ کے سر
راحت کے دن گذر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

ظاہر ہے کہ ایک کم سن چار یا پانچ برس کا بچہ کیا جانے کہ یتیمی کس کا نام ہے، لہٰذا جناب سکینہ جو سوال کرتی ہیں کیسا فطری معلوم ہوتا ہے، اور اسی کو بات سے بات پیدا ہونا کہتے ہیں:۔

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امام کھل جائیگا یہ درد و الم تم پہ تا بہ شام
بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مرجائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

یہ سلسلۂ کلام میر انیس کے مرثیوں میں جس حد تک ملتا ہے اُس کی نظیر پر دوسروں کے کلام میں ملنا مشکل ہیں، ان کے مرثیوں میں خیالات کی تدریجی ترقی ایسی باقاعدہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اُس میں محو ہوجاتا ہے۔ کلام حقیقت سے نزدیک ترین جاتا ہے اور تاثیر میں کمی نہیں ہونے پاتی۔

میر ضمیر گھوڑے کی تعریف میں مبالغہ سے زیادہ کام لیتے ہیں اور واقعیت کا پہلو نظر انداز کرجاتے ہیں جس سے کلام میں اثر باقی نہیں رہتا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

گھوڑا تو ہے خاکی یہ خمیر آبِ بقا ہے گرمی میں جو آتش ہے تو سرعت میں ہوا ہے

یا

میں چشمِ تصور سے لگا کھینچنے تصویر
بس ذہن میں سرعت سے نہ ٹھہرا کسی تدبیر
جب بندشِ مضمون میں باندھا دمِ تحریر
دی کلک نے آواز پری کو کیا تسخیر
ڈھیلی جو ہوئی باگ تصوّر کی ادھر سے
جوں عمرِ رواں ہوگیا معدوم نظر سے

یا

اِس گھوڑے کی سرعت کہو کیونکر کروں مرقوم
جوں حرف غلط حرف ہوئے جاتے ہیں معدوم
کونین میں یہ تیز روی کے جو ہیں مفہوم
یاں ہوتا ہے معلوم نہ واں ہوتا ہے معلوم
مرقوم ثنا صفحۂ کاغذ پہ جہاں ہو
ہر حرف وہیں موجہ کی طرح رواں ہو

اِن اشعار کے پڑھنے سے انھیں سے ملتے جلتے انیسؔ و دبیرؔ کے بھی تعریف فرس کے اشعار تصور میں گشت کرتے لگتے ہیں، لیکن اُن کا یہاں پیش کرنا ضروری نہیں، ہاں اس قدر لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ مرزا صاحب کے کلام میں زیادہ جلوہ گر ہے۔ انیسؔ ایسے مواقع پر واقعیت سے کام لیتے ہیں، اور کیا تعجب ہے کہ اُنھوں نے یہ ضمیرؔ ہی سے لیا ہو کیونکہ اُن کے کلام میں بھی اس کی نظیریں ملتی ہیں۔ مثلاً:-

اب تلوار کی آب و تاب و تیغ زنی کے بھی جوہر ملاحظہ ہوں:-

اِک وار میں اعجاز دکھاتی تھی وہ تلوار
گرتے تھے سر و گردن و دست و کمر اِک بار
اعجاز مجسّم تھی ازل سے وہ شرر بار
دو معجزوں نے مل کے یہ پیدا کئے اسرار
کچھ معجزۂ تیغِ یدِ مرتضوی سے تھے
کچھ معجزۂ بازوئے فرزندِ نبی سے تھے

اک ایک سے ہوئزو بہ قفا پوچھتا تدبیر
دیکھو کہیں آتی ہے چمکتی ہوئی شمشیر
یاں منھ کو پھرا دیکھنے پایا نہ وہ بے پیر
اک برق گری سر پہ گرا کر کے یہ تقریر
گردوں پہ کبھی کوندتی یوں برق نہیں ہے
کیا فرق کریں تن پہ یہاں فرق نہیں ہے

یہی وہ رنگ ہے جو مرزا دبیرؔ کے دل کو زیادہ بھایا اور جس کی نظیریں اُن کے کلام میں جا بہ جا

نظر آتی ہیں۔ میر انیس جو معرکہ آرائی و تیغ زنی بیان کرتے ہیں وہ صرف تعریف نہیں معلوم ہوتی بلکہ تصور میں جنگ کا نقشہ پھر جاتا ہے یعنی جنگ کے بیان میں ایک حریف کے دوسرے حریف پر وار کرنے کے انداز اور گھٹنے یا بڑھنے اور ضرب روکنے کا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے سامنے جنگ ہو رہی ہے، اس سے کلام بے کیف نہیں ہونے پایا ہے بلکہ اس میں ایک قوتِ تحریک و جوش پیدا ہو گئی ہے۔ میر ضمیر کے کلام میں بھی یہی صفت ہے اور یقیناً انھیں سے انیس نے اسے حاصل کیا۔ حضرت علی اکبر سے دو شہ زور لڑنے آئے ہیں۔ بیان ملاحظہ ہو

اک روبرو اکبر کے زدو کشت پہ آیا
نیزے کو ہلاتا ہوا اک پشت پہ آیا

دونوں سے غرض چلنے لگے نیزۂ خونخوار — گر اس کا گھے اُس کا کھڑے روکتے تھے وار
اک برق اُلٹتی تھی پلٹتی تھی ہر اک بار — گھوڑا تھا و یا کل کا بنایا ہوا رہوار

... ... ... ... ... ... ...

... ... ... ... ... ... ...

یا وار کیا پشت پہ صالح نے قضا را — اکبر نے پلٹ کر وہیں نیزہ اُسے ملا
اتنے ہی پلٹنے نے غضب کر دیا سارا — بس سر کے بَعل آیا نہ رہا سانس کا یارا

اب تک جن صفتوں کا ذکر ہوا وہ ایسی ہیں جن میں سے بعض کی مثالیں سوداؔ کے مرثیوں میں بھی ملتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اُن میں یہ وضاحت نہیں اور نہ عموماً ہر مرثیہ میں جو موجود ہیں مثلاً سوداؔ کا ایک مرثیہ ہے جس کا مطلع ہے ۵

فلک نے ابر جس دن کربلا میں ظلم کا چھایا

اس میں رخصت کا بیان ملاحظہ ہو۔ حضرت عباس امام حسین سے رخصت طلب ہیں: ۔

سُنا عباس سے جب اس کو شاہِ دینِ دنیا نے — کروروں در کروروں اشک آنکھوں سے لگے آنے
کہا جانِ برادر اپنے جیتے جی نہ دوں جانے — کہے گی خلق سرِ بھائی کا آگے دیکھے کٹوایا
غرض رخصت پہ یک دیگر میں یہ الحاح و زاری تھی — کبھو جوں ابر باہم منہ پہ مُنہ رکھ اشکباری تھی
کبھو مانند برق آپس میں اُن کو بیقراری تھی — مُرخص اس طرح سالارِ دیں نے اس کو فرمایا

آمد ملاحظہ ہو ۵

چلا عباس جب تو بوس زیں پر مشک کو دھر کر — تو لائے رُو بہ میداں کا فراس کے قصد پر اکثر

رکھا جس نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر جہنم کو اُسے دوشِ اجل کے ہاتھ بھجوا دیا

ظاہر ہے کہ اس آمد کے بیان میں وہ زور و شور نہیں جو انیس و دبیر کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ابھی اس کا آغاز ہوا ہے اور جس طرح ہر چیز ابتدا میں ناقص اور نامکمل سی ہوتی ہے وہی حال اس بیان کا ہے۔ اس کے بعد حضرت عباس کی جنگ کا حال یوں بیان کیا ہے:۔

نہ مانا جب تو بیٹھا فوج میں وہ اشجعِ عالم لگی تب صف پہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم
جدھر کو رُخ کیا کُشتوں کے پُشتے واں ہوئے اُسدم اُدھر خوں کے بہے نالے جدھر اُس کا پڑا سایا

گرمی کی شدت کا خیال ذہن میں رکھتے ہوئے یہ شعر ملاحظہ ہوں، دیکھئے صعوباتِ سفر کا کیسا سچّا اور حقیقی بیان ہے:۔

جو چار پایہ ہے جنگل میں ہپ ہپاتا ہے پکھیرو پاتوں میں رُوکھوں کے منہ چھپاتا ہے
گھر ان دنوں کوئی چیونٹی سے بھی چھُڑاتا ہے ہوا ہے کیا یہ عمل سرز د اس کمینے سے
مثال آگ کے تپتا ہے کوہ اور ہاموں زیادہ آنچ سے ہے گرم ان دنوں کی لوں
سوار گھوڑے پہ باچند کس دلِ محزوں چلا وہ جائے ہے منہ پوچھتا پسینے سے
غبارِ راہ سے چہرہ تمام گرد آلود شعاعِ مہر سے سانو لا کے ہو گیا ہے کبود
ہوا ہے سوچ میں دونوں جہاں کا وہ مسجود ہراس جائے ہے چھوٹے بڑے کے جینے سے

اِن اشعار میں گرمی کا کیسا فطری سماں پیش کیا گیا ہے چار پایوں کا جنگل میں گرمی سے ہانپنا پکھیرو کا درختوں کے سوکھے ہوئے پتوں میں مُنھ چھپانا۔ کوہ و دشت کا یکسر گرم ہوجانا اور لُو کا آگ سے زیادہ گرمی دکھانا یہ تمام واقعات کس قدر سچے ہیں پھر ایسی حالت میں ایک مسافر یعنی امام حسین کی تصویر ایک مصرع میں کیسی کھینچی ہے

چلا وہ جائے ہے منہ پوچھتا پسینے سے

جو اصل واقعہ ہونے کی وجہ سے بلاغت کے اعلیٰ درجہ تک پہونچ گئی ہے۔ اسی طرح یہ اشعار:۔

کجاوے اہلِ حرم کے لگے ہوئے دُنبال مخدرات سراسیمہ و پریشاں حال
نڈھال شدتِ گرما سے اُن میں وہ اطفال کہ دل جنھوں کے ہیں نازک تر آبگینے سے

کیسے درد انگیز ہیں اور کس قدر محاکات کا حق ادا کر رہے ہیں ؎

ہم نے اِس مضمون میں ذکر کیا ہے کہ سوداؔ نے سیرت نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے ع

بدن پہ زخمِ ستم رن میں جب اُٹھائے حسین

ایک ایسا مرثیہ ہے جس میں امام حسینؑ کی رضا و تسلیم کی پوری شان پائی جاتی ہے وہ ہر مصیبت پر صابر و شاکر نظر آتے ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن لب آشنائے فریاد نہیں ہوتے۔ بلکہ اُمت کی مغفرت کی دعا کئے جاتے ہیں جو بالکل موافق فطرت حسین ہے۔

لیکن یہ باتیں ضمیر کو سودا سے ایک جداگانہ، ابتدائی اور ناممکل صورت میں ہاتھ آئیں، جنھیں اُنھوں نے اپنی استعداد سے کام لیکر اُس صورت میں جلوہ گر کیا جو آج تک برقرار ہے۔ لیکن مناظر قدرت کے علاوہ اور بہت سے تفصیلی وجزوی بیانات ایسے ہیں جن کی مثالیں سودا کے بھی مرثیوں میں نہیں اور انھیں مرثیوں میں داخل کرنے کا شرف ضمیر ہی کو حاصل ہے، اس کی مثالیں مضمون میں آگے چلکر پیش نظر ہو جائیں گی۔

متعدد بار اس مضمون میں ذکر آگیا ہے کہ انیس و دبیر نے ضمیر کے کلام سے کافی فائدہ اُٹھایا ہے ہمارا یہ خیال محض حسن عقیدت پر محمول نہ کیا جائے بلکہ اسے امر واقعی سمجھنا چاہیئے، مرزا دبیر کے متعلق شاید صرف اسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ وہ اُن کے شاگرد تھے، تو پھر اُنھوں نے کیا کیا نہ فیض حاصل کیا ہوگا، اس کے علاوہ اُن کا کلام خود پکارتا ہے کہ میرا سرچشمہ کیا ہے، لیکن اس سے انیس یا دبیر کی شان میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوتی۔ ہماری شاعری میں تو اُستادی وشاگردی کا سلسلہ قدیم سے جاری ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے، اس کی بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ بعد کے آنے والے اپنے پیشتر والوں پر فوقیت حاصل کر گئے ہیں، لہذا ہمارا یہ مطلب نہیں کہ انیس و دبیر کا درجہ ضمیر سے فروتر ہے، مقصد صرف اس قدر ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ مرثیہ کے ارتقا و خیالات میں ترقی کیونکر پیدا ہوئی پہلے ہم میر انیس کے کلام کا بہت ہی مختصر طور پر مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دونوں کے کلام میں کیا مشابہت پائی جاتی ہے:-

| ضمیر:- | انیس:- |
|---|---|
| ہنگام عصر خاتمۂ پنجتن ہوا | ہنگام ظہر خاتمۂ پنجتن ہوا |
| سو مجھ کو ملا خلعتِ پُر خونِ شہادت | جب حُر کو ملا خلعتِ پُر خونِ شہادت |
| تمام صحن ہے گھر پستی و بلندی کا | تھوڑی سی جا مگر کہیں پست اور کہیں بلند |
| چراغ و شمع کا برسوں وہاں نہ تھا امکاں | برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا |

میر ضمیر ایک مرثیہ میں فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| بعد اس کے ہے آغوشِ لحد میں تمھیں سونا | ہے سقف کی جا خاک ہی اور خاک بچھونا |

تنہائی میں تاریک ہر اک قبر کا کونا اور آکے مقابل وہ نکیرین کا ہونا

میر انیس کی یہ رُباعی اسی کے پہلو بہ پہلو رکھکر دیکھیئے کہ ان اشعار سے کس قدر ملتی جلتی ہے بلکہ انھیں کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ رباعی

آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا جُز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئیگا انیسؔ ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا۔

آغوش لحد۔ سونا۔ خاک نہ بچھونا۔ تنہائی میں۔ قبر کا کونا۔ تو الفاظ وہی ہیں جو ضمیرؔ نے استعمال کئے ہیں اور پھر تخئیل بھی کس قدر ایک ہے۔

یا میر ضمیرؔ کے اس بند سے :۔

وہ نُور کا تڑکا اُدھر اور صُبح کا عالم گھٹنا مہ و انجم کی تجلّی کا وہ کم کم
آتی تھی صدائے دلِ صبح بھی پیہم چلتی تھی نسیمِ سحری دشت میں تھم تھم
کرتا تھا چراغِ سحری عزم سفر کا
اور شور درختوں پہ وہ مرغانِ سحر کا

میر انیسؔ تخئیل لیتے ہیں، پہلے دونوں مصرعوں کو اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

چھُپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور

چوتھے مصرع کو یوں ادا کیا ہے ع "آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے" بیت کا دوسرا مصرع انیسؔ کے یہاں اس صورت میں جلوہ گر ہوا ہے ع "یادِ خدا میں زمزمہ پردازی طیور"

اِسی طرح ضمیرؔ کے اس بند کے بعد انیسؔ کا بند ملاحظہ ہو، خیالات میں کس قدر یکسانیت پائی جاتی ہے :۔

ضمیرؔ :۔ دکھلائے خدا داغ نہ فرزندِ جواں کا یہ داغ خریدار ہے ماں باپ کی جاں کا
اولاد کا غم شغل ہے فریاد و فغاں کا جب ہو نہ دلاسا تو آرام کہاں کا
یہ داغ کسی صاحبِ اولاد سے پوچھو
شبیرؔ سے یا بانوئے ناشاد سے پوچھو

انیسؔ :۔ دشمن کو بھی خدا نہ دکھلائے پسر کا داغ دل کو فگار کرتا ہے لختِ جگر کا داغ
آنکھوں کا نور کھوتا ہے نورِ بصر کا داغ مرنا جوان بیٹے کا ہے عمر بھر کا داغ
یہ حال ابنِ فاطمہ کے دل سے پوچھیئے زخمِ جگر کے درد کو گھائل سے پوچھیئے

خصوصاً میرانیس کا پہلا اور پانچواں مصرعہ ضمیر کے پہلے اور پانچویں مصرع کی آوازِ باز گشت معلوم ہوتا ہے۔

اگر دونوں کے کلام کا اسی طرح استقصا کیا جائے تو بہت مشابہت ملے گی۔ ہماری پیش کی ہوئی مثالوں سے اس بیان کی وضاحت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک عہد کے بعد دوسرے عہد میں زبان و خیالات دونوں میں ترقی پیدا ہوئی ہے، کیا انیس یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ:۔

"چلتی تھی نسیم سحری دشت میں تھم تھم"

کہہ تو سکتے تھے لیکن وہ عیب سے خالی نہ ہوتا کیونکہ اُن کے زمانہ میں زبان اس قدر ترقی حاصل کر چکی تھی کہ یہ جملہ معیوب سمجھا جاتا تھا، لہٰذا وہ کہتے ہیں:۔

"آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے"

مضمون کے طولانی ہوجانے کا خوف اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسی طرح مرزا دبیر کے کلام سے بھی مشابہت کی مثالیں پیش کریں۔ لہٰذا صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں جس سے یہ روشن ہوتا ہے کہ دبیر نے ضمیر کے خیال سے کس قدر فائدہ اُٹھایا ہے۔ میر ضمیر صبح کا سماں دکھاتے ہیں:۔

خلعت جو ستاروں کا ہوا پیرہنِ شب    ناگہ گلِ خورشید نے لُوٹا چمنِ شب
انجم گئے برباد ہوئی انجمنِ شب    آمادہ کیا صبح نے لاکر کفنِ شب
آراستہ تختِ فلکِ نیلوفری تھا
فرقِ شہِ خاور پہ دھرا تاجِ زری تھا

جب چرخ کا وہ طائرِ زرّیں نظر آیا    زاغِ سیہِ شب نے نشیمن کو اُٹھایا
مرغابیِ انجم نے جو ہیں پر تو ہ پایا    غوطہ وہیں اس قلزمِ اخضر میں لگایا
پر آ جو گئے طائرِ بیضہ کے چمک پر
کم ہونے لگا بیضۂ مہتاب فلک پر

جس دم شہِ خاور ہوا مشرق سے نمودار    مقراضیں لئے خطِ شعاعی کی بس اکبار
زلفِ سیہِ شب کا ہویدا ہوا ہر تار    کی بیرہ زنِ صبح نے گردوں پہ یہ گفتار
ہاں عالمیاں قطع نہ کیوں گیسوئے شب ہو
عُریاں جو سرِ عترتِ ساداتِ عرب ہو

مرزا دبیر:۔ پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی ، پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی

اور قطع زلف لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی　　مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکر رفو تھی چرخ ہنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

ظاہر ہے کہ دبیر نے ضمیر سے خیال لیکے بند بنایا ہے ضمیر نے محاکات سے کسی قدر زیادہ کام لیا ہے، جو پہلے بند میں خاص طور سے نمایاں ہے لیکن مرزا صاحب کے سوائے پہلے مصرع کے اس کا حرفہ اور کسی مصرع میں نہیں ہے، اُنھوں نے اس بند میں خیال آرائی سے کام لیکر نفس مضمون کو پوشیدہ کر دیا ہے۔ گو محاکات تخئیل میں بھی ہوتی ہے لیکن مناظر قدرت کے بیان اسی کے مقتضی ہوتے ہیں کہ اُن میں محاکات بیش پیش رہے تا کہ بیان تصویر بن جائے۔ اسی عنصر کی کمی نے مرزا صاحب کے بند سے تصویر کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔

میر ضمیر کے مراثی پر تفصیلی بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں، بلکہ ایک مختصر سی تنقیدی نظر ڈالنا ہے جس میں ہم نے اُن سے پہلے کے مرثیوں کی حالت کا ذکر کرنے کے بعد اُن کی جدتوں کا بیان کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک عہد کی خدمات پر دوسرے زمانہ والوں نے ترقی پیدا کی ہے۔ اب ہم اُن کے مرثیوں سے چند نمایاں اوصاف کا ذکر کرکے اور مثالیں دے کر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

اہلِ حرم ایک ہی رسی میں باندھے گئے ہیں، اس کی تشبیہ دیتے ہیں:۔

رَسَن تھی ایک ہی شبیر کے یگانوں میں　　ہو ایک رشتۂ تسبیح جیسے دانوں میں

مشبّہ کی رفعت و بلندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کس قدر پاکیزہ مشبّہ بہ استعمال کیا ہے۔ مرزا صاحب کی بھی اسی مرتبہ کی دو تشبیہیں دیکھئے:۔ ع

رسی میں بندھا جب کہ وہ گلدستۂ اسلام

رسی میں بندھے سب حرمِ شاہِ شہیداں　　جس طرح سے شیراز کہ سیپارۂ قرآں

اہل حرم اسیر ہونے کے بعد زندان شام کے پاس لائے گئے ہیں اور انھیں اس خرابہ میں جانے کا حکم ہوا ہے۔ جس طرح وہ اس میں داخل ہوئے اس کی تصویر ایک مصرع میں محاکات کے ذریعہ سے پیش کرتے ہیں۔ ع

جھکائے سر ہوئے داخل وہ قید خانے میں

اِسی طرح گرمی سے ہانپتے ہوئے گھوڑوں کی تصویر کھینچتے ہیں:۔

گھوڑے بھی ہانپتے تھے زبانیں نکال کے

جناب سکینہ پر زندانِ شام میں جو مصیبتیں گذر گئیں وہ انھیں یاد کرتی ہیں، اور اپنے پدر بزرگوار سے فریاد کرتی ہیں۔ دیکھئے شعر سے اُن کی کم سنی کیسی نمایاں ہے ؎

گہر ہیں چھین لئے شمر نے دلا دیجئے ہمارے کان ہیں زخمی دوا لگا دیجئے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضمیر کا قلم ہر شخص کی فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی اصلی سیرت پیش کرنے میں کیسا مشّاق تھا۔ ہم ذیل میں چند بند مندرج کرتے ہیں جو اس کی شہادت ہیں کہ ضمیر بلاغت کی راہ سے کس قدر واقف ہیں۔ ان اشعار میں ایک روایت نظم کی گئی ہے کہ ایک مسافر عاشورہ کے دن صحرائے کربلا میں جا نکلتا ہے اُسے ہر طرف لاشے نظر آتے ہیں اور اُس پر ایک عجیب حالت طاری ہوتی ہے الفاظ کا اختصار۔ مسافر کے دلی جذبات اور بیک نظر جو منظر اُس کے سامنے بسرعت پیش ہوا اُسکا نقشہ کیسا فوری و حقیقی دکھلاتے ہیں ؎

ناگاہ سامنے سے نمایاں ہوا غبار سمت مدینہ سے ہوا پیدا اشتر سوار
عمامہ اُس کے سر پہ بندھا ہے بہ افتخار ہر سمت دیکھتا ہوا آتا ہے بار بار
کہتا ہے یا خدا مری محنت قبول ہو
مہمانِ کربلا کی زیارت حصول ہو

پہونچا جو قتل گاہ میں تو دیکھتا ہے کیا لاشے پڑے ہوئے ہیں جوانوں کے جا بجا
ہے اک طرف کو خیمۂ ویراں کھڑا ہوا ہیں اک طرف سوار و پیادے ہزارہا
پرچم کھلے ہوئے ہیں نشاں سر پہ اوج ہے
اور اس طرف علم ہے نہ لشکر نہ فوج ہے

اک سو کو العطش کی صدا ہے بہ اتصال اور اک طرف کو پانی بہاتے ہیں بد خصال
لاشوں پہ بیکسی ہے برستی پڑی کمال کتنے ضعیف، کتنے جواں، کتنے خورد سال
زخمِ جگر پہ ہاتھ کسی کا دھرا ہوا
دستِ بریدہ میں کہیں کنگنا بندھا ہوا

قتل گاہ کے ہولناک منظر کو دیکھکر اُس کے حواس پر جو اثر پڑا اُس کا کیسا فطری بیان اس مصرع نے ادا کر دیا ع

ہر سمت دیکھتا ہوا آتا ہے بار بار

اور اس کے بعد مسافر کو جو خیال قدرتاً پیدا ہوتا ہے کہ کہیں میری محنت رائگاں نہ ہو جائے اُس کا بیان کیسا حقیقی انداز لئے ہوئے ہے ؎

کہتا ہے یا خدا مری محنت قبول ہو　　مہمانِ کربلا کی زیارت حصول ہو

یوں تو تینوں بند شاعری کی وہ اعلیٰ مثال ہیں کہ اُن پر تعریف کے جتنے پھول نچھاور کئے جائیں کم ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ آخری بیت قابل ذکر ہے جو دو درد کی تصویروں کا مجموعہ ہے۔ چند درد کی تصویریں اور ملاحظہ ہوں:۔

یہ کہہ کے پھر اس ریگِ بیاباں کو ہٹایا　　اور ہاتھوں پہ لیکر علی اصغر کو اُٹھایا
معصوم پہ اک جوشِ محبت جو ہیں آیا　　جھک جھک کے کئی بار اُسے چھاتی سے لگایا
فرمایا کہ اب خاک گرائی نہیں جاتی
صورت علی اصغر کی چھپائی نہیں جاتی

اُس وقت کے لحاظ سے ان کی زبان میں جو خامیاں پائی جاتی ہیں وہ ایسی نہیں کہ جن سے آجکل کے کلام میں زیادہ تفاوت معلوم ہو۔ اُس میں جو قدامت کے آثار ہیں ان مثالوں سے معلوم ہو جائیں گے:۔

ع　شہ کے رفیق نے کہی تکبیر پڑھ درود
ع　اتنے میں حُر نے آ مع لشکر کیا سلام
ع　منظور ہو تو حاکم کوفہ سنے چلوں

غرضکہ ایسے ہی خفیف آثار ہیں ورنہ زیادہ وہی ہے جو آجکل بولی جاتی ہے۔

یہ ہے میر ضمیر کی خدمات کا بیان جن سے مرثیہ نہ صرف اہل اسلام کے ایک مخصوص طبقہ میں بلکہ اُن لوگوں کی نظر میں بھی قابل وقعت ہوگیا، جو اہل اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے لیکن ذوق زبان والے ہیں۔ اُصولِ ارتقاء پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم اُردو مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ضمیر کی خدمات کو انیس و دبیر کی ریاضت سے بہت فروتر جگہ نہیں دے سکتے، کیونکہ ان دونوں نے مرثیہ میں کوئی جدت نہیں پیدا کی، بلکہ صرف ضمیر کی قائم کردہ شاہراہ پر چلے ہیں، اُن کے خیالات کے چربے اُتارے، اُن کو وسعت دی، تنوع پیدا کیا، کثرت سے نظم کیا اور ترقی دیکر اس اوج کمال پر پہونچا دیا کہ جس سے بلند تر کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے صلہ میں ان دونوں بزرگوں کو جو نام و نمود حاصل ہوا وہ بالکل بجا ہے لیکن خرابی یہ پیدا ہوئی کہ اس شہرت نے ضمیر کے نام و کمال کو گھن لگا دیا حالانکہ اُنکی خدمات ایسی ہیں جو اُردو مرثیہ کی تاریخ میں کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں

# درسِ ہوش

(از حضرت جگر بریلوی بی اے)

اے خود نما نہ اپنی طرف بار بار دیکھ    عالم کو دیکھ قدرتِ پروردگار دیکھ
رنگیں خیالیوں پہ اگر ناز ہے تجھے    رنگینیِ گُل و چمنِ لالہ زار دیکھ
فیض و کرم پہ اپنے اگر ہے تجھے غرور    گنگ و جمن کو دیکھ سحاب و بہار دیکھ
گر جوہرِ دماغ کی ہے خواہشِ نمود    لعل و زمرد و گُہرِ آبدار دیکھ
ہے جاہ و مرتبہ میں بلندی اگر نصیب    کوہِ ہمالیہ کا عروج و وقار دیکھ
رعنائیِ و جمال سے گر بہرہ مند ہے    سروِ چمن کو دیکھ گلوں کا نکھار دیکھ

ہے قدردانِ زیست تو کسبِ کمال کر
رہ خود فروشیوں سے مگر ہوشیار دیکھ

## نگاہِ کرم

(از حضرت مخدوم بی اے)

تیری وہ اک نگاہ تھی جس نے بصد فروغ    ارجن کے دل کو آئینۂ حق نما کیا
فوراً کشودِ کار کے ساماں بہم ہوئے    کچھ اس ادا سے عقدۂ ہستی کو وا کیا
حسنِ ازل کے جلوے تھے بے پردہ سامنے    تو نے وہ چشمِ شوق کو جوہر عطا کیا
جرأت تھی یہ تری بکیرِ لرزاں سنبھل گیا    قوت تری تھی جس نے نبرد آزما کیا
آئینہ ہوگئی حق و باطل کی جب تمیز    کیا خوب فرضِ زندگی اُس نے ادا کیا

محتاج اسی نگاہ کے اے کرشن! ہم بھی ہیں
بیدل بھی مضطرب بھی ہیں پامالِ غم بھی ہیں

# متحدہ قومیت کا خواب اور اردو

(از مسٹر فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری. بی ۔اے)

ملک کے مایۂ ناز ادیب منشی پریم چند کا مضمون بہ عنوان "اردو۔ ہندی۔ ہندوستانی" ماہ اپریل ۱۹۳۵ء کے رسالہ "زمانہ" میں میری نظر سے گذرا جسے دیکھکر یہ محسوس ہوا کہ سچا قومی درد رکھنے والی ہستیاں ابھی اِس اُجڑے دیار میں موجود ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ملکی فضا کا اثر ہے یا کیا، کہ جس وقت میرا دل فاضل مضمون نگار کی تائید کر رہا تھا اُسی وقت مجھے بعض بعض مقامات پر کچھ ماحولی اثرات بھی کام کرتے نظر آئے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب ایک قوم دوسری قوم سے ملتی ہے، اتحاد و ارتباط کے موقع پیش آتے ہیں اور اظہار خیال کے لئے ایک روادارانہ داد و ستد قائم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں نئے نئے آئے ہوئے مسلمان اپنی اصولی سختی کے لحاظ سے زبان کے معاملہ میں کتنے ہی متعصب کیوں نہ ہوں مگر ملکی ضرورتوں اور نئے اتحادیوں کے مراسم سے مجبور تھے کہ عربی فارسی سے ہٹکر دیسی قوموں سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کے لئے ایک مشترک روزمرّہ کی بنیاد ڈالیں ملک کی خوش قسمتی کہئے یا دُو ملے ہوئے دلوں کی خوش مذاقی کہ ہر دلعزیز اکبر اعظم کے تین چوتھائی راجپوت پوتے شاہجہاں کے اُردوئے معلّی میں جس دیسی زبان نے جنم لیا اُسے ہندوستان کی ماتر بھاشاؤں میں سے برج بھاشا جیسی شیریں کلام ماں ملی ورنہ بہت ممکن تھا کہ پنجابی۔ پوٹھواری یا مارواڑی خون اُس کی رگوں میں گردش کرتا۔

ملک کے مختلف حصوں میں جو پراکرتیں بولی جاتی ہیں اُن سب میں تلفّظ کے ذرا سے فرق کے ساتھ ملتے جلتے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مشرقی اور جنوبی پراکرتوں میں مرکزی بھاشاؤں سے اجنبیت و افتراق کا عنصر چینی اور دراوڑی اثرات کا رہین منت ہے۔ اسی طرح سندھ اور افغانستان کی جانب سے اقوام فارس و عرب کے اثرات کسی نہ کسی حد تک اپنا کام کرتے رہے ہیں۔ ورنہ ان تمام صوبجاتی سنسکرت زادیوں کو دلّی اور صوبۂ متحدہ کی مرکزی زبانوں کے مقابل کوئی آل انڈیا اہمیت

حاصل نہیں ہے۔ اس لئے زبانوں کے صوبجاتی اختلاف کا ذکر کرنا یا اُن کو جداگانہ اہمیت دینا مشکلات بڑھانے کے سوائے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسکی وضاحت آگے چلکر ہوگی۔

ہندوستان میں ہندی اور اُردو کے دو کیمپ قائم ہوئے پچیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا زبان کے اختلاف کا خیال اور ہندی کو ملکی زبان کی حیثیت سے فروغ دینے کی کوشش اُس احساس بیداری کا نتیجہ ہے جو وطن کی اکثریت کا جمود زائل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ مگر اس بیداری کا سبب وہی آسانی سے اُبھرنیوالے جذبات رشک و تعصب تھے جو ہندوستان کی تنگ نظر فضا کے لئے ہمیشہ موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ گویا طلوع صبح کے لئے تاریکیاں ڈھادی گئیں سب نے دیکھا کہ صدیوں سے مل جل کر رہنے والی قومیں جن میں نفرت انگیز چھوت چھات کے باوجود حقیقی بھائی چارہ اور باہمی اخوت قائم ہوگئی تھی ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوگئیں اور نفرت وعناد کے وہ شعلے بلند ہوئے جن کی نظیر ہند کی تاریخ میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ کیونکہ اس ملک میں پانی پت کی آخری لڑائی سے پہلے بھی مسلم حملہ آوروں کے مقابل مسلمان اپنے وطنی بھائیوں کے دوش بدوش جنگ کرنا سیکھ چکے تھے۔

بہرحال ہر محب وطن کو اس پر بھی خوش ہونا چاہیئے، اگر کچھ خون کے قطرے اور آگ کے شعلے ہی ملک کے بڑے حصے کا جمود دُور کرکے سرزمین وطن کو زرخیز بنا سکیں۔

پچھلے دنوں گوالیار میں جوبلی کے موقع پر ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کرنل سر کیلاش نرائن ہاکسر نے اِن خیالات کا اظہار فرمایا تھا کہ ملک کی افسوسناک حالت کا مظہر ہمارا آپس کا افتراق ہے! جس کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ گو کئی صدیوں سے اُردو ملک کی زبان ہوگئی ہے لیکن آج ہندی کو اسکے مقابلہ میں کھڑا کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ آخر یہ کس لئے؟ اور واقعی وہ زبان جو ہندوستان کی اتحادی ضرورتوں کی پیداوار اور بین الاقوامی اتحاد لسانی کے لئے اتنی وسعت رکھتی ہو کیوں کسی خاص قوم و مذہب کی ملکیت سمجھی جاکر تعصب کی ٹھوکروں سے ٹھکرائی جائے؟

اندور میں ہندی یونیورسٹی کے افتتاح کے موقعہ پر مہاتما گاندھی نے ہندی زبان کا جو مفہوم پیش کیا ہے اُس کو کسوٹی پر کسکر دیکھیئے تو صرف اُردو ہی اپنے معیار ساخت کے لحاظ سے کامل اُترے گی اور شُدھ ہندی خالص عربی فارسی کے مقابل قرار دیجائیگی۔

ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے کے بعد اگر کبھی یہ ملک جہل و عصبیت کی تاریکیوں سے باہر نکلا تو آپ دیکھیں گے کہ مشترکہ زبان کے متعلق صرف رسم الخط کا سوال رہجائیگا عام زبان اُردو ہی رہے

پا گئی جو ملک میں متحدہ قومیت کا احساس پیدا ہونے کے بعد ہندوستانی زبان کے نام سے پکاری جا رہی ہے۔

رسم الخط کے پیچیدہ مسئلہ کا حل آج سے برسوں پیشتر گوالیار کے غیر معمولی بیدار مغز حکمران سورگباشی مہاراجہ مادھوراؤ سیندھیا نے کر دیا تھا یعنی گوالیار میں فارسی آمیز اُردو بہ خط ہندی رائج ہے۔ اس فیصلہ سے اہل گوالیار کو جن میں ہر قوم و مذہب کے افراد شریک ہیں دفتری زبان سیکھنے میں حد درجہ کی آسانی رہی اور تھوڑی مزاولت سے تحریری شکوہ و متانت اور قانونی و معاملاتی زبان ہاتھ آگئی۔ اُردو کے رسم الخط کو مختلف المخرج فارسی عربی اور ہندی حروف مشکل بنا دیتے ہیں۔ مختصر نویسی کے جتنے فوائد اس رسم الخط میں ہیں اُسی نسبت سے اس کے نوشت و خواند میں دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ اس کے برخلاف ایک ذہین شخص دو ہی تین روز میں ہندی تحریر سے آشنا ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا اور زیادہ قدیم حل سندھی زبان کا وجود ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ سنسکرت اور پراکرت کی آمیزش زیادہ ہے اور رسم الخط مہند عربی ہے۔ اب ملک کو اختیار ہے کہ ان دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اپنے لئے انتخاب کر لے۔

اُردو کے قدیم مستند اسکول ہمیشہ سے سادہ روزمرہ اور عام فہم زبان پیش کرتے رہے ہیں جو شمالی ہند کے کثیر طبقہ کی بول چال ہے۔ لیکن ہندی پرچار کی تحریک سے کچھ ہی قبل سے اُردو نثر نگاروں میں ایک اینگلو عربک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس نے برج بھاشا کے سہاؤنے سبزہ زار چھوڑ کر مغربی رنگینیوں اور عربی وسعتوں سے یخ بستہ مناظر اور ریگستانی سراب پیدا کر کے صناعیاں دکھائی ہیں۔ اس سے ترجمہ کے لحاظ سے ہندوستانی زبان میں وسعت اور علمی لوچ ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن زبان کی سلاست اور ملکی خصوصیت اِس بار احسان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ادبیت کے لئے بھی فارسی عربی الفاظ کا غلبہ ضروری نہیں۔ بھاشا کے میٹھے میٹھے پیارے الفاظ و محاورات اُن کی جگہ آسانی سے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ رہی علمی زبان اس کے لئے اصطلاحات کا خزانہ بقول فاضل منشی پریم چند کے انگریزی الفاظ کے مصطلحات سے مل سکتا ہے۔ آسانی کے لئے آپ چاہیں تو انھیں ہندوستانی سانچہ میں ڈھال سکتے ہیں۔ اس کے لئے عربی یا سنسکرت کی نئی اصطلاحیں وضع کرنا زبان کی مشکلات میں بے وجہ اضافہ کرنا ہے۔

محبان اُردو کو شاید شکوک و اوہام ہوں کہ گاندھی جی عربی فارسی اور سنسکرت کے عام فہم الفاظ

کے مناسب اختلاط کو ملکی زبان قرار دیتے ہیں تو پھر مدراس وغیرہ میں ہندی کا پروپگنڈا کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس سے اُردو کی ہتک نہیں ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے۔ درحقیقت دکن وغیرہ میں ہندی کا پرچار ہندوستانی زبان کی انمول خدمت اور متحدہ قومیت کا سنگ بنیاد رکھنا ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، برہمی، بنگلہ، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگی وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان پراکرتوں میں اپنی اصل یعنی سنسکرت کی بدولت بڑی صلاحیت موجود ہے کہ ان کے بولنے والے جلد ہی ہندی کو اپنی ماتر بھاشا بنالیں اور اس طرح رفتہ رفتہ ہندوستانی زبان کے قریب ہو جائیں۔ یعنی گجرات، دکن، مدراس اور بنگالہ وغیرہ میں ہندی کی خدمت فی الحقیقت اُردو کی خدمت، متحدہ قومیت کی خدمت اور وطن کی خدمت ہے۔

ہندوستان میں برہمنی دھرم کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ مذہب و فلسفہ کے لحاظ سے آج بھی سنسکرت دنیا کی بہترین زبان کہی جا سکتی ہے۔ لیکن بعض وجوہ سے قانونی اور دیگر علمی اصطلاحات کے لئے عربی اور لاطینی ہی زبانیں زیادہ موزوں ہیں۔

برہمنوں کی خودغرضیوں کی بدولت سنسکرت جیسی وسیع و قابل زبان اسرار مذہب و فلسفہ کی بلندیوں سے اُتر کر کبھی عوام کی ملکیت نہ بن سکی۔ مگر اس کے برخلاف اس کی آریہ بہن فارسی گو مذہب و فلسفہ میں بہت پیچھے رہی لیکن اخلاق، تہذیب، تکلفات اور سلطنت آرائی میں کئی قدم آگے بڑھ گئی اور عوام و خواص کے دل یکساں طور پر لبھانے لگی۔ عربی قطعی اجنبی اور بدیشی چیز تھی لیکن کچھ تو سواحل ہند کے تجارتی تعلقات نے اور کچھ عربوں کے عالمگیر عروج نے اس کے لئے علمی اور قانونی اصطلاحات کے زرخیز میدان پیدا کر دیئے اور بیشتر الفاظ حاکم و محکوم کی روزمرّہ زبان میں داخل ہو گئے۔

قوموں کی محدود ذہنیتوں کا (خواہ وہ علمی اور سوشل اجارہ داری پر مبنی ہوں یا حفظان صحت کے اُصولوں پر) کسی علمی زبان کی وسعت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کے اصطلاحی اور قانونی الفاظ ہندوستان کے کسی خطہ میں اتنے عام اور مقبول نہیں ہوئے جتنے عربی کے۔ بعض الفاظ جو مختلف صوبوں کی پراکرتوں میں اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ اب عوام کے لئے انھیں عربی سمجھنا دشوار ہے لیکن خواص کے لئے یہ امتیاز ہٹ دھرمی کا مترادف ہے۔

عربی فارسی الفاظ پر کوئی قدغن ہی نہ تھی اس لئے زیادہ عام ہو کر وہ ہندوستانی زبان کا جزو غالب بن گئے ہیں، اور ہندوستان کی بہترین پراکرت بھاشا کے ساتھ بھی شیر و شکر ہو گئے ہیں

مگر سنسکرت کی اصطلاحات نے دنیا سے تعلقات وسیع تر ہو جانے کے باوجود اپنا فلسفیانہ مگر خاموش رویّہ قائم رکھا۔ اس لئے اُردو کو مسلمانی زبان سمجھنا یا اس سے اس بنا پر بُرا ماننا فضول ہے کہ برج بھاشا کی بیٹی ہونے کے باوجود اس میں سنسکرت کی علمی زبان کا کم دخل ہوا ہے۔

ہر زبان دوسری زبان کے الفاظ کو اپنا کر خوش ہوتی ہے اور اپنی وسعت کو وسیع تر بناتی ہے لیکن ہمارے ملک کی تنگ ذہنی کا افسوسناک اثر یہ ہے کہ شدھ ہندی جسکا پرچار آجکل صوبہ متحدہ اور پنجاب میں بھی دیش سیوا کے مرادف سمجھا جارہا ہے دوسری زبانوں کے الفاظ کو چوکے باہر ہی رکھنا چاہتی ہے۔ اور اگر بھولے بھٹکے کسی کا قدم آجائے تو کھانا چھوڑ کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔

ذوقِ سلیم شاہد ہے کہ پیار محبت کی گفتگو اور روزمرہ کی صلاحیت برج بھاشا سے زیادہ ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ اسی طرح قانونی اور دفتری زبان میں آداب و تہذیب و مراسم اخلاق کے لئے فارسی آمیز ہندوستانی یعنی اُردو تقریباً ناگزیر ہے۔ ان دونوں کی مناسب آمیزش ہماری روزمرہ کی بول چال ہے۔ اس لئے یہاں کی قومی زبان کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مردوں کی زبان اُردو، اور عورتوں کی زبان بلا استثنائے قوم و مذہب ہندی ہونا چاہیئے۔ تاکہ بچوں کی تربیت صحیح ہندوستانی ماحول میں ہو سکے۔

افتراق کے حامیوں کے دلائل صریحاً بے بنیاد اور سطحی ہیں لیکن موجودہ فضا اس کی متقاضی ہے کہ ابھی ایک عرصہ تک ہندی کی پُرزور تبلیغ گجرات۔ دکن۔ مدراس اور بنگالہ میں کیجائے تاکہ صوبجاتی پراکرتیں ہندوستانی زبان سے قریب تر ہو جائیں۔ اس کے بعد رسم الخط۔ روزمرہ اور علمی زبان کے مسائل پر اُردو اور ہندی کے علماء وسیع النظری کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر کے کسی نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں۔ جس وقت تک ہماری بدنصیبی سے ہندوستان کے دو اہم عناصر میں باہمی اختلاف و انتشار ہے اور اتحاد کی ضرورت محسوس نہیں کیجاتی یا رواداری ذہنیت پیدا ہونے کا امکان نظر نہیں آتا اُس وقت تک لسانی اتحاد یعنی ہندوستان کی قومی زبان کا وجود بھی عملاً ناممکن ہے۔

اس وقت ہماری کوششوں کا مطمح نظر اپنی زبانوں کے آلات نشر کو تبلیغ اتحاد کے لئے وقف کر دینا ہونا چاہیئے تاکہ آئندہ مساعی کیلئے ایسی زمین تیار ہو جائے جس میں تخم عمل بار آور ہو سکے۔

# زندگی نغمۂ روحانی ہے!

از جناب مولانا نکہت شاہجہانپوری بی۔ اے (آنرز)

(۱)

زندگی نغمۂ لافانی ہے — زندگی مرکزِ روحانی ہے
نہ حبابوں کی طرح فانی ہے — نہ سمندر کی یہ طغیانی ہے
نہ ہوا کی طرح سیلانی ہے — نہ یہ نکہت کی پریشانی ہے
نہ یہ خورشید کی تابانی ہے — نہ شبِ ہجر سی طولانی ہے
نہ فضائے چمنستانی ہے — نہ بہار اِس کی فقط آنی ہے
زندگی مرکزِ روحانی ہے
زندگی نغمۂ لافانی ہے

(۲)

ابدی گلشنِ عشرت ہے یہی — ازلی نغمۂ فطرت ہے یہی
مظہرِ جلوۂ وحدت ہے یہی — کُنتُ کنزاً کی حقیقت ہے یہی
مستیِ بادۂ الفت ہے یہی — نغمۂ سازِ محبت ہے یہی
حسنِ لافانیِ جنت ہے یہی — مرکزِ آیۂ رحمت ہے یہی
زندگی مرکز لافانی ہے
زندگی نغمۂ روحانی ہے

(۳)

اے اسیرِ چمنِ رنگ و بُو — اے فدائے ہوسِ ہاؤ ہُو
مرکزِ خوبی و آئینہ رُو — غمزہ و عشوہ طلسم و جادو
محو عشرت جو حبابِ لبِ جُو — گرمِ جولا [illegible] آہو

بے خبر از خبرِ نغمۂ ہو | تابکے کشمکشِ ما و تو

زندگی مرکزِ روحانی ہے
زندگی نغمۂ لافانی ہے

(۴)

تو اگر کالبدِ انساں ہے | تو اگر آئینۂ عرفاں ہے
کنز تری ذات میں گر پنہاں ہے | آتما تیرے ہی گر شایاں ہے
تجھ میں ہی درد بھی اور درماں ہے | دل و جاں اور غمِ جاناں ہے
تو ہی دنیا کا اگر ارماں ہے | عالمِ جسم کی گر تو جاں ہے

زندگی مرکزِ روحانی ہے
زندگی نغمۂ لافانی ہے

(۵)

ذرہ ذرہ ہے جہاں کا با شعود | عمر اس کی ہے یقیناً محدود
رازِ فطرت ہے گر بزمِ شہود | نہیں بے وجہ عدم اور شہود
غایتِ خلق نہ سمجھو مفقود | زیست اپنی ہے سراسر مقصود
جسم کا مسئلۂ بود و نبود | اللہ اللہ یہ خیالِ محدود

زندگی مرکزِ لافانی ہے
زندگی نغمۂ روحانی ہے

(۵)

دیکھ ہاں دیکھ نشیب اور فراز | سازِ ہستی میں ہے کس کی آواز
کس کے نغمے ہیں مگر سمع نواز | تیری آنکھوں میں ہے کس کا اعجاز
جلوۂ حسن میں کس کا انداز | اور تجمِ عشق میں پنہاں کیا راز
او پرستارِ خودی بندۂ آز! | عقل پر اپنی تجھے اتنا ناز!!

زندگی مرکزِ روحانی ہے
زندگی نغمۂ لافانی ہے

# شادی

از مہاشہ حسینی سرشار خبر پور سادات ضلع مظفر گڑھ

ہیچ و ناکارہ ہے یکسر آدمی جس کے بغیر　　کچھ نہیں دنیا میں لطفِ زندگی جس کے بغیر
جس کے دم سے رنج و غم کا نام ہے عیش و نشاط　　اور مہمل لفظ ہیں عیش و خوشی جس کے بغیر
باغِ ہستی میں جو پیدا کرتی ہے برگ و ثمر　　کھل نہیں سکتی یہاں کوئی کلی جس کے بغیر
قدر و قیمت کچھ نہیں رکھتی ریاضِ دہر کی　　دلربائی، دلپسندی، دلکشی جس کے بغیر
بے نتیجہ، بے مزا، بے لطف اور بے کیف ہے　　داستانِ دلبری و دلدہی جس کے بغیر

ہے وہی سرمایۂ نازِ گلستانِ وفا
رشتۂ شادی، جسے کہتے ہیں پیمانِ وفا

دو دلوں کو جذب سے باہم ملا دیتی ہے یہ　　پردہ جو حائل دوئی کا ہے، اٹھا دیتی ہے یہ
پہلے دو اجسام کو حلقے میں لے لیتی ہے یہ　　پھر انھیں یکجان دو قالب بنا دیتی ہے یہ
شوہر اور بیوی میں کرتی ہے وہ پیدا اختلاط　　اختلافِ باہمی یکسر مٹا دیتی ہے یہ
ایک جادو ہے کہ چھا جاتا ہے جسم و روح پر　　ورنہ ظاہر ہے کہ کیا لیتی ہے کیا دیتی ہے یہ
ایک ہو جاتے ہیں اس سے سوز و سازِ حسن و عشق　　تفرقوں کا خاتمہ کر کے دکھا دیتی ہے یہ
آبیاری اس سے ہوتی ہے ریاضِ دہر کی　　اس میں گل بوٹے نئے ہر سو اگا دیتی ہے یہ

زیب و زینت باغِ ہستی کی اسی کے دم سے ہے
شان و شوکت اپنی بستی کی اسی کے دم سے ہے

# فرانسیسی مصنّف وِکٹر ہیوگو کا ایک شاہکار

(از مسٹر ایچ سی کمار - کراچی)

(۱)

فرانس کے مشہور شاعر اور فسانہ نگار وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) کی پیدائش ۱۸۰۲ء اور وفات ۱۸۸۵ء میں ہوئی جب فرانس میں ۱۸۴۸ء میں سیاسی انقلاب کے وقت وکٹر ہیوگو کو جان بچانے کے لئے بلجیم میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ اس جلاوطنی کے زمانہ میں اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ایک کا حال ذیل میں درج کیا گیا ہے

ادبی دنیا میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ وکٹر ہیوگو کے جادو نگار قلم نے ایک اور افسانہ لکھ ڈالا ہے۔ تو ہیوگو کے پرانے پبلشر ہرزل Hertzel نے یہ خبر سنتے ہی تقاضہ کے خطوط کا تانتا باندھ دیا۔ مگر ہیوگو نے جواب تک نہ دیا۔ پھر کیا تھا۔ پیرس کے چھاپہ خانوں کے مالک چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ پہلے انھوں نے میڈم ہیوگو کو ہموار کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن جب وہ اس میں ناکام ہوئے تو ہیوگو کے بیٹے سے جو برو سیلز میں تھا سلسلہ جنبانی شروع کی

مثل مشہور ہے "نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچینگی" نوجوان ہیوگو نے پنڈ چھڑانے کے لئے لکھا کہ والد صاحب تین لاکھ فرانک حق تصنیف طلب کرتے ہیں

تین لاکھ فرانک کہنے کو تو تین لفظ اور ایک بات ہے مگر کسی کو سان گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ ایک کتاب کے حق تصنیف میں اس قدر گراں رقم طلب کیجائیگی

کچھ روز خاموش رہنے کے بعد Hertzel نے پھر سلسلہ جنبانی شروع کی اور اپنے پرانے تعلقات کی یاد تازہ کرتے ہوئے ڈیڑھ لاکھ فرانک پیش کئے مگر اس پر بھی ہیوگو رضامند نہ ہوا۔

(۲)

انھیں دنوں کی بات ہے کہ ایک بے بضاعت لیکن من چلے نوجوان نے بروسیلز کے ایک گمنام کوچہ میں کتب فروشی کی دوکان کھولی

ہیوگو کی تصنیف پر چاروں طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اس نوجوان کو بھی جو نپڑی میں

رہتے ہوئے محلوں کے خواب نظر آنے لگے۔ اور ایک روز جب ہیوگو کا لڑکا چارلس اپنے گھر میں بیٹھا کام کر رہا تھا، کسی نے دروازے پر دستک دی۔

چارلس نے جا کر دروازہ کھولا تو ایک سر تا پا مکلف لباس سے آراستہ جوان اندر آیا۔ اس کے کوٹ کے کالر میں ایک پھول آویزاں اور اس کے لبوں پر تبسم رقصاں تھا۔

نووارد نے داخل ہوتے ہی نہایت انکسار سے جھک کر سلام کیا اور اپنا نام La croix کتب فروش بتلا کر بیٹھ گیا، اور پیشتر اس کے کہ چارلس کی زبان سے ایک لفظ نکلنے پائے نووارد نے نہایت چرب زبانی سے اپنی داستان کا آغاز کر دیا:۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ کے والد صاحب اپنی تازہ ترین تصنیف کی طباعت کا کام کسی چھاپہ خانہ کو دینے والے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، بلکہ جس کارخانہ اور جس ملک میں یہ عظیم الشان کام سرانجام پائیگا اس کا نام چار دانگ عالم میں مشہور ہو جائیگا۔ اسلئے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ یہ فخر میرے وطن مالوف اور میرے چھاپہ خانہ کو ہی حاصل ہو، اور میں اس کو کماحقہ سرانجام دینے کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنیکو تیار ہوں"۔

چارلس نے سوائے اس کے اور کچھ چارہ نہ دیکھا کہ نوجوان کتب فروش کو یہ وعدہ دیکر پیچھا چھڑائے کہ میں ضرور والد سے ذکر کرونگا۔

جب ہیوگو نے بیٹے سے یہ قصہ سنا تو جواب دیا کہ میں نے اس مطبع کا نام تک نہیں سنا اور اس قسم کی تجویز پر غور کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔ مگر La croix ان لوگوں میں نہ تھا جو ہار مان لیں۔ چند روز بعد وہ خود وکٹر ہیوگو کے قیام گاہ پر حاضر ہوا لیکن جب ہیوگو نے اس کا ملاقاتی کارڈ دیکھا تو ملنے سے انکار کر دیا۔

مگر "یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتار دے" نوجوان بیلسٹر دھرنا دیکر وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا کچھ عرصہ کے بعد جب ہیوگو باہر نکلا تو نوجوان نے بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا۔ مگر ہیوگو نے کچھ التفات نہ کی اور سیر کو چل دیا۔

گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد پھر پھرا کر گھر کو لوٹا تو دیکھا کہ نوجوان موجود ہے ناچار اس کو اندر لے گیا۔ مگر اندر بلا کر نوجوان کو باہر نکالنا دشوار ہو گیا۔

۴۔ اکتوبر کی ڈائری میں ہیوگو نے ذیل کا اندراج کیا ہے۔ "آج "Les Miserables" کا نسخہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار ترجمہ کے حقوق ۶۰ ہزار فرانک[1] میں فروخت کئے گئے معاہدہ کی میعاد بارہ سال ہے"۔

[1] فرانک کی قیمت ۱۲ ؁ سمجھنا چاہیے۔

نوجوان Lacroix خوش خوش گھر آیا، مگر یہ خوشی بہت جلد ختم ہوگئی کیونکہ اُس نے ہیوگو کو پندرہ روز کے اندر ۲ لاکھ فرانک زر پیشگی دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر جب اُس نے شہر کے بنکوں سے قرضہ مانگا تو سب لگے بغلیں جھانکنے۔

تین لاکھ فرانک ایک ناول کی قیمت! بھلا ادبی دنیا میں اس احمقانہ سودے کی کوئی نظیر ڈھونڈھے سے بھی مل سکتی تھی! اور اس پر طرّہ یہ کہ ناول کا مصنف ایسا شخص تھا جو مغویانہ خیالات کے باعث جلاوطن تھا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے، Lacroix کو ایک اور تجویز سوجھی، وہ یکے بعد دیگرے مالکان مطابع، جلد سازوں، کاغذ فروشوں اور تاجران کتب کے پاس گیا اور ہر ایک سے تھوڑا تھوڑا قرضہ اُٹھایا۔ اس شرط پر کہ چھاپہ خانوں کو چھپائی کا کام، اور جلد سازوں کو جلد باندھنے کا کام دیا جائیگا۔ کاغذ فروشوں سے کاغذ خریدا جائیگا اور کتب فروشوں کو بیچنے کے لئے کتابیں دی جائیں گی سچ ہے قطرہ قطرہ دریا بنجاتا ہے۔

جب ۲ لاکھ کی رقم پیشگی ادا ہوگئی تو ہیوگو نے پہلی جلد کا مسودہ Lacroix کے حوالہ کردیا

(۳)

جب پیرس کے پبلشروں نے یہ سنا کہ برسیلز پیرس پر سبقت لے گیا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے۔ انھی دنوں پیرس سے ایک نیا جمہوری اخبار نکلنے والا تھا اُس کے مالک نے ہیوگو کو پانچ لاکھ فرانک کا آفر دیا، اور گو Lacroix نے کچھ چوں وچرا نہ کی مگر ہیوگو نے اس آفر کو ٹھکرادیا۔

جنوری ۱۸۶۲ء میں پروف نکلنے شروع ہوگئے پہلے پہل یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ ساری کتاب آٹھ جلدوں میں ختم ہوجائے گی، اب یہ اندازہ دس جلدوں تک پہونچ گیا، پروف خوانی اور ترمیم کا کام بڑا سخت تھا۔ ہیوگو صفحے کے صفحے بدل دیتا تھا۔ بچارا Lacroix بہتیرا پیچ و تاب کھاتا تھا مگر دم نہ مار سکتا تھا۔

۳ اپریل کا دن فرنچ لٹریچر میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اُس روز برسیلز اور پیرس دونوں میں ایک ساتھ وکٹر ہیوگو کے شاہکار "Les Miserables" کا جنم ہوا۔

۴ اپریل کو Lacroix نے ہیوگو کو حسب ذیل تحریر کیا "آج ہماری کمال کامیابی کا مبارک روز ہے، فرانس زندہ باد۔ ہیوگو زندہ باد۔"

میڈم ہیوگو نے ذیل کی چٹھی تحریر کی "میرے مکان پر مبارکباد دینے والی خلقت کا ہجوم لگ رہا ہے، کتابوں کے چھکڑے بھرے آتے اور خالی ہوتے جاتے ہیں، یہ سب اسٹاک کتب فروشوں کے ہاتھ بک چکا ہے۔ پرائیویٹ خریداروں کے لئے ایک نسخہ بھی دستیاب نہیں ہو سکتا!" اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر لاکھوں نسخے فروخت ہوگئے، Lacroix افلاس سے نکلکر شہرت اور دولت سے مالا مال ہوگیا۔ دوسرے سال اُس نے اور Hertzel نے ملکر ایک باتصویر اڈیشن نکالا اور ایک سال کے اندر ایک لاکھ کاپیاں فروخت کیں۔

ایک ایک مہینے کے وقفہ سے کتاب کے باقی حصے بھی شائع ہوتے گئے اور ساتھ ساتھ یورپ کی تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہوکر اُمڈے ہوئے دریا کی طرح اطراف واکناف عالم میں پھیل گئے۔ فقط فرنچ اڈیشن کی اشاعت بیس لاکھ تک پہونچ گئی۔

اب وکٹر ہیوگو کی قسمت کا ستارہ بھی انتہائے عروج پر چڑھنا شروع ہوا۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو Sedan کی لڑائی کے بعد فرانس میں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ ۵ ستمبر کو انیس سال کی جلاوطنی کے بعد ایک معمر، سفید ریش شخص پیرس میں وارد ہوا، لوگوں کے پُرتپاک استقبال کی کوئی حد نہ تھی۔ اُنھوں نے ہیوگو کو فرانس کا تاج شاہی پیش کیا، مگر اُس نے انکار کردیا۔ اور جب ۱۸۸۵ء میں اُس کا انتقال ہوا تو دو روز تک اس کی لاش مینار فتح کے نیچے رکھی رہی اور لوگ پھولوں کی بارشیں برساتے رہے۔

ہیوگو نے اٹلی کے نامور مصور Michael Angelo کی نسبت جو الفاظ لکھے تھے وہ خود اس پر عین صادق آتے ہیں۔

Years did not age him; they only enhanced his glories.

"بڑھاپا اُس پر کسی قسم کا تصرف نہ کرسکا، بلکہ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی ساتھ ساتھ اُس کا کمال بھی بڑھتا گیا۔"

---

## غبار تفریق

(از سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

ہے باغ وطن میں خس و خار تفریق  ہر پھول ہے سم خوردۂ مار تفریق
مستور ہوا جاتا ہے سب نور وطن  ہے مطلع ایماں پہ غبار تفریق

# موسم برشکال

از ماسٹر محمد زبیر صاحب روحی الہ آبادی

یہ برشکال، یہ گھٹا، یہ جوئبار یہ ہوا — یہ باغ اور یہ فضا، کوئل کا اُس پہ کوکنا
یہ جھاڑیاں ہری بھری بنی ہوئی ہیں کیا پری — ہے وادیوں میں کیا تری، ہے گھاس کیا ہری ہری
یہ نامیہ کا جوش ہے، حجر بھی سبز پوش ہیں — گلوں کی یہ شگفتگی، شجر چمن بدوش ہیں
یہ دَور برشگال ہے کہ دن ہیں یہ شباب کے — یہ سُرخ سُرخ پھول ہیں کہ جام ہیں شراب کے
ہولئے پر سُرور سے یہ شاخ گل کا جھُومتا — لچک کے سطح آب پر خود اپنا عکس چُومنا
بہار پر بہار ہے، زمین لالہ زار ہے — جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے
ہرے بھرے ہیں کھیت کیا نکل رہی ہیں بالیاں — وفورِ برگ و بار سے جھکی ہوئی ہیں ڈالیاں
ہر ایک جاندار خوش، یہ رحمتوں کا زور ہے — عجب ہے کیف بیخودی کہ محوِ رقص مور ہے
چڑھی ہوئی ہیں ندیاں بھرے ہیں جھیل تال کیا — کنول کے پھُول دیکھئے کھلے ہیں لال لال کیا
ہے کیف آفریں سماں، ہیں گوالے مست و بیخبر — بجا رہے ہیں بانسری، چرا رہے ہیں جانور
چمک دمک یہ برق کی، یہ شورِ رعد الاماں — پپیہا ہو کے مضطرب یہ کہہ رہا ہے پی کہاں
یہ شام اور چرخ پر شفق کا آہ پھُولنا — یہ کمسنوں کی ٹولیوں کا گا کے جھولا جھولنا
کنارے جوئبار کے ہے دوستوں کا جمگھٹا — نظر فریب منظروں یہ ہے ہر اک مٹا ہوا
شفق کا رنگ دیکھتا ہے کوئی چپ کھڑا ہوا — کوئی ملار گا رہا ہے گھاس پر پڑا ہوا

یہ دل لگی یہ شوخیاں لگا رہے ہیں قہقہے
کہ جیسے صحنِ باغ میں ہوں طائروں کے چہچہے



# "رام بھروسا بھاری"

(از "بھوشن")

"رام بھروسا بھاری، کچھ ملا بیٹا؟" حقہ کی چلم ایک طرف اُلٹتے ہوئے سکھو چودھری نے پوچھا
"ڈیڑھ پاؤ جو" دُکھیا آنچل سنبھال کر بولی "آج گھر کے کام سے دیر میں فرصت ملی"۔
اُداس دُکھیا اندر چلی گئی، چودھری منھ لپیٹ کر کھاٹ پر لیٹ گئے، تھوڑی دیر میں گھر کی چکّی کے ساتھ چودھری کے خرّاٹوں نے بھی سُر ملا دیا۔

---

سکھو چودھری ضرورت سے زیادہ سیدھے سادے اور ہری بھگتوں پر جان دینے والے کسان تھے، مہینے کے تیسوں دن کوئی نہ کوئی مہاتما انھیں اُپدیش دینے آیا کرتے تھے اور وہ گھر کا سارا کام کاج چھوڑ کر اُن کی خاطر تواضع میں لگ جاتے تھے، آخر مہنتوں کی سیوا ٹھہری، وہ سکھو کی ساگ روٹی اور 'چونٹے' کے شربت پر تھوڑے ہی گذر کرتے، بس دونوں وقت گرم گرم پوریاں کچوریاں بنتی تھیں، اور گانجا بھنگ کا خرچ اس کے علاوہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی رخصتی میں نقد کے علاوہ چادرہ وغیرہ بھی دینا پڑتا تھا۔ اگر اتفاقاً چودھری کا دالان کبھی ایسے مہاتماؤں سے خالی ہو جاتا تو گاؤں کا کوئی بھائی کہہ اُٹھتا "آج کئی دن سے سونا ہے بھگت؟" جب وہ اپنے نام کے ساتھ "بھگت" کا خطاب سُنتے تو انھیں اپنی تمام نیکیوں کا اجر مل جاتا اور وہ فوراً کاندھے پر مرزئی اور سر پر پگڑی رکھکر کسی مہاتما کے کھوج میں نکل پڑتے تھے۔ ایسی حالت میں انھیں اکثر ٹھگنے والے مہاتما مل جاتے تھے، لیکن اگر کوئی اِن پُرانی باتوں کا دفتر کھول کر اُن کے زخم کو ہرا کرنا چاہتا تو وہ فوراً "رام بھروسا بھاری" کہکر ٹال دیتے تھے۔

چودھری کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی، لڑکے کا نام بھولا تھا۔ پہلے اُنھوں نے اُسے پڑھانا چاہا، لیکن جب سے اُس کے خیالات مفت خور سادھوؤں کے خلاف ہو گئے اُنھوں نے اُس کی پڑھائی بند کردی۔ بھولا کو اپنے گھر کی دولت لُٹتے دیکھکر دلی صدمہ ہوتا تھا۔ چودھری کو

یہ فکر دامنگیر تھی کہ اُن کے بعد بزرگوں کے نام کو زندہ رکھنے والا کوئی نہ رہے گا، اسی غم سے وہ اکثر نالاں رہتے تھے۔ لیکن اس قسم کی پریشانیوں کو وہ سادھوؤں کے ساتھ گانجے کی چلم پر رکھکر ایک ہی کنش میں اُڑا دیا کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ جب چودھری کی جیب خالی ہوئی تو کھانے والے مہاتماؤں کی آمدورفت بھی کم ہونے لگی، کچھ دنوں میں یہ نوبت پہونچی کہ اُنھیں معمولی بھگتوں کو گانجا پلانے ہی پر قناعت کرنا پڑا۔ مفلسی کے زمانہ میں دیگر خاطرداریاں اُن کے لئے مشکل ہوگئیں۔ لیکن جب کوئی بھولا بھٹکا بیراگی اُن کے دروازے پر سیتارامؔ کی صدا لگاتا تو وہ اُسے ایک چلم گانجا ضرور پلا دیتے اور اگر کوئی مہاتما ضد کرتا اور اُن کی پرانی عظمت یاد دلاتا تو بچارے بھگت کو آٹا دال کا بھی انتظام کرنا پڑتا تھا۔

اِس مصیبت میں اگر کوئی سُکھّو کا شریک تھا تو اُن کی لڑکی دُکھیا تھی۔ دادا کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھکر اُس نے بکری پالنے کا روزگار شروع کیا۔ پاؤں کے کڑے بیچ کر دو تین چار بکریاں مول لے آئی۔ دودھ اور بکریوں کو تو وہ یونہی فروخت کر دیتی تھی لیکن بکروں کے بیچنے میں اُسے کسی قدر سوچنا سمجھنا پڑتا تھا۔ اس لئے اُنھیں وہ اُسی وقت فروخت کرتی تھی جب اُنھیں کوئی 'کالی مائی' یا 'دُرگا دیوی' کے نام پر چھوڑنے کے لئے لے جاتا۔ لیکن چودھری کو اس تجارت سے نفرت تھی۔ آفت یہ تھی کہ وہ بکریوں کو دُوہنے نہ دیتے اور بکرا بیچنے کے تو وہ بالکل خلاف تھے۔ ایک مرتبہ گانوں کے باہر ایک بکرا بیچنے کی پاداش میں اُنھوں نے دُکھیا کے ہاتھ کا پانی پینا چھوڑ دیا۔ لیکن جب وہ کچھ دنوں کے بعد گھوم پھر کر اپنے گانوں میں آگیا تو چودھری کو اطمینان ہوا، تب سے گاؤں کے باہر بکرا بیچنے کی دُکھیا نے قسم کھالی۔

اس طرح غریب دُکھیا اپنی حالت سنبھالنے کی کوشش میں لگی رہتی، مگر مشکل یہ تھی کہ چودھری آج کے سوا کل کا کبھی خیال ہی نہ کرتے تھے۔ اس لئے گھر کا خرچ چلانے کے لئے اُسے کبھی کبھی دوسروں کی مزدوری بھی کرنی پڑتی تھی۔

(۲)

سُکھّو چودھری کا گھر لاکھاپور کے زمیندار جگت سنگھ کے پڑوس میں تھا۔ جگت سنگھ کے باپ لاکھوں روپئے کی جائداد اور ہزاروں روپیہ نقد اکٹھا کرنے پر بھی نام پیدا نہ کر سکے۔ وہ روپیہ کو اپنی جان اور بددیانتی کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ لیکن جگت سنگھ کی جدت پسند

طبیعت نے وہ جوہر دکھائے کہ اُن کا دائرۂ شہرت اپنے باپ سے سیکڑوں نہیں ہزاروں گنا وسیع ہوگیا۔ گھر پر تو وہ مطلق گوشت نہ کھاتے تھے لیکن جب دوسروں کے ساتھ کسی تقریب میں شامل ہوتے تو بغیر گوشت کے ایک نوالہ بھی نہ اُٹھاتے اور روز کی کسر ایک ہی دن میں نکال لیتے تھے۔ خاصکر جب اُنھیں کسی برات میں جانا پڑتا تو گوشت کے بغیر وہ ناشتہ بھی قبول نہ کرتے تھے، اور جب لوگ اُن کی منت وسماجت کے لئے حاضر ہوتے تو وہ اس قدر ناخوشی ظاہر کرتے گویا گوشت کے بغیر اُنھیں کھانا ہی ہضم نہ ہوگا۔ اچھے بکروں کی علامتیں بتلانے میں وہ ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ لوگوں کو اُن کی واقف کاری اور تجربہ پر حیرت ہوتی تھی۔ جس برات میں وہ شامل ہوتے شور مچ جاتا تھا کہ لاکھاپور کے جگت سنگھ آئے ہیں، آدمی نہیں دیو ہے، کھڑا خصّی کھا جاتا ہے، ایک نمبر کا شوقین ہے، جان بوجھکر ساتھ والوں کے لئے دوچار بوٹی چھوڑدے تو دوسری بات ہے۔ اگر کسی موقع پر میزبان ہلاکت جان اور ایذا رسانی کے خیال سے بکرا دینے میں عذر کرتا تو اُنھیں خود دام دیکر چارچھ بکرے منگا لینے میں تامل بھی نہ ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ اپنے ہمراہیوں کو بھی شامل کرلیا کرتے تھے، اور اگر اتفاقاً کچھ بچ جاتا تو اُسے دوسرے دن کے لئے رکھ چھوڑتے تھے۔ بکروں کو وہ خود ذبح کرتے اور اسی لئے ہمیشہ اپنے پاس ایک اچھی تلوار رکھتے تھے۔ اس طرح اُن کا نام براتوں میں ناچنے والے بھانڈوں کی زبان پر بھی آنے لگا اور اُن کی شہرت سے دورونزدیک کے مواضعات گونجنے لگے۔

مگر آس پاس کے دیہاتوں میں جگت سنگھ سے بھی زیادہ کسی کو فروغ حاصل ہوا تو سکھو چودھری کو۔ اُن کو لوگ چودھری اور بھگت دو خطابوں سے پکارتے تھے۔ اُن کی بھگتی اور ایثار نے اُنھیں جگت سنگھ کا مدمقابل بنادیا تھا۔ پہلے تو کئی مرتبہ جگت سنگھ نے کنایتہً سادھوؤں کو چور بدمعاش کہہ کر چودھری کو سمجھایا کہ اگر وہ بدمعاشوں کو اس طرح گاؤں میں بلائیں گے تو اُن کو سزا ہوجائیگی، لیکن جب بھگت کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہے تو انجام کار ٹھاکر کو اپنا ہتھیار اُٹھانا پڑا، وہی ہتھیار جس کا نام سُنکر چودھری کی لٹی لوٹی کانپ جاتی تھی۔

چودھری کے ذمہ جگت سنگھ کے سواسات آنے لگان کے باقی تھے جوادا نہ ہوسکے تھے اُنھوں نے اپنے بھائی رام سنگھ سے کہا کہ یا تو سکھو سے لگان لاؤ یا اُس کا بکرا چھین لاؤ۔

رام سنگھ جگت سنگھ کا جانشین بنا جاتا تھا، آدمی نہیں پورا شیطان تھا، کڑک کر مانگا، بیچارا چودھری تو گھبرا گیا، مگر دکھیا اٹھی اور ایک چمکتی ہوئی اٹھنّی پھینک کر بولی "تین پیسے دیتے جاؤ" رام سنگھ سٹ پٹا گئے، بھگت کی لاج رہ گئی، منھ سے تو کچھ نہ کہا لیکن چہرے کی شگفتگی نے دکھیا کی دور اندیشی کی داد دی، اور شاید یہ پہلا موقع تھا جب روپے پیسے کے معاملے میں وہ دکھیا سے خوش ہوئے۔ وہ اس مدد کو تائیدِ غیبی سمجھکر عقیدت کے سرور میں چلّا اٹھے "رام بھروسا ہماری، ہری راکھو لاج ہماری"۔

(۳)

عام خیال ہے کہ حکام کی نظر ماتحتوں کی غلطی پر ضرور پڑ جاتی ہے۔ اگر کوئی زمیندار رعایا میں سے کسی شخص کو پھنسانا چاہتا ہے تو اس کی تمام خوبیوں کے باوجود اس کے عیبوں کو اس طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح صاف و شفاف پانی میں کنکر پتھر آسانی سے دکھائی پڑتے ہیں، یہ مشہور ہے بُرائی نہیں چھُپتی، بادشاہ ملک کا اور زمیندار گاؤں کا پرمیشور ہے۔

دنیا کی تمام آفتیں غریبوں ہی کے دامن میں پرورش پاتی ہیں، زمیندار جگت سنگھ سے کھٹ پٹ ہونے کے بارھویں دن بھگت کا چالان ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن ایک سادھو اُن کے یہاں آکر ٹھہرا صحبت کے ساتھ ساتھ رات بھر ہری بھگتوں کی چلم بھی گرم رہی۔ سویرے انسپکٹر صاحب آبکاری پولیس کے آدمیوں کی مدد سے اُن کو پکڑے گیا۔ پولیس نے کچھ گانجا بھی برآمد کیا کسی سے کچھ کرتے دھرتے نہ بن آیا، لال پگڑی والوں کو دیکھکر لوگوں کا دم نکل گیا۔ بھولا دیکھتا ہی رہ گیا بھگت کی مدد کے لئے جو لوگ ہمیشہ لاٹھیوں میں تیل لگایا کرتے تھے وہ بھی اُس دن دکھائی نہ پڑے خود بھگت کے منہ سے حسب معمول "رام بھروسا ہماری" بھی نکل نہ سکا۔ گنہگار کا ساتھ ایشور بھی چھوڑ دیتا ہے۔

چودھری سیدھے سادے آدمی تھے، عدالت کا رعب اور جلال بھی اُنھیں سچائی سے نہ ہٹا سکا اُنھوں نے سب کچھ صاف صاف بیان کر دیا۔ بہر در حاکم نے قانون سے مجبور ہو کر اُنھیں تین ماہ کی سزا کا حکم سُنا دیا۔

چودھری نے سر نیچا کر لیا، آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اُن کے خاندان میں کسی کی اتنی درگت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن چاہے جو ہو اُنھوں نے ایک بھگت کا دھرم نباہا۔ اُن کا سر اگر خم بھی ہوا تو اپنے ہی گناہ سے، کسی کے رعب سے نہیں۔

بھولا اور دکھیا بلکہ گاؤں کے سبھی آدمی روتے ہوئے عدالت کے کمرے سے نکل آئے
دکھیا، دادا پر جان دینے والی دکھیا بھی کچھ نہ کر سکی۔

(۴)

لیکن آہ! اے بیکسوں کی آہ تو کبھی خالی نہیں جاتی، تو ان لوگوں کی لاٹھی ہے جن کے پاس کوئی ہتھیار نہیں، عورتوں کے دل کی سب سے زبردست طاقت ہے۔ اگر کوئی اُن سے محبت کرتا ہے تو تیرا نام مہر ہے اور اگر کوئی انھیں بے وجہ چھیڑتا ہے تو قضا و قدر کا بے پناہ قہر بن جاتی ہے۔ ظالم کی خونخوار تلوار بھی تیری ایک آنچ سے پگھل جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت تیرا وار نہیں روک سکتی۔

جگت سنگھ نے چودھری کے طرفداروں کو ستانا شروع کیا، یہاں تک نوبت پہونچی کہ سارا گاؤں بگڑ کر انھیں کو پھنسانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ بھولا نے ایسا جال بچھایا کہ تیر بہدف ثابت ہوا۔ کالی مائی کے نام پر چھوڑا ہوا بکرا گم ہو گیا، گاؤں والوں نے ملکر جگت سنگھ پر چوری کا مقدمہ چلوا دیا۔

کنجوس اور منحوس آدمی سے کوئی خوش نہیں ہوتا ہے، جب کبھی لاکھا پور میں حاکموں کا پڑاؤ پڑتا تو چپراسیوں کو جلسں وغیرہ کے لئے غریبوں کی گردن دبانی پڑتی تھی، جگت سنگھ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ مگر اب جگت سنگھ کو مقدمے کے خیال سے ہر ایک کی خاطر مدارات کرنی پڑتی اور مقدمہ کی پیروی کے لئے جانا پڑتا تو تین تین روپیہ کے پیادے اور روز کے گڑگڑانے والے چپراسی ڈانٹ بتا دیتے تھے۔ بہر حال کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، مذہبی معاملہ تھا عدالت بھی کوئی رورعایت نہ کر سکی۔ پندرہ دن کی قید اور پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا ملی جو اپیل سے بھی بحال رہی۔

جب جیل میں جگت سنگھ اور چودھری سے پہلے پہل ملاقات ہوئی تو اُن کا کلیجہ سن سے ہو گیا، گاؤں والوں کی معاملہ بندی اُن سے چھپی نہ رہ سکی، تاہم وہ ٹھاکر سے ذرا بھی برگشتہ نہ ہوئے۔ دراصل وہ اس قید کو اپنے جرم کی سزا سمجھتے تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ جتنی سزا اس دنیا میں بھگت لینگے اتنا ہی زیادہ انھیں عاقبت میں آرام ملیگا۔ غرض ان باتوں کو وہ برما تما کا راز سمجھتے تھے جنمیں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور چھپی رہتی ہے۔ انھوں نے ٹھاکر کے چہرہ پر غم آلود نظر ڈالی جگت سنگھ سے ضبط نہ ہو سکا چودھری بھی رونے لگے۔

اس دن سے چودھری اپنا کام کر چکنے کے بعد جگت سنگھ کے کام میں بھی مدد دیا کرتے تھے۔ اُن کی ہمہ گیر طبیعت نے جیل میں بھی کافی ہمدرد پیدا کر لئے تھے۔ یہاں زیادہ تر وہ اس

کوشش میں رہے کہ اُن کو اور ٹھاکر کو ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کا کام دیا جائے۔ بہرحال ٹھاکر جگت سنگھ چودھری سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دیے گئے۔

(۵)

کچھ دنوں بعد چودھری اپنے جرم کی سزا کاٹ لینے کے بعد رہا کر دئے گئے۔ رات کا وقت تھا ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ بادلوں میں کبھی کبھی بجلی اس طرح چمک اُٹھتی تھی جیسے تاریکی میں کالے منہ کے دانت۔ گاؤں میں چاروں طرف سناٹا چھایا تھا، لیکن بھگت کے گھر سے روشنی کی شعاعیں نکل کر آنیوالے کا خیر مقدم کر رہی تھیں، بھولا اور دُکھیا دونوں کو دادا کے چھوٹنے کا دن معلوم تھا لیکن اس وقت دونوں بے خبر تھے، بھولا دیر تک جاگنے کے بعد سو گیا تھا اور دکھیا اونگھ رہی تھی۔

جس دن چودھری کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا اُسی دن اُنھوں نے اپنے گھر کو اُجڑا ہوا سمجھ لیا تھا۔ لیکن اُمید کی کرنوں نے اُن کے دل کو روشن کر دیا، وہ اپنے بچّوں کو گلے لگانے کے لئے بے تحاشا دوڑے۔ لیکن دروازے کے پاس آ کر یکایک رُک گئے جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو اُن کے قدم رُک گئے، جیسے کسی نے اُن کے پیر پکڑ لئے ہوں۔ اُن کی بدنامی ہو چکی تھی، غیرت نے اُنھیں اجازت نہ دی کہ وہ پھر اپنا منہ کسی کو دکھائیں۔ وہ چور کی طرح چپ چاپ دروازے کے پاس کھڑے تھے، اُس چور کی طرح جو لوگوں کو جاگتے دیکھکر نہ تو نقب لگاتا ہے اور نہ دھن دولت کا لالچ اُسے بھاگنے ہی دیتا ہے۔

آخر کار ممتا غیرت انسانی پر غالب آ گئی اور چودھری نے دروازہ پر ڈرتے ڈرتے ایک ہلکا سا دھکا دیا، دُکھیا "ہوں" کر کے رہ گئی، وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

اب کی بار بھگت نے زور سے کنڈی کھٹکھٹائی، بھولا اور دُکھیا دونوں جاگ اُٹھے۔ دُکھیا نے جھٹ کواڑ کھول دیے، وہ دادا کو دیکھکر رونے لگی، بھولا اُسے دلاسا دینے لگا لیکن بے سود، اُس کے آنسو تھمنے والے نہ تھے۔ وہ تین مہینے سے ضبط کئے بیٹھی تھی، اُسے معلوم تھا کہ میرے آنسوؤں کو لوگ مالی مشکلات پر محمول کر کے دامے درمے میری مدد کریں گے اور یہ بات اس کے دادا کی بدنامی کا باعث ہوگی۔

بھگت بھوک سے بیتاب ہو رہے تھے، تھوڑی دیر کے بعد اُنھوں نے بھولا سے کہا "بیٹا کچھ کھانے کو لاؤ" دُکھیا کے آنسو تھم گئے، ہو کھی روٹی اور نمک لا کر اُس نے دادا کے سامنے

رکھدیا۔ اور قدرے شرما گئی جیسے کوئی میزبان اپنی بے سرو سامانی کی وجہ سے اپنے مہمان کے آگے شرمندہ ہو۔

چودھری نے "رام بھروسا بھاری" کہکر نوالہ اُٹھایا ہی تھا کہ اچانک باہر سے کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ چودھری چونکتا ہو گئے۔ دُکھیا گردن اُٹھا کر دیکھنے لگی، بھولا چارپائی سے کود کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"چودھری؟"

"ہاں بھیا"

رات کی تاریکی میں ایک دیو پیکر شکل آگے بڑھی۔ "کب آئے؟"

آواز پہچانی ہوئی معلوم ہوئی، چودھری اُٹھکر کھڑے ہو گئے، آنکھوں پر زور دیکر دیکھا جگت سنگھ آرہے ہیں۔

"کون ہے؟" پاس کی لاٹھی اُٹھاتے ہوئے بھولا نے کڑک کر پوچھا۔

"تو ہی...... ابھاگا" یہ کہہ کر جگت سنگھ چودھری سے لپٹ گئے۔

دُکھیا نے دوڑ کر چراغ کی بتی اُکسائی، بھولا نے لاٹھی چلادی ہوتی لیکن اُس نے دیکھا کہ چودھری اور جگت سنگھ دونوں گلے ملے ہوئے رو رہے ہیں، اُن کے آنسو سچے پریم کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ اِس راز کو نہ سمجھ سکا۔

ہاں اس راز کو گاؤں کا کوئی آدمی بھی نہ سمجھ سکا۔ اُس دن سے چودھری اور ٹھاکر کو لوگ ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور بات چیت کرتے دیکھکر حیران رہ جاتے تھے۔ جب اس کی بابت کوئی چودھری سے کچھ پوچھتا تو وہ اُسے ہری کی مایا کہہ کر عقیدت کے سرور میں چلّا اُٹھتے تھے۔

"رام بھروسا بھاری، ہری راکھولاج ہماری"

## رُباعی

(از مسٹر گنگا دھرناتھ فرحت کانپوری)

عشق کی مستیوں میں ہستی کیسی | بت پرستی میں خود پرستی کیسی
بیخودی نے شراب دی ہے ایسی | بھولا نہ جہاں کو میں تو مستی کیسی

# تزئینِ حیات

(از جناب سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے)

شبِ دیجور کو دی نور کے لشکر نے شکست
گونج اُٹھی غیب کے پردے سے جب آوازِ الست

رقص ہونے لگا گانے لگے بل کر افلاک
وجد میں آکے لگانے لگے چکر افلاک

ماہِ تاباں بھی چلا جشن کا لیکر پیغام
چشمکیں کرنے لگے ملکے ستارے بھی تمام

اور خورشید بھی اعلانِ ازل سُن کے چلا
تاج کرنوں کا پہن کر سوئے مشرق نکلا

کرۂ خاک نے بھی نغمۂ الفت گایا
اور اس لحن پہ اشجار کو بھی وجد آیا

اور دبے پاؤں نسیم سحری بھی آئی
شاخِ گل جاگ اُٹھی غنچوں نے لی انگڑائی

پھول کھلنے لگے خوشبو سے ہوا مست ہوئی
لیکے پھولوں کی مہک جانبِ فردوس اُڑی

عرشِ اعظم کا ہلانے لگی پایا جا کر
قدسیوں نے اُسے روکا بھی بہت سمجھا کر

ناگہاں غیب کے پردے سے سنی سب نے صدا
آنے دو لائی ہے دنیا سے یہ پیغام ”بلیٰ“

زندگی خاک کے پتلوں میں اِسی سے ہوگی
ہم مسیحا نفس اس کو بھی بنائیں گے کبھی

# اشعار

فصل دیوانوں کی آئی شور ہے زنجیر کا
کھیل ہوگا اے جنوں دستِ گریباں گیر کا

کیا ہوا دل، کیا ہوا دل عاشقِ دلگیر کا
وہ تو پہلا ہی نشانہ تھا کسی کے تیر کا

حسن تھا پہلا نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
عشق پر آکر رکا یہ سلسلہ تحریر کا

رنگ چھایا ہے بسنتی ہر طرف گلزار پہ
سامنے پھرتا ہے نقشہ یار کی تصویر کا

باغباں پھولی ہے کیا آنکھوں میں سرسوں اندنوں
تو جسے سمجھا ہے غنچہ ہے وہ پیکاں تیر کا

بلبلوں نے نوچ ڈالے اپنی منقاروں سے پر
اب بھی دیکھیں گل کرشمہ عشق کی تاثیر کا

کس طرح دنیا نبھی اور زندگی کیسے کٹی
ہم جسے سمجھے تھے ہستی دام تھا تزویر کا

عیش و راحت کیلئے کیں کاوشیں دل نے بہت
اب کوئی پہلو نظر آتا نہیں تدبیر کا

کوئی واعظ کوئی زاہد کوئی ناصح کوئی رند
تھا ہمیں مقبول ہونا خاکِ پا شبیر کا

# تنقید کتب

## دیوان مومنؔ[1]

اُس وقت جب دہلی میں سلطنت مغلیہ کی شان وشوکت کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا اور بہادر شاہ ظفر بادشاہ اہل کمال کی برائے نام سرپرستی کا فرض ادا کر رہے تھے اور لال قلعہ میں شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے اُردوئے معلیٰ کی محفل ادب تین باکمالوں کے دم سے روشن تھی جو کہنے کو تو اُردو کے شاعر تھے لیکن ان میں سے ہر ایک نے اقلیم سخن میں اپنی اپنی سلطنت کے حدود علٰحدہ علٰحدہ قائم کر لئے تھے (۱) ذوقؔ (۲) غالبؔ اور (۳) مومنؔ، ذوقؔ کی حکومت سلاست زبان اور محاورات پر تھی، غالبؔ کے قلمرو میں فلسفہ و تصوف داخل تھے، اور مومنؔ تعشق و تغزل پر حکمرانی کرتے تھے۔ اور ان اصناف میں جو کچھ بھی آجکل نظر آرہا ہے وہ زیادہ تر انھیں باکمالوں کی تقلید ہے۔ اِن میں سے ذوقؔ کے نام کو ان کے تلامذہ شمس العلما آزادؔ اور نواب داغؔ نے روشن کیا، غالبؔ مرحوم کو شمس العلما حالیؔ اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اُجاگر کیا۔ لیکن مومنؔ جو تعشق و تغزل پر فرمانروائی کرتا تھا اب تک کس مپرسی اور قعر گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔

مولانا ضیاء احمد صاحب ضیاؔ ایم۔ اے۔ بدایونی لکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا اُردو ادب پر احسان ہے کہ اُنھوں نے بڑی محنت وجانفشانی سے مومنؔ کا دیوان کامل تصحیح، واضح تشریح اور ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

جہانتک مقدمہ کا تعلق ہے فاضل مرتب نے تحقیق حالات اور تنقید کلام میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے۔ اس مقدمہ کا حصہ ب وج خاص طور پر قابل داد ہے جن میں مومنؔ کے کلام پر ناقدانہ بحث اور اُن کے معاصرین سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اِس سلسلہ میں فاضل مؤلف کا قول فیصل قابل دید ہے:-

"یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور نُدرت اسلوب میں کوئی اُستاد مشکل سے مومنؔ کا ہمسر ہوگا۔ نازک خیالی کی صفت میں البتہ غالبؔ اُن کے شریک ہیں، مگر دونوں کے کلام کے مطالعہ

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ۲۶+۲۰ + ۳۶۸ صفحوں کی ضخامت۔ عمدہ جلد قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: شانتی پریس الہ آباد۔

کرنیوالوں پر یہ صداقت آشکار ہوگی کہ مومن اس میں ان سے سبقت لے گئے ہیں۔ پھر دونوں کی تخئیل کا میدان مختلف ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ غالب کا کلام منتخب ہے اور مومن کو یہ موقعہ نہیں ملا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ ان کا کلام شعر کے تمام اصناف پر حاوی ہے اور اس میں ایک طرف نازکخیالی کے جلوے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف معاملہ بندی کے۔"

اس مقدمہ میں ایک بات ضرور کھٹکتی ہے یعنی بعض الفاظ ایسے استعمال ہوگئے ہیں جو غیرمانوس اور ثقیل ہیں: مثلاً: توغل۔ تقشف۔ بضاعت مزجاۃ۔ محتوی۔ بالاستیعاب۔ ژرف نگاہی۔ وغیرہ۔

مومن کے جتنے کلیات قلمی یا مطبوعہ ہندوستان میں ملتے ہیں وہ کاتبوں کی غلطیوں کے باعث اس قدر مسخ ہوگئے ہیں کہ مومن کا کلام کچھ سے کچھ ہوگیا ہے۔ مگر فاضل مؤلف نے نہایت عرقریزی سے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے حتی المقدور صحیح کلام شائع کیا ہے، مثلاً عام نسخوں میں یہ شعر ملتا ہے:۔

سر شکِ اعتراضِ عجز نے الماس ریزی کی جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

حالانکہ پہلے مصرعہ میں "اعتراض" بالکل غلط ہے اس کی جگہ "اعتراف" چاہیئے۔ یا اسی طرح اس شعر میں

خواہشِ مرگ ہوا فسانہ سنانا ورنہ دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

پہلے مصرعہ میں "افسانہ سنانا" کے بجائے "اتنا نہ ستانا" چاہیئے وغیرہ۔

غرض لائق مؤلف نے اس طرح کی سوا دو سو کے قریب غلطیاں درست کی ہیں جو ان کی جانفشانی اور دردسری کا بہترین ثبوت ہے۔ آخر میں ایک مکمل غلطنامہ بھی اس کتاب میں لگا دیا گیا ہے۔ جس کی بدولت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ صحیح مجموعہ کلام مومن کا اس وقت موجود نہیں ہے۔

تشریح کا کام ہمیشہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات شاعر کے کلام میں الفاظ کی ایسی الٹ پھیر ہوتی ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ فاضل مؤلف نے اپنے تشریحی نوٹوں میں بہت کافی داد سخن فہمی دی ہے۔ مثلاً:۔

نہ یہ دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کیشاں کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حیرت کا

تشریح: مانا کہ دستِ جنوں دیوانوں کی جیب کو چاک کرسکتا ہے، مگر نہ دستِ مژہ دستِ جنوں ہوسکتا ہے نہ پردۂ چشمِ حیرت جیبِ اہلِ جنوں۔ لہذا دستِ مژہ سے اس پردہ کا چاک ہونا محال، مژہ (پلک) کو دست سے تشبیہ دی ہے۔ حیرت سے مراد وہ حیرانی ہے جو عارف پر تجلیات الٰہی سے طاری ہوتی ہے۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری　　چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

تشریح:- اگر علاج ہوا تو درد جاتا رہیگا، لیکن چونکہ درد، جان کے عوض تمام جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے اس لئے درد کا زائل ہونا اور جان کا جانا مترادف ہونگے۔

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اُٹھانے پر　　سُبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا

تشریح:- جو شخص تیری طبع نازک پر گراں نہ ہو (یعنی غیر) وہ حقیقت میں سبک ہے۔ شاعر نے یہاں سُبک دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے، یعنی ذلیل، اور اس طرح اپنے دل کو تسلی دی ہے۔ سُبک اور گراں کا تقابل ظاہر ہے۔

بل بے عیاری عدو کے آگے وہ پیماں شکن　　وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

تشریح:- وہ وعدہ خلاف جو ایکبار وعدہ خلافی کر چکا تھا آج پھر مجھ سے وعدۂ وصل کرتا تھا اور خجل ہوا جاتا تھا۔ اس میں عیاری یہ تھی کہ میں سمجھوں کہ پچھلی پیماں شکنی پر شرمندہ ہے اور عدو سمجھے کہ عاشق سے وعدہ کرکے شرمسار ہے۔

کیا اس نے قتل جہاں اِک نظر میں　　کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

تشریح:- یعنی سب ایک ساتھ ہلاک ہوگئے، عاشق کو قتلِ جہاں کا اس قدر خیال نہیں جس قدر اس امر کا کہ قاتل کو سفاکی کی اچھی طرح داد نہ ملی۔

ان نمونوں کے پیش کرنے سے ناظرین کو تشریح اشعار کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہوگا لیکن بعض اشعار کی شرح مؤلف نے ایسی کی ہے جس سے ہم کو اتفاق نہیں ہے مثلاً:-

دعویٰ تکلیف سے جلاّد نے　　روز جزا قتل پھر اپنا کیا

اس شعر کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ ہم نے قیامت میں معشوق پر دعویٰ کیا کہ اس نے ہمیں قتل کرکے تکلیف دی تھی۔ اس ستم ظریف نے پھر قتل کر دیا کہ تکلیف کا احساس باقی نہ رہے۔ لیکن اگر شعر کے پہلے مصرعہ میں "سے" کے بجائے لفظ "پہ" ہوتا تو فاضل مؤلف کی شرح صحیح تھی یعنی ہمارے دعویٰ قتل کرنے پر معشوق نے ایسا ایسا کیا۔ لیکن یہاں لفظ "سے" ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعویٰ کرنے والا عاشق نہیں بلکہ معشوق ہے۔ لہذا اس شعر کا صحیح مطلب یہ ہوگا کہ حشر کے دن چاہئیے تو یہ تھا کہ ہم اپنے قتل کا معشوق پر دعویٰ کرتے۔ لیکن اس چالاک نے الٹا دعویٰ ہم پر ڈانٹ دیا کہ یہ عاشق اس قدر سخت جان تھا کہ اس کے قتل کرنے میں ہم کو تکلیف ہوئی۔ گویا معشوق نے حشر کے دن بھی ہمارا خون کیا:-

جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے — راز مرا صبر نے افشا کیا

اِس شعر کی شرح یہ کی گئی ہے کہ میں نے ظلم یار پر صبر کیا کہ پردۂ عشق فاش نہ ہو، مگر اُلٹا راز کھل گیا اور لوگ کہنے لگے کہ غضب ہے مومنؔ اس قدر جور پر شکوہ نہیں کرتا" کچھ تو ہر جس کی پردہ داری ہے۔"

ہمارے خیال میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ میں معشوق کے ظلم وجور کا شکوہ نہیں کرتا۔ اس سے وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ عاشق خوگر ظلم وستم ہوگیا ہے۔ اس لیے وہ مجھ پر اور بھی ظلم کرتا چلا جاتا ہے۔گویا میرے ضبط نے میرے خوگرِ ستم ہونیکا راز فاش کردیا۔جو راز فاش ہوا ہے وہ ہمارے نزدیک "راز عشق" نہیں ہے، بلکہ "ضبطِ ستم" کا راز ہے۔

دُر و یاقوت کی پھر غیر پہ فرمائش ہے — جوہری کی تو دکاں چشم گہر بار لگا

اِس کی شرح یہ کی گئی ہے کہ اے موتی برسانے والی آنکھ جوہری کی دکان لگا یعنی اس قدر رو کہ دکان لگ جائے اور تیرے اشکوں کی گہر افشانی دُر و یاقوت کی قدر وقیمت معشوق کی نظر سے گرادے۔

ہمارے خیال میں جوہری کی دکان لگانے سے دُر یاقوت کی قدر وقیمت گھٹانا مقصود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ رقیب اس کی فرمایش بھی پوری کرے تو اپنی دکان سے کرے۔اپنی دکان کی موجودگی میں معشوق کو رقیب سے فرمایش کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

خیر اِن جزوی اختلافات کے باوجود اس کتاب کی ترتیب میں فاضل مؤلف نے بڑی محنت کی ہے اور یہ اس قابل ہے کہ قدر دانان مومنؔ اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں۔

## نغمۂ کہسار[1]

۲۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو بزم اُردو شملہ کے اہتمام سے ایک شاندار مناظمہ سید رضا علی صاحب وحشتؔ سی۔بی۔ای ممبر کونسل آف اسٹیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں ملک کے مشہور شعرا اردو کو مدعو کیا گیا تھا اب انجمن مذکور نے کوشش کرکے اٹھائیس شعرائے نامور کا کلام ایک خوبصورت گلدستہ کی صورت میں شائع کردیا ہے۔سب غزلیں غیر طرح ہیں اور بعض شعرا کی غزلیں ایک سے زیادہ بھی ہیں۔شروع میں تنویر صاحب کی لکھی ہوئی ایک تمہید بھی ہے جس میں بزم اُردو شملہ کی تاریخ اور اُس کے اغراض ومقاصد درج کئے گئے ہیں۔آخر میں جن بزرگوں نے چندہ عطا کیا ہے اُن کے اسماء گرامی لکھے ہیں۔

[1] چھوٹے سائز پر چار جزو کی ضخامت۔لکھائی چھپائی معمولی۔کاغذ اچھا۔قیمت پانچ آنہ۔ملنے کا پتہ: (۱) ٹوٹی کنڈی شملہ (۲) دفتر روزنامہ شمس ملتان شہر۔(۳) رائل ایجوکیشنل بکڈپو۔جامع مسجد۔دہلی۔

# عالمِ نسواں

پچھلے پچیس سال کے اندر زیرِ تعلیم لڑکیوں کی تعداد پہلے سے آٹھ گنی ہوگئی ہے۔ مثلاً ۱۹۱۰ء میں آٹھ لاکھ لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں مگر ۱۹۳۲ء میں پینسٹھ ۶۵ لاکھ ہوگئیں۔ یہ اضافہ زیادہ تر ابتدائی جماعتوں میں ہوا ہے۔ اعلیٰ جماعتوں میں ترقی کا حساب یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء میں تین سو انہتر ۳۶۹ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم پا رہی تھیں مگر ۱۹۳۳ء میں ان کی تعداد دو ہزار نو سو چھیاسٹھ ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب طبقۂ نسواں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لایق اُستانیاں آسانی سے مل جاتی ہیں۔

عورتوں کی بیداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اب ان میں جسمانی ورزش کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے چنانچہ آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے پچھلے اجلاس کانپور میں گجرات اور ریاست بڑودہ کی لڑکیوں نے آکر ورزش کے قابلِ تعریف کرتب دکھائے تھے۔

تعلیم یافتہ عورتوں کو ملازمت کرنے میں پہلے جو جھجک تھی وہ بھی اب بہت کچھ دور ہوگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ ملک کے تمدنی حالات میں انقلابِ عظیم رونما ہو رہا ہے۔ چنانچہ معزز اور خوشحال گھرانوں کی عورتیں بھی محکمۂ تعلیم اور ڈاکٹری میں ملازمت کرنا ذلت نہیں سمجھتیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس انقلاب کی تہ میں آزادی کا روز افزوں جذبہ اور اقتصادی حالات بھی کام کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ موجودہ تعلیم کا لڑکیوں کی تندرستی پر بہت خراب اثر ہو رہا ہے۔ ماہرینِ تعلیم کو اسکی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

آجکل اٹلی کی طرف سے ملک حبش پر فوج کشی کی جو دھمکی دی گئی ہے اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ آدیس ابابا پایۂ تخت حبش میں عورتوں نے سبز و زرد رنگ کے قومی جھنڈے لیکر نہایت جوش و خروش کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہاں کی شہزادیاں، امیرزادیاں اور متوسط طبقہ کی عورتوں نے ایک جلسۂ عام میں حبش کی آزادی کی حفاظت میں مردوں کے ساتھ دوش بدوش شریک جنگ ہونے کا عزم کیا ہے۔

تعلیم نسواں کی بدولت عراق کی عورتوں میں بھی حبِ وطن کی تحریک بہت زور شور کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ اور اب وہ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے مردوں کے ساتھ لڑنے کے لئے فوج میں بھرتی ہونے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اور عراق کی پچاس ہزار عورتیں میدان جنگ میں مقتولین و مجروحین کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

---

ایران میں پردہ کے خلاف سب سے پہلے شاہی خاندان کی عورتوں نے پیشقدمی کی۔ یعنی رضا شاہ پہلوی شاہ ایران کی شہزادیاں (شاہ دخت عمر ۱۸ سال اور ماہ دخت عمر ۱۷ سال) شاہی اجازت سے گھوڑوں پر سوار ہو کر مع حشم و خدم بے نقاب سیر کو نکلتی ہیں، ان کا لباس یوروپین ہوتا ہے۔

---

حال میں زہرہ حیدری بیگم صاحبہ نامی ایک ایرانی خاتون لندن پہونچی ہیں جو حکومت ایران کے شعبۂ فنون لطیفہ اور پبلک ورکس میں کام کر چکی ہیں۔ یہ پہلی ایرانی خاتون ہیں جو بے پردہ یوروپ کا سفر کر رہی ہیں۔ آپ کو انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔ آپ نے اس امر کی بھی تصدیق کی ہے کہ اب ایران سے پردہ اُٹھ گیا ہے مغربی وضع کے علوم و فنون کے زنانہ مدرسے کھل گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب عورتیں فن پرواز بھی سیکھ رہی ہیں۔

---

بڑودہ چمن بائی زنانہ انڈسٹریل ہوم کی بدولت بہت سی عورتیں کام سیکھ کر وجہ معاش سے بے فکر ہو گئی ہیں۔ اس ہوم میں عورتوں کو کپڑا سینا، بیل بوٹے، بیل بُننا، جلد سازی اور دیگر کام سکھائے جاتے ہیں۔ اس ہوم کی کامیابی دیکھکر ریاست کی طرف سے جگہ جگہ اسی قسم کے اسکول قائم کئے جا رہے ہیں۔

---

تقریباً نصف صدی ہوئی جب لیڈی ڈفرن نے ہندوستان میں زنانہ اسپتالوں کی بنیاد ڈالی تھی اُس وقت ہندوستانی لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد ملک بھر میں صرف چوبیس تھی۔ اب سات سو نرسیں ان کے علاوہ ہیں۔

---

بمبئی کے مسٹر ذکریا منہیار کی اہلیہ نور بانو صاحبہ نے انجمن امداد نسواں بمبئی کی طرف سے اُردو زبان میں بذریعہ آلات ریڈیو تقریر کی جو تمام ہندوستان میں بیک وقت سُنی گئی۔ اس سے

پہلے انگریزی اور گجراتی زبانوں میں ریڈیو کی تقریریں ہو چکی ہیں۔ لیکن اردو میں یہ سب سے پہلی تقریر تھی جس کا موضوع "حقوق نسواں" تھا۔

---

شریمتی پاربتی رام چندر صاحبہ نے ایک ہزار روپیہ کا عطیہ اس غرض سے دیا ہے کہ جن لڑکیوں کے باپ یا سرپرست کراچی میں گولی چلنے سے ضائع یا بیکار ہو گئے ہیں اُن کی شادیوں میں صرف کیا جائے

---

رنگون کی ایک پارسی لڑکی مس گل بانو نانا بھائی کاؤس جی نے جو مسٹر کاؤس جی بیرسٹر ایٹ لا رنگون کی صاحبزادی ہیں امسال کیمبرج یونیورسٹی سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا ہے۔ آپ رنگون میں پریکٹس کریں گی۔

---

مسز ایلوزا امریکہ کی ایک کروڑپتی خاتون ہندوستان سے اس قدر الفت رکھتی ہیں کہ آپ ہمیشہ ہندوانہ لباس پہنتی ہیں۔ آپ نے ہندو مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے بھی ہندو مشن کو کافی مدد دی تھی۔

---

مسز کرشنا دیو تواری سب سے پہلی سرجو پاری برہمن خاتون ہیں جنھوں نے ایم۔ اے پاس کیا ہے۔ آپ پنڈت رام اوتار شرما کی دختر اور پنڈت کرشنا دیو تواری ایم۔اے۔ ایل ایل۔ بی اسسٹنٹ رجسٹرار ہندو یونیورسٹی بنارس کی اہلیہ ہیں۔

---

مسٹر کے۔ پی۔ جیسوال بیرسٹر کی صاحبزادی دھرم شیلا دیوی صاحبہ ایم۔اے ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے ہندوستان واپس آئی ہیں۔ آپ صوبہ بہار واڑیسہ کی سب سے پہلی ہندو خاتون بیرسٹر ہیں آپ نے گیارہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا جس کے بعد آپ نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لی اور انگلستان میں لندن اور ڈبلن کی یونیورسٹیوں سے امتیازات حاصل کئے اور لنکن انز سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

---

مس عنایت علی عیلی امام ساکن مظفرپور صوبہ بہار کی پہلی مسلم لڑکی ہیں جنھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرکے وظیفہ حاصل کیا ہے۔

---

# علمی خبریں اور نوٹ

سہ ماہی مختتمہ جون ۱۹۳۵ء میں صوبہ متحدہ کے اندر سات سو تیس کتابیں شائع ہوئیں جن کی تفصیل یہ ہے: انگریزی کی باسٹھ [۶۲] کتابیں۔ رومن اردو کی تین [۳]، اردو کی اڑتالیس [۴۸]، ہندی کی چار سو سینتالیس [۴۴۷] نیپالی کی پانچ [۵] چودہ [۱۴]۔ گڑھوالی کی ایک [۱]۔ سنسکرت کی سینتیس [۳۷]۔ بنگالی زبان کی ایک [۱]، مختلف [۹] مخلوط زبانیں ۱۰۶ انگریزی میں زیادہ تر کتابیں درسی ہیں، رومن اردو کی تینوں کتابیں عیسائی مذہب کے متعلق ہیں، اردو کی اڑتالیس کتابوں میں ایک چوتھائی مذہبی ہیں، کچھ درسی اور چند شاعری سے تعلق رکھتی ہیں۔ علمی اور تحقیقی کتابیں دو تین سے زیادہ نہیں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی تصانیف کا درجہ کس قدر پست ہے۔ اس کے برعکس ہندی کی کتابیں نہ صرف تعداد میں کئی گنی زیادہ ہیں بلکہ موضوعات کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں۔ بہر حال ہندی مصنفین کی کوششیں قابل مبارکباد ہیں اس سہ ماہی میں ساٹھ کے قریب ہندی ڈرامے اور افسانے شائع ہوئے ہیں، دو سو انتیس [۲۲۹] کتابیں شعر وسخن کی ہیں۔ فارسی یا عربی کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب یہ زبانیں ہندوستان میں مردہ ہوتی جا رہی ہیں۔

---

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مشہور مورخ کی کتاب "نظام سلطنت" شائع ہو گئی ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں مذہب، اخلاق، تمدن، معاشرت وغیرہ کی حقیقت و اصلیت پر، دوسرے حصہ میں رومیوں مصریوں، ہندیوں، چینیوں وغیرہ کے قوانین حکومت اور نظامات سلطنت پر، ایک باب میں ارسطو، افلاطون، بنی اسرائیل، منوجی مہاراج، لائکرگس، کنفوشس، چانکیہ برہمن، نوشیرواں وغیرہ کے نظریات سلطنت پر، دوسرے باب میں عالمگیر اتحاد کی ضرورت، آزادی و حریت کی حقیقت، وطنیت، محنت و سرمایہ داری، وراثت وغیرہ پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ کتاب بہت بڑے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کے بعد لکھی گئی ہے ضخامت سوا تین سو صفحات، کاغذ، لکھائی، چھپائی، دیدہ زیب۔ قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب مکتبۂ عبرت، نجیب آباد ضلع بجنور۔

---

مولوی عبدالرحمٰن صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل لاہور "تذکرہ مشاہیر پنجاب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ رہے ہیں جس میں پنجاب کے تمام مشہور علما، صوفیاء، شعراء، اطبا، وکلا، رؤسا وغیرہ کے حالات مع فوٹو درج ہونگے۔ جو صاحبان اِس سلسلہ میں معلومات سے مدد دینا چاہیں وہ مصنف صاحب کو ممنون فرمائیں۔

---

حیدرآباد دکن کے نوجوان ادیب محمد رفیق صاحب خاور ایم۔ اے نے مرزا غالب کی بعض اُردو فارسی غزلوں کا انگریزی میں آزادانہ ترجمہ کیا ہے جس کا نام "انڈین خیام" رکھا ہے۔ اس ترجمہ پر لندن یونیورسٹی کے پروفیسر گریہم بیلی نے ایک شاندار مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کتاب جلد شائع ہونے والی ہے۔

---

اعلیٰحضرت خسرو دکن کی سلور جوبلی کے موقع پر مولوی سید احمد اللہ صاحب قادری ایڈیٹر "تاریخ حیدرآباد" "آصف نامہ" کے نام سے ایک یادگار کتاب شائع کرنیوالے ہیں جس میں مشرق و مغرب کے مشہور علمار کے علمی مضامین ہونگے اور جو مضمون جس زبان میں ہوگا وہ اسی زبان میں طبع کیا جائیگا۔ مشاہیر حیدرآباد کی تصاویر بھی اس میں ہدیۂ ناظرین کیجائینگی۔

---

ریاست رامپور کے مشہور کتبخانہ میں عرب کے مشہور شاعر متنبّی کے دیوان کا قلمی نسخہ ملاہے جس کی تین جلدوں میں تمام غزلیں اور نظمیں سلسلہ وار درج ہیں، اور چالیس سے زیادہ نظمیں ایسی ہیں جن پر تاریخ تصنیف بھی درج ہے۔ دوسری جلد کے آخر میں متنبّی کی سوانحعمری بھی درج ہے اور اس میں ایک نوٹ اس بارہ میں بھی لکھا ہے کہ متنبّی حلب سے دمشق کیوں گیا تھا۔ اس کے وجوہ معلوم کرنے سے بڑے بڑے مستشرقین یورپ (جیسے جرمنی کا براکلمین) بھی قاصر رہے تھے۔ مگر اس قابل قدر نسخے سے کل حالات منکشف ہوتے ہیں۔

---

۲۴ اگست ۱۹۳۵ء کو بمبئی کے سربرآوردہ اخبار نویسوں کا ایک ڈنر رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے اڈیٹر مسٹر ایس۔ اے آئر کی زیرصدارت ہوا جسمیں اسّی حضرات شریک تھے۔ فاضل پریسیڈنٹ نے اخبار نویسی کو جفاکشی اور ذمہ داری کا پیشہ قرار دیا اور پبلک کی بے قدری اور اخبار نویسوں کی مالی بے بضاعتی کا رونا رویا۔ مسٹر ہارنیمن نے فرمایا کہ اخبار نویسی دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ مسٹر بریلوی نے اخبار نویسوں کی ایک "ٹریڈ یونین" قائم کرنے پر زور دیا۔ ٹائمس آف انڈیا کے اڈیٹر مسٹر لوئنے ورتھ نکر بریس کے روشن مستقبل کی پیشگوئی کی۔ اگر بمبئی اور لاہور کی طرح ہر مرکزی مقام پر اخبار نویسوں کی انجمنیں قائم ہوکر وقتاً فوقتاً تبادلہ خیالات ہوتا رہے تو بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔

# لطفِ سخن

(از حضرت اختر جوناگڑھی)

پھر بہار آئی عجب شان سے زندانوں میں
مچ گیا شور سلاسل ترے دیوانوں میں

پھونک ڈالا شررِ غم نے جگر کو دل کو
آگ لگ جائے الٰہی مرے ارمانوں میں

ہے اگر جنسِ وفا آدمیوں میں نایاب
کوئی انسان بھی ملتا نہیں انسانوں میں

بستیوں میں کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
بجلیاں کوندتی پھرتی ہیں بیابانوں میں

دُور تھا سرحدِ ادراک سے اپنا "مسجود"
لطف آیا نہ عبادت کا صنم خانوں میں

قصۂ درد و الم کس کو سنائیں اختر
نیند آتی ہے اُنھیں عشق کے افسانوں میں

(از سید اعظم حسین صاحب اعظم)

اے نگاہِ شوق کیوں ہوتی ہے تو بیدل ابھی
کوئی آئے گا جو کم ہے رونقِ محفل ابھی

راہِ استغنا میں اُٹھے تو سہی کوئی قدم
لذتیں کونین کی ہو جائیں گی حاصل ابھی

ناؤ ٹکر کھا کے جب ٹوٹی تو آنکھیں کھل گئیں
بے خبر دل جانتا تھا دُور ہے ساحل ابھی

آئینہ خانے کو توڑ اے عشق تا مٹ جائیں عکس
کون؟ یکتا کون؟ دعویٰ ہے ترا باطل ابھی

خود کھلے گی آنکھ جب ہوگا نہ بیمارِ فراق
اُس تغافل کیش کو رہنے ہی دو غافل ابھی

کیفِ غم میں حاصلِ غم کو بھلاتا ہے کوئی
اے دلِ بسمل ٹھہرا موجود ہے قاتل ابھی

یاد تازہ کرتے جاتے ہیں مناظر راہ کے
ذوقِ منزل پاس ہے گو دُور ہے منزل ابھی

بخت ہے کوتاہ لیکن زندگانی ہے دراز
اور کوشش؛ دل نہ توڑ اے سعیِ لاحاصل ابھی

ہے نگاہوں میں نگاہِ یاس کی افسردگی
مٹ گیا دل پھر بھی باقی ہے نشانِ دل ابھی

پردۂ رنگیں شفق کا چاک ہونا چاہیے
خون ظاہر ہے مگر روپوش ہے قاتل ابھی

قید میں رہنا ہے خود اس بات کا اعظم ثبوت
یہ ہمارا ذوقِ آزادی نہیں کامل ابھی

(از سیّد افتخار حسین صاحب فخرؔ ڈسٹرکٹ و سشن جج کانپور)

وہ کمسن ہیں ابھی اُن سے گِلا کیا
نہ سمجھیں جو وفا کیا ہے جفا کیا

بقا معدوم ہے فکرِ بقا کیا
فنا لازم تو پھر ذکرِ فنا کیا

کہیں کوشش کہ موت آنے نہ پائے
کہیں مرنے کی تیاری ہے کیا کیا

جب آئے مٹھیاں بھر کر کے آئے
چلے ہیں ہاتھ خالی یاں ملا کیا

نہ آیا عمر بھر بھی جب سمجھ میں
تو کیونکر یہ سمجھتا ہے خدا کیا

نہیں جب اختیار اپنا کہ ہو وصل
تو پھر مختار ہو کر فائدا کیا

حیاتِ جاوداں پائیں گے عاشق
نہ ہو جینا تو مرنے کا مزا کیا

بہر رنگے کہ باشم شاد باشم
جنوں کی ابتدا کیا انتہا کیا

شہیدانِ وفا کی ہوگی پرسش
قیامت میں ملے گا خوں بہا کیا

بڑی اُفتاد جو کچھ وہ اُٹھالی
خدا سے شکوۂ جور و جفا کیا

پہونچتی ہے خدا تک بے وسیلہ
اثر رکھتی ہے مضطر کی دعا کیا

کسی کی آرہی ہے ساز دل سے
کہیں میں نے سُنی ہے یہ صدا کیا

سکونِ قلب ہو تو موت آئے
مرض جب زندگی ہو تو دوا کیا

خدا پر فخرؔ کون ایمان لایا؟
یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا

(از جناب بیخودؔ موہانی)

ایسی قسمت وہ سُنیں یوں مرے افسانے کو
عشق کو مل گئی اِک چیز قسم کھانے کو

کچھ سمجھتا ہی نہیں آگ میں جل جانے کو
شمع پروانہ بنا دیتی ہے پروانے کو

آتشِ رشک نہ پھونکے ترے دیوانے کو
جلتے دیکھا نہیں پروانے سے پروانے کو

شمع لہرا کے بڑھی آپ لپٹ جانے کو
مل گئی! دادِ وفا مل گئی پروانے کو

تری رحمت ترے انصاف کا منہ تکتی ہے
کہہ نہ دے مجھ سے جہنم میں چلے جانے کو

عشق ہی ہے وہ صحیفہ کہ ہے اپنی تفسیر
دخل اس میں نہ سمجھنے کو نہ سمجھانے کو

اِس طرح اُس نے مرے شیشۂ دل کو توڑا
چھوڑ دے جان کے جیسے کوئی پیمانے کو

حشر میں بھی نہ کھُلی ایسی زباں بند ہوئی
آہ کیا آپ نے سمجھا دیا دیوانے کو

میں وہ کچھ کر کے چلا ہوں جو رہے گی میری زباں
عشق دہرائے ہمیشہ مرے افسانے کو

ابھی محمل، ابھی تصویر، ابھی جلوہ، ابھی تو
نظر آتے رہیں یہ عالم ترے دیوانے کو

مجھ اکیلے پہ وہ بیتی جو زمانے پہ بنی
کہئے دنیا کی کہانی مرے افسانے کو

کہیں اک بوند میں چھلکے کہیں بھر ہی نہ سکے
کوئی سمجھا ہی نہ تقدیر کے پیمانے کو

آہ خورشید قیامت بھی ہے بجھتا سا چراغ
روشنی چاہیئے اس دل کے سیہ خانے کو

مرے مشرب میں تو ہے مے کی طرح خوں بھی حرام
کیا کروں دل کے چھلکتے ہوئے پیمانے کو

ہوں وہ کشتی کہ ہو موجوں کے تلاطم میں نہاں
ڈوب جانے کو کہوں مَیں کہ ابھر آنے کو

ذرہ ذرہ ہے یہاں ٹوٹے ہوئے دل کا جواب
کہتے ہیں درد کی دنیا مرے ویرانے کو

(از منشی جگیشور ناتھ صاحب بیتاب بریلوی، بی اے، ایل ایل بی-)

ہشیار ہو کے دل ترا دیوانہ بن گیا
کعبہ پرست بندۂ بتخانہ بن گیا

سوزِ درونِ عشق کی معراج مل گئی
ہر رنگِ شمع بزم میں پروانہ بن گیا

بیدار ہے وہی نہیں جسکو خودی کا ہوش
ہشیار ہے وہی کہ جو دیوانہ بن گیا

انجامِ نالۂ دلِ غمگیں نشاط تھی
آتے ہی لب پہ نعرۂ مستانہ بن گیا

موسیٰ کے رہ سکے نہ بجا ہوش طور پر
اتنی سی بات کا بھی اِک افسانہ بن گیا

پردہ اٹھا تو تابِ نظارہ نہ لاسکے
دل خود حریفِ جلوۂ جانانہ بن گیا

تم کیا پھرے کہ دل بھی ہے پہلو سے بے نیاز
جو آج تک یگانہ تھا بیگانہ بن گیا

کچھ دَیر سے غرض نہ حرم سے ہے واسطہ
رند آ جمے جہاں وہیں میخانہ بن گیا

فکرِ معاش دام میں کرتی اسیر کیا
آنسو گرا جو آنکھ سے وہ دانہ بن گیا

جلوے کسی کے ایسے نظر میں سما گئے
ویرانۂ خیال پری خانہ بن گیا

ہونا تھا ذوقِ دشت نوردی سے فیضیاب
گلشن کمالِ رشک سے ویرانہ بن گیا

جامِ جہاں نما تھا مرا کاسۂ سفال
لبریز ہو کے عمر کا پیمانہ بن گیا

بیتاب زیست فقر میں گذری تو غم نہیں
مر کر مرا مزار توشاہانہ بن گیا

# دہلی سے

# ایک انقلابی اور معیاری مصور ماہنامہ کا اجراء




سائز کلاں ۱۸×۲۲/۴ کتابت و طباعت روشن

صفحات ۱۰۸ ٹائیٹل دو رنگی

سالانہ چندہ عہ کاغذ قسم اعلیٰ




(تصاویر آٹھ صفحوں پر آرٹ پیپر)

مدت دراز سے میری یہ تمنا تھی کہ ہندوستانی علم و ادب اور ہندوستانی ذہن و فکر کو عصر حاضر کی سطح تک بلند کرنے کی خاطر ایک ایسا ماہنامہ جاری کروں جو اپنے تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے لحاظ سے زندہ اقوام کے جدید ترین معیار صحافت پر پورا اتر سکے۔ اس وقت حقیقی معیار ادب، استوارئ آزادئ فکر اور صحیح ذوق انتقاد کے لحاظ سے ہمارا علمی افلاس اس حد کا ہولناک ہے کہ ہم دوسری قوموں کو منہ نہیں دکھا سکتے جبتک جمود و جہل کا یہ عالم رہیگا اور جس وقت تک ملک کے ادبیات میں ایک قابل بقا عظیم انقلاب نہ پیدا کر دیا جائیگا کسی ذہنی برتری سیاسی بیداری اور مادی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس بنا پر اب جبکہ حیدرآباد سے پنشن ہو جانے کے باعث میرے پاس کام کرنے کے لئے کافی وقت ہے اور مفکرین کی ایک جماعت بھی میرا ہاتھ بٹانے کو تیار ہے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اسی جدوجہد میں صرف کر دوں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی کام سرمایہ کے بغیر نہیں چل سکتا اور میرے واسطے یہ بھی ناممکن ہے کہ میں سرمایہ کی خاطر ارباب دولت کی آستاں بوسی کرتا پھروں اس لئے اب صرف ایک صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اپنی قوم سے مجھے اجراء رسالہ کی خاطر سردست ایک ہزار خریدار مل جائیں اور ہر خریدار اپنا چندہ پیشگی منی آرڈر کر دے تو میں کسی تاخیر کے بغیر رسالہ جاری کر سکتا ہوں۔

میں دو ماہ تک انتظار کرونگا کہ میرے برادران وطن میری اس مخلصانہ تجویز کا کیونکر استقبال کرتے ہیں۔

میں نے ابتک جس خلوص اور بے لوثی کے ساتھ ملک کی خدمت کی ہے اس سے مجھے توقع ہے کہ میری قوم مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اپنی خدمت کا موقع دے گی۔

آخر میں نہایت روشن الفاظ کے ذریعہ سے یہ واضح کر دینا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنی قوم سے میری یہ پہلی اپیل کسی نوع کے تاجرانہ تخیل سے ہرگز آلودہ نہیں ہے۔

میری ذاتی معاش کے ساتھ میری کتابیں، میری حیدرآباد دکن کی پنشن اور میری آبائی جائداد بہت کافی ہے سردست میں "دھولپور" میں ہوں اور میرا پتہ صرف "دھولپور (راجپوتانہ)" کافی ہے۔

جوش

یکم اگست سنہ ۱۹۳۵ء

## سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا

انگوری منقاؤں سے تیار کردہ

# سکھ سنچارک دراکشا سو

جسم کو طاقتور بنانے گوشت وخون بڑھانے چہرہ پر رونق لانے۔ دست صاف ہو کر بھوک بڑھانے والی خوش ذائقہ دوا قیمت چھوٹی بوتل عہ بڑی عما

---

ہماری ایک دراکشا سو ایسا ہے جس کی

## ۵۲ اخباروں نے تعریف لکھی ہے

طلب فرمانے پر نمونہ اور فہرست مفت روانہ کی جاتی ہے

## سکھ سنچارک کمپنی متھرا کی

ادویات

# سدھا سندھو

کف کھانسی ہیضہ۔ دمہ۔ شول۔ سنگرہنی آتیسار وغیرہ کی خوش ذائقہ وخوشبودار دوا قیمت ۸/

# ددرو گج کیسری

داد کی سب سے اچھی دوا قیمت ۴/

# بال سدھا

دبلے اور کمزور بچوں کو طاقتور بنانے والی دوا قیمت ۱۲/

سب دوا فروشوں کے پاس ملتی ہیں

# آپ کی تقدیر

آپ ایک کارڈ پر صرف کسی پھول کا نام اپنے نام اور پتہ کے ساتھ لکھکر بھیجدیجئے اور ہم آپ کو بذریعہ وی۔پی پوسٹ ایک روپیہ چار آنہ میں (علاوہ محصولڈاک) آئندہ ایک سال کے لئے آپ کے متعلق مفصل حالات لکھکر بھیجدینگے جسمیں کاروبار کے اندر نفع ونقصان ترقی تبادلہ۔ ملازمت میں تخفیف۔ بچوں کی ولادت۔ شادی۔ بیاہ۔ خوشی وغم۔ اور جسمانی عوارض کے حالات ہونگے۔ اور ستاروں کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے ہدایات بھی ہونگی ہماری پیشگوئیوں کی تصدیق کے لئے آزمائش شرط ہے۔ ہر قسم کے پانچ سوالوں کے صحیح جوابات کیلئے علاوہ محصولڈاک سوا روپیہ ہے

نوٹ: جو شخص ہمارے بیان کو چیلنج کریگا ہم اُسے مبلغ سو روپیہ انعام دینگے۔

پروفیسر جی۔ شنکر۔ پوسٹ بکس ۴۲ لاہور

# بہترین آم کے قلم

## طلب فرمائیے

ہمارے فرم سے جو ۱۹۲۴ء سے قائم ہے
اور لکھنؤ کے مشہور خربوزہ کے بیج وہر قسم
کی سبزی ترکاری کے تخم روانہ ہوتے ہیں۔
اس کے علاوہ زردہ۔ قوام۔ گولی۔ عطر
کی گاد۔ وخوشبودار تمباکو۔ لکھنؤ کی
مشہور چکنی ڈلی۔ وچکن کی ٹوپی کے
بیلے وفردیں لحاف ورضائی بنے ہوئے
اور ہر قسم کے کھانے پینے کی تمباکو وغیرہ
نہایت ارزاں فروخت ہوتی ہے۔

## تاجروں سے خاص رعایت

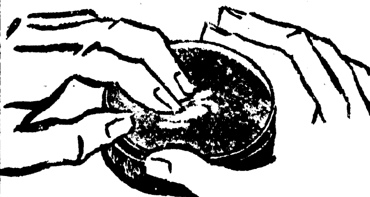
فہرست کارخانہ طلب فرمانے پر مفت
روانہ کی جاتی ہے۔ فرمایش کے ساتھ
نصف قیمت پیشگی آنا چاہیئے ورنہ
تعمیل سے معذوری ہے۔ اپنا نام اور
القاب وپتہ ڈاک خانہ واسٹیشن
صاف صاف تحریر کرنا چاہیئے۔

پتہ

## ہندوستانی کمپنی ملیح آباد لکھنؤ

---

# جلے کٹے زخموں جلدی بیماریوں
## اور بواسیر کیلئے ہمیشہ
## نباتاتی مرہم زمبک استعمال کیجئے






جانوروں کی
چربی سے
پاک ہے

اگر آپ کے کوئی ایسا زخم، پھوڑا یا ناسور ہے جو اچھا نہیں
ہوتا۔ یا آپ کے پاؤں رنجور ہیں، کیڑوں نے کاٹا ہے
خارش یا ایکوتہ ہے تو ان سب کو زمبک
تسکین دیکر آپ کی جلد کو جادو کی طرح اچھا کر دیگا
زمبک خالص ترین بوٹیوں سے بنایا جاتا ہے اور
ہر قسم کی آب و ہوا میں اس کی شفابخشی، تسکین دہی
اور جراثیم کشی کا معیار بدستور قائم رہتا ہے۔
تمام دوا فروش زمبک کو ایک روپیہ یا سوا دو روپیہ
کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹس۔ مسرس اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کو
لمیٹڈ۔ انٹالی۔ کلکتہ

**شفابخش تسکین دہ اور جراثیم کش**

# زمبک

**Zam Buk**



# پیپس استعمال کر کے

# اس تکلیف دہ زکام کو آرام کیجئے

جب آپ زکام کی وجہ سے تنگ آگئے ہوں تو پیپس کی
ایک ٹکیہ منہ میں ڈال لینے سے حیرت انگیز راحت
پہونچتی ہے۔ پیپس سے جو خوشگوار اور
جراثیم کش انجرے خارج ہوتے ہیں وہ
براہ راست پھیپھڑوں میں پہونچتے ہیں۔ وہ
تنفس میں سہولت پیدا کرتے ہیں۔ حلق کی
خراش کو آرام کرتے ہیں۔ اور زکام و
انفلوئنزا کے تمام جراثیم کو ہلاک کر دیتے ہیں

قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ/

ایجنٹ: مسرس سمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کمپنی
لیمیٹڈ انٹالی۔ کلکتہ



## سانس کے ذریعہ شفا
## دینے والی ٹکیاں

# پیپس
# PEPS



آپکی یہ کمزوری خواہ بخار یا کسی بیماری کے باعث ہو خواہ
اپنی قوت مردمی کے زیادہ خرچ کرنے کے باعث ہو آپ مشہور
و معروف مقوی غذا سناٹوجن استعمال کیجئے آپ کی
روشن صحت اور طاقت بہت جلد پھر بحال ہو جائیگی۔
کمزوری اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ عوارض مثلاً تعطل
دماغ، دوران سر، درد سر اور فقدان اشتہا سب کو معدوم
کرنے میں سناٹوجن اپنی طاقتوں اور خواص میں مشہور
آفاق ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ کرشنا مورتی راؤ سلیم سے تحریر فرماتے ہیں
"میری رائے میں کمزوری اعصاب طاری کرنیوالی
بیماریوں سے افاقہ پذیر لوگوں کیلئے سناٹوجن ایک
ایک بیش بہا رحمت ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے
جنہیں عام کمزوری اعصاب خستگی اور تکان وغیرہ
کی شکایت ہے۔"

آپ سناٹوجن کا استعمال کرکے دیکھئے۔ آج ہی
ایک شیشی خرید کر کچھ عرصہ کے لئے روزمرہ استعمال
شروع کر دیجئے۔ آپ حیران ہو جائیں گے کہ آپ کی طاقت
میں کس قدر جلد اضافہ ہوتا ہے۔ اور کس قدر جلد تندرستی
بحال ہو جاتی ہے

ہر دوا فروش اور بازار میں سناٹوجن ملتی ہے

# SANATOGEN

اصلی مقوی غذا
ہاتھ سے چھوٹی نہیں جاتی

# ادبی دنیا

## ڈراما نمبر

ڈراما نگاری کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ

سحر کار مصوروں کی ایک درجن سے زائد نایاب وحسین تصاویر۔ دلکش منظوم مناظر

دنیا کی تمام قوموں اور زبانوں کے شاہکار ڈرامے ادبائے ہند کی پانچ بلند پایہ تمثیلیں اور فن ادب ڈراما کے متعلق آٹھ علمی وتنقیدی مضامین۔

سہ رنگا تصاویر: شکنتلا اور دشینت۔ شیکسپیئر بارہ سال کی عمر میں۔ رومیو اور جولیٹ کا ایک رومانی لمحہ۔

یک رنگا تصاویر: آغا حشر مرحوم۔ ڈراما کی بعض دنیا کے پانچ مشہور ڈراما نگار۔ دنیا کے بہتر ایکٹر اور ایکٹریسیں۔

ڈراما نمبر میں لکھنے والوں کے قابل ذکر نام کلیم۔ آغا حشر مرحوم۔ علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری۔ عطاء اللہ کلیم۔ پروفیسر تبسم ایم اے۔ اندر لال داس۔ قمر تمکین کاظمی۔ سید بادشاہ حسن۔ سید فخر عظیم۔ ضیا فتح آبادی۔ خلیل بی اے۔ نسیم رضوانی۔ حفیظ ہوشیار پوری۔ منصور احمد۔ پنڈت رام سروپ شاستری۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| دو سو جہازی صفحات<br>قیمت<br>صرف بارہ آنے ۱۲؍ | ادبی دنیا<br>کے خریداروں کو<br>مفت | چندہ سالانہ<br>پانچ روپے<br>مع محصول | منیجر ادبی دنیا لاہور |

# ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

## مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کے۔ رائے صاحب بہادر سی آر۔ ایس فیلو آف کیمسٹری لندن

جس کی بابت لندن، کلکتہ، پنجاب، آگرہ، میڈیکل کالج کے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں۔ نوابوں اور راجاؤں و معزز حکما صاحبان و دہلی کلکٹران و معزز یورپین انگریزوں نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقی روشنی کے واسطے مفید ہے اور سب سے بہتر مفید اثر دوا ہے ملک روس اور افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے حکما و ویدوں نے آنکھوں کی بیماریوں اور دوا کو چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا ہے

### ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں کامیابی

نگاہ ناپ کر سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقائص دور ہو جائیں گے عینک کی ضرورت نہیں رہتی۔ دھند، ڈھلکا، آنسو بہنا، سوزش آنکھوں کے سامنے اندھیرا پلکوں کے اندر کی سرخی گوہانجی دھند ہو جاتی ہے کمزور نگاہ سے تا کا سرخی میں بہت جلد ڈال دیجئے۔ پربال، سبل، جالا، پھولا، ناسور ابتدائی موتیا بند، ناخونہ۔ آنکھوں کے سامنے دھواں سا آنا بند ہو جاتا ہے لکھنے پڑھنے سے آنکھ کا تھکان اور سرخی بہت جلد صاف کرتا ہے۔ اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ محصول ڈاک ۵

ملنے کا پتہ:۔ منیجر نگم کمپنی۔ نیا چوک۔ کانپور

# کسان

## (اس کے افلاس کے وجوہ اور اُن کا علاج)

(مصنفہٗ)

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم - ایل - اے - ایم - ایل - سی :

مترجمہٗ جناب محمود علی خانصاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی ؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اُسے خوشحالی سے محتاج کیا گیا ؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا ؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا ؟ اب کسان کی حالت اتنی دردناک ہے کہ اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی اس کا اصلی سبب کیا ہے اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہے ؟

اِن سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے ۔ کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے ۔ کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہے ۔ لہذا جو لوگ موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں اُنھیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہئیے ۔ یقین ہے کہ اس موضوع پر اُردو میں اس سے بہتر کتاب ابتک پیش نہیں کی گئی ہے ۔ کتابت طباعت ۔ کاغذ اعلےٰ ضروری ہے کہ ملک کا ہر بہی خواہ اسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن دوبارہ پھر جائیں ۔

کتاب پریس میں جا چکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگی ۔ فوراً فرمائش بھیجے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا ۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو محصول ڈاک معاف

ملنے کا پتہ : **مکتبہ جامعہ دہلی**

پرنٹر پنڈت شری بلبھیسر دال پریس ... کوٹھی کانپور

پبلشر منشی دیا نرائن نگم بی - اے

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

# زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔اے

| | | |
|---|---|---|
| جلد ۶۵ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء | نمبر ۴ |

## فہرست مضامین



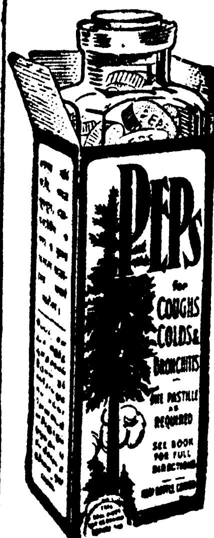
زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا
قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۱۰ شش ماہی ۵۔ ہندوستان کے لئے شش ماہی ۳ روپیہ

قیمت فی پرچہ

سالانہ

# سردی لگ جانے سے
## سینہ بہت جلد کمزور ہو جاتا ہے
اس لئے
# پیپس استعمال کر کے
# مزید تکلیف سے بچئے






اگر آپ کو اچانک سردی لگ جانے، کھانسی اور پھیپھڑوں کو کمزور کرنے والے زکام کی شکایت رہتی ہے تو ضرور "پیپس" کی ٹکیاں استعمال کیجئے۔ جو سانس کے ذریعہ سے شفا دیتی ہیں۔ پیپس کی ٹکیہ منہ میں گھلتے ہی بیش بہا طبی ابخرے خارج کرتی ہے۔ جو سانس کے ذریعہ سے قدرتاً سینہ اور پھیپھڑوں میں پہونچتے ہیں۔ پیپس کی ٹکیاں نہایت جراثیم کش، تسکین دہ اور ذائقہ میں خوشگوار ہیں۔ پیپس مضر جراثیم کو ہلاک کرتی ہے۔ ورم کو تحلیل، سانس کی نالیوں کو صاف اور بدترین کھانسی و زکام اور سردی کو آرام کرتی ہے

حلق کی تکلیفوں، دمہ، انفلوئنزا وغیرہ میں پیپس کی ٹکیاں استعمال کیجئے۔

**جراثیم کش سانس کے ذریعہ شفا دینے والی ٹکیاں**

تمام دوا فروشوں سے
ایک روپیہ فی شیشی

# پیپس
PEPS



## آپ کے لئے

# نئی طاقت

جب سناٹوجن کا چند روزہ استعمال آپ کی تمام قابل فخر اور ضروری طاقتوں کو اس طرح از سر نو بحال کر سکتا ہے کہ کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتا تو پھر آپ کیوں تکان محسوس کرتے ہیں گویا لطف زندگی اٹھانے کیلئے آپ میں طاقت ہی نہیں۔

کمزوری کی تمام علامتیں مثلاً تعطل ذہنی فقدان طاقت بیخوابی اور پیٹ کی شکایتیں بہت جلد دور ہو جائینگی اور پھر عود نہ کرینگی کیونکہ "سناٹوجن" بالذات تندرستی تعمیر کرتی ہے۔

ایک مشہور یورپین طبیب لکھتا ہے۔

"سناٹوجن" کا فوری اور حیرت انگیز اثر ہوتا ہے جو طاقت میں بتدریج اضافہ سے نمایاں ہوتا ہے۔"

خود کو ایک طاقتور اور تندرست آدمی بنایئے آج ہی "سناٹوجن" کا استعمال شروع کر دیجئے۔

# SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام دوا فروشوں اور بازاروں سے ملتی ہے



# اگر آپ کے پیر تکلیف دے رہے ہیں یا سوج گئے ہیں

## تو جڑی بوٹیوں والا مرہم زمبک استعمال کیجئے

اگر پاؤں پھٹ گئے ہوں یا دکھ رہے ہیں یا پاؤں میں دانے یا پھنسیاں نکل آئی ہوں اور ٹخنوں میں آماس ہو گیا ہو تو جڑی بوٹی والے مرہم زمبک سے بڑھکر کوئی دوسری دوا نہیں ہے اگر ہر روز رات کے وقت اس کو اپنے پاؤں میں خوب ملئے۔ تو زمبک حیرت انگیز طریقے سے آرام دہ اور صحت بخش ثابت ہوگا وہ جلد میں جذب ہو جاتا ہے اور آماس اور درد کو دفع کر دیتا ہے۔

"زمبک" زخم اور پھوڑے پھنسیوں کو اچھا کر دیتا ہے سخت ڈھٹھوں کو نرم کر دیتا ہے۔ سب انگریزی دوا فروش اسکو ایک روپیہ فی ڈبیہ کے حساب سے بیچتے ہیں۔ بڑی ڈبیہ کی قیمت دوگنا ہے

ایجنٹس مسرز اسمتھ اسٹن اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ انٹالی کلکتہ

## حیوانی چربی سے پاک و صاف

# زمبک

Zam Buk

# زمانہ بک ایجنسی کی قابل خرید بےمثل کتابیں

**مکمل عورت** دو لڑکیوں کے تعلیمی و سوشل حالات کا مقابلہ ایک کو یوروپین سکول اور دوسری کو کنیا ودیالہ میں داخل کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشل حالات میں بہتر ہے ...... قیمت ...... ۸ر

**شریمد بھاگوت گیتا** یعنی کرم یوگ شاستر المعروف غذائے روح باتصویر مترجمہ جناب پنڈت پربھودیال مصر عاشق لکھنوی ...... قیمت ...... عہ

**اردو مضمون نویسی** مضمون لکھنے کے متعلق جناب بابو بانکے پرشاد بی۔اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے قیمت ۸ر

**مثنوی سحر** یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ از سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز دوسرا ایڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے ...... قیمت ...... ۸ر

**مرقع ادب** حصہ اول دوم مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری، اسمیں ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں حصہ اول قیمت عہ حصہ دوم ...... عہ

**سیر گل** مختصر افسانوں کا مجموعہ وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی آج روسی کہانیوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت ہے لیکن ان کے اولین پیش کرنیوالے کی تحریروں کا اعجاز دیکھنا ہو تو "سیر گل" دیکھئے۔ قیمت ...... ۸عہ

**انتخاب حسرت** مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا انتخاب اور اسپر جلیل کے قلم کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے قیمت عہ

**ترجمہ رامائن منظوم**۔ بالکانڈ اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اردو اشعار میں۔ مترجمہ سورج پرشاد تصویر۔ قیمت ...... عہ

**خیالات عزیز**۔ مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جسکی باضابطہ رجسٹری کیگئی ہے حجم دوسو صفحات ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے لکھائی چھپائی اعلیٰ معہ تصویر مصنف قیمت عہ

**ہندو تیوہاروں کی اصلیت**۔ اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان لکھی ہے اسکے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے اردو فی جلد ۹ر ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دیگئی ہے قیمت عہ

**نقش و نگار** جلیل قدوائی صاحب کی دل آویز پر لطف نظموں و غزلوں کا مجموعہ جلیل صاحب کی نظم میں بھی وہی شاعری ہے جو انکی پاکیزہ و پرسحر نثر میں ہے ...... قیمت ...... عہ

**نصائح چانکیہ** یعنی ناموَر ہند چانکیہ کے مشہور و معروف منیتی کا اردو ترجمہ از پنڈت ہنمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام ...... قیمت ...... ۶ر

**حیات بیوہ** جسمیں مصنف نے بیوگان کی حالت کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور انکی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۵ر

**لسان الغیب** جلد اول و دوم حضرت حافظ شیرازی کے دیوان کی بےمثل شرح ہے جسکو نہایت صاف و سلیس زبان میں میر ولی اللہ نے مرتب کیا ہے۔ حافظ کے کلام کے شائقین کے واسطے عجیب تحفہ ہے حصہ اول تے ر دوم دو روپیہ عہ

**طریق دولتمندی** دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانیکے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں قیمت ۸ر

**پریم بتیسی** یعنی اردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند صاحب بی۔اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے قیمت حصہ دوم ...... ۱۲عہ

# زمانہ

جلد ۶۵ — اکتوبر ۱۹۳۵ء — نمبر ۴



# مشرقی اور مغربی تصوّف اور سنت مت

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

اس مضمون میں ہم وہ مطابقت واضح کرنا چاہتے ہیں جو مسلمان فقرا مولانا روم۔ شمس تبریز سرمد۔ بوعلی قلندر وغیرہ اور کبیر۔ گورو نانک جیسے ہندو سنتوں اور مہاتماؤں اور فی زمانہ رادھا سوامی مذہب کے آچاریوں کی تعلیم میں موجود ہے۔ ان کی تعلیم اور فلسفہ کو انگریزی زبان کی اصطلاح میں Eastern Mysticism. (مشرقی تصوّف) کہتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مشرقی اور مغربی تصوّف میں بھی بہت کچھ یکسانیت ہے۔ جب ہم دیگر مذاہب کی اصل تعلیم کو تصوّف کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو مختلف مذاہب کا ایک دوسرے سے کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ تصوف کا مطالعہ صحیح طریقے سے کیا جائے تو کتنے ہی نکتے جو اب تک تاریکی میں پوشیدہ ہیں چشم بصیرت کے سامنے روشن و سبرہن ہو جائیں مختلف زمانوں میں مختلف ملکوں کے فقیروں اور کاملوں کے خیالات و جذبات میں ہم آہنگی خصوصاً عالم بالا، روح اور خدا کے بارے میں ان کے خیالات و تصورات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے مشاہداتِ عینی پر مبنی ہے۔ درحقیقت جملہ مذاہب کی تعلیم یکساں ہے، پیغمبروں، اولیا، اور کاملین کے بعد امتداد زمانہ سے اصل تعلیم کا مفہوم تو مفقود ہو جاتا ہے اور علماء کی حاشیہ آرائیوں سے مذہب بالکل رسمی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر ملک میں (Mysticism) مسٹیسزم وہاں کے علماء دین کے قائم کردہ رسمی مذہب سے مختلف ہوتا ہے۔ درحقیقت

تصوف نے کسی مذہب سے بغاوت نہیں کی، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ مذہبی رسمیات کے خلاف اصل مذہب کی صدائے احتجاج ہے، بقول مولانا روم

گر ز سرِ معرفت آگہ شوی لفظ بگذاری سوئے معنی روی

تصوف مت اور مغربی مسٹی سزم تینوں کا نصب العین واصل بحق ہونا ہے۔ برنرڈ آف کلیر واکس کا نظریۂ فنا فی اللہ یہ ہے:۔

"اپنے کو اس طرح گم کر دینا گویا اپنی ہستی ہے ہی نہیں اور اپنی ہستی کا قطعی احساس نہ رہجانا اور خودی کو فنا کر دینا ہی خدارسی ہے، جس طرح پانی کے چند قطرے شراب کے بڑے برتن میں ملکر اپنی فطرت کھو دیتے ہیں اور شراب کے ہم رنگ اور ہم ذائقہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تمام انسانی محسوسات اُس ذات پاک کی طرف مبذول ہو کر خود کو فنا کر کے ہمہ تن رضائے ایزدی میں منقلب ہو سکتے ہیں خدا اُس وقت تک وحدہٗ لاشریک نہیں ہو سکتا ہے جب تک (اُس سے واصل ہونے والے انسان میں) بشریت باقی ہے۔"

اب غور فرمایئے شاہ بوعلی قلندر وصل الٰہی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:۔

چوں شوی فانی تو از ذکر خدا راہ یابی در حریم کبریا
چوں نہ مانی با خدا یابی وصال خویش را گم سازلے صاحبکمال
گشت واصل چوں بدریا آب جو آب جو را باز از دریا مجو
تا تو ئی کے یار گردد یار تو چوں نہ باشی یار باشد یار تو
مولوی فرمود در نظم ایں بیاں بر تو گردد روشن اسرار نہاں
تو مباش اصلا کمال اینست و بس تو درو گم شو وصال اینست و بس

فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کا مقام ہے جس کی نسبت خواجہ معین الدین چشتی فرماتے ہیں:۔

چو محو گشت معین نام او چہ می پُرسی کہ جز محو شیش اکنوں جواب دیگر نیست

اپنی ایک دوسری غزل میں خواجہ موصوف واصل بحق کی ہمرنگی و یگانگت یوں بیان کرتے ہیں:۔

از پسِ پردہ ہمی داد نشاں از منِ ما من و ما رفت ہمہ ماند چو برقع بکشود
اول و آخر و ظاہر و باطن ہمہ اوست کہ ہمو بود ہمو ہست وہمو خواہد بود

پہلا درجہ الذکر کا ہوتا ہے دوسرا فنا الفنا کا پھر یگانگت کی حالت ہو جاتی ہے۔ مرشد برحق سے روحانی

لہ مولانا روم

وصل حاصل کرنا بھی یگانگت ہے جیسا کہ کبیر صاحب فرماتے ہیں:۔

جب ہم تھے تب گورو نہیں اب گورو ہیں ہم نائیں
پریم گلی اتی ساکری جا میں دو نہ سمائیں

یہ درجہ فنا فی الشیخ کا ہے۔

مغربی تصوف کے علمبرداروں میں حکیم پلاطینوس[1] کو خاص الخاص سمجھنا چاہیئے۔ وہ معراج روح کے بارے میں کہتا ہے کہ روح درجہ بدرجہ مقامات بالا سے ہوتی ہوئی مادی حدود میں داخل ہوتی ہے اور انھیں طے کرنے کے بعد بالآخر مادہ اور عقل کے حدود سے بالاتر ہوکر واصل بحق ہو جاتی ہے جہاں حال و فنا ( EKVTO,S ) کی حالت میں ناظر و منظور شاہد و مشہود اور ساجد و مسجود ایک ہو جاتے ہیں بشریت سے پاک ہوکر روح انسانی کو خدا کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ خواجہ معین الدین بھی یہی فرماتے ہیں

ز ظلمتِ بشریت چو بگذری برسی — ازیں حضیض دنائت براوج اَو اولی

شمس تبریزی نے ذیل کی غزل میں روح کو حریم خدائے تعالیٰ میں واپسی کی ترغیب دی ہے اور روحانی مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

ز کجا آمدہ سیرانی — ز بیانِ حرم سبحانی
یادت کن ہیچ کہ یادت ناید — از مقاماتِ خوشِ روحانی
چوں فراموش شدہ است آنجا — لاجرم خیرہ و سرگردانی
جاں فروشی بہ یکے مشتِ خاک — ایں چہ ہیچ است بدیں ارزانی
بازدہ خاک و بداں قیمت خویش — نہ غلامی ملکی سلطانی
جہت تو ز فلک آمدہ اند — خوبرویانِ[2] خوشِ روحانی
ہل ایں گفت و بدیشاں بنگر — تا برندت بمقامِ فانی

کبیر صاحب کے کلام میں بھی یہی ہدایت ہے، علاوہ بریں چند مقامات اور وہاں کے چند خاص دیوتاؤں کا بھی ذکر[3] ہے۔ کبیر صاحب فرماتے ہیں:۔

---

[1] Plotinus.

[2] مراد از مردان خدا و مرشدان برحق

[3] ذیل کے مطابق مغربی تصوف کے مختلف فرقوں میں پانچ باتیں مشترک ہیں۔ اُن میں سے ایک عقیدہ، دوسرا درمیانی دیوتاؤں کی موجودگی اور تیسرا اُن کی معرفت خدا کا عالم شہود پر کارفرما ہونا ہے۔

پورن پرش پرم پیا پیارے جلوہ سکھی دیکھن جے ہو
جنم جنم جگ جگ کے جاسے سادھن سنگ بسریئے ہو
مان سروور تھان پرتھم جہاں بس سابچیہ بنیئے ہو
پھر بنو بیکنٹھ سمیپی دستنو بلی جہاں رہیئے ہو
آگے ست سروپ بہت جہاں جگ مگ جوت جریئے ہو
اوپر اکشر ونش براجے سکھ سابچیہ سمیئے ہو
آگے اکھنڈت دھام دھنی کو سکھن سہت سکھ کریئے ہو
پھر سہنگم سرت سہاگن انش ونش یذبیئے ہو
اچھا مول اگر آگے ہے پھر ان کو رتبیئے ہو
مکر تار ڈوری چڑھ اوپر امرلوک سوئی کیئے ہو
اوگیت کمل ال اجیاری کوٹن بھاگ جپیئے ہو
پرم پورش سکھ ساگرنا کر امرت نام اچیئے ہو
پُپ دیپ سہا سن آسن ہنس میں ہنس سمیئے ہو
کہیں کبیر سرن ستگور کی پھر نہ بھومل آئیے ہو

رادھا سوامی مذہب کی مقدس کتابوں میں ان مقامات کا مدلل اور مفصل ذکر ملتا ہے مفصل اقتباسات سے یہ مضمون بہت طولانی ہو جائیگا اس لئے ہم یہاں پر رادھا سوامی مذہب کی کتاب امرت بچن کے دیباچہ سے صرف دو سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن میں مقامات کا حوالہ اور ان کو درجہ بدرجہ طے کر کے خدا یعنی مخزن روحانیت تک پہونچنے کا ذکر ہے :۔

"سرت کو جگانے اور درمیانی منڈلوں کو پار کر کے اس کو نرمل چیتن دھام (خالص روحانی عالم) میں پہونچانے کے تین سادھنوں (مشغلوں) کا برنن کیا گیا ......"

بہر حال یہ بات صاف ہے کہ تصوف، سنت مت اور مغربی تصوف تینوں میں مقامات کا ذکر ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ انسانی جسم میں رہتے ہوئے روح کا تعلق ان مقامات سے ہو جانا کیونکر ممکن ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جسم انسانی چھوٹے پیمانہ پر عالم کبیر کی نقل ہے پس اہل تصوف جسم انسانی کو عالم صغیر کہتے ہیں، اور مغربی ممالک کے صوفی حضرات بھی اس عقیدے کی کہ خدا نے انسان کو اپنا ہم شکل بنایا (God made man after his own image) کی یہی تاویل کرتے ہیں

حدیث میں ہے، خلق اللہ آدم علی صورتہٖ[1] روح کا تعلق اِن عقیدوں کے بموجب جسم انسانی سے وہی ہے جو کہ خدا کا کونین کے ساتھ۔

(مولانا روم) زجاں تا تن بسے راہست و در تن می بماند جاں
چنیں داں جان عالم را کز و عالم جوانستے

جس طرح انسان کے اندر جسم دماغ اور روح واقع ہیں اسی طرح بقول بلاطینوس کل کائنات بھی تین عالموں میں منقسم ہے:۔ (۱) عالم روحانیت (T ὸ E'ν) Absolute unity (۲) عقل کل کا عالم (Region of universal mind) اور (۳) عالم مادی۔ اس کے متعلق شمس تبریز کی ایک غزل یہ ہے:۔

زجاں تا تن بسے راہست و در تن می بماند جاں
چنیں داں جان عالم را کز و عالم جوانستے
زشخص عالم کبریٰ چنیں پر کار بے جان ست
کہ چرخ ار بے روانستے بہ نیا بے روانستے
زمین و آسمانہا را مدد از عالم عقلست
کہ عقل اقلیم نورانی و پاک و درفشانستے
جہانِ عقل روشن را مدد ہا از صفت آمد
صفاتِ ذاتِ خلاقی کہ شاہ کن فکانستے

رادھا سوامی مذہب کی کتاب امرت بچن کا اقتباس ذیل بھی قابلِ غور ہے:۔

"جیسے استھول شریر کے پرے من اور من کے پرے سرت قائم ہے ویسے ہی رچنا میں ملین مایا دیش کے پرے برہمانڈ کا من کا دیش اور اُس کے پرے نرمل چیتن دیش واقع ہے اور جیسے منشیہ کی سرت کا نواسِ استھان ہے ویسے ہی نرمل چیتن دیش کا چھٹا مقام کل رچنا کی سرت یعنی چیتن بھنڈار[2] کا استھان ہے۔"

شمس تبریز نے اس غزل میں ترتیب کونین کے علاوہ نظام کونین[3] کا بھی ایک رمز بیان کیا ہے جو رادھا سوامی مذہب کی ایک کتاب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بالکل ملتا ہے۔

"نرمل چیتن دیش کی وسعت اور روزاری بمقابلہ دوسرے دو درجوں (برہمانڈ اور پنڈ) کے بہت زیادہ ہے

[1] جائے سکونت [2] روحانی مخزن [3] عالم کونین۔

دوسرے دو درجوں کا حال نرمل چیتن ویش کا سا نہیں ہے ان کے اندر روحانیت ایسی مکمل نہیں ہے کہ بغیر باہری مدد کے وہ اپنا کام چلا سکیں چنانچہ برہمانڈ کے ہر ایک حصہ کو اور نیز اس کے لاتعداد برہموں اور آدیاؤں کو باری باری سے ضرور مدد حاصل کرنے کے لئے نرمل چیتن ویش کے روبرو لایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس سے برہمانڈ ست لوک کے گرد چکر لگاتا ہے۔ برہمانڈ اور نرمل چیتن ویش کا سا یہ باہمی تعلق جو ابھی بیان ہوا پنڈ ویش اور برہمانڈ کے درمیان بھی قائم ہے یعنی پنڈ ویش بھی برہمانڈ کے گرد گھومتا ہے اور برہمانڈ سے مدد حاصل کرتا ہے......"

مولانا روم کا ایک اور شعر ہے:۔

چرخ و فلک باہمہ کاروکیا گرد خدا گردد چوں آسیا

مولانا روم کے یہاں رموز روحانیت منطقیانہ اور مدلل طور پر بیان نہیں ہوئے بلکہ اشاروں میں آئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ابتک گوشۂ تاریکی میں پوشیدہ ہیں۔ بلاطینوس (Plotinus) نے رموز روحانیت صاف صاف اور اختصار کے ساتھ بیان کر دئے ہیں۔ سائنٹیفک طور پر نہیں بلکہ فلسفۂ تخمینی (Speculative Philosophy) کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ لیکن رادھا سوامی مذہب میں یہ رموز مسلسل، مشرح اور سائنٹیفک پیرایہ میں مذکور ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان عالم صغیر[1] ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ تصوف سنت مت اور مغربی تصوف کے رو سے انسانی جسم میں رہتے ہوئے روح کا تعلق مقامات بالا سے کیسے ہو سکتا ہے۔ رادھا سوامی مذہب کی کتاب امرت بچن میں مذکور ہے کہ:۔

"منشیہ کے دماغ کے اندر ایسے چھدر یا سوراخ موجود ہیں جن کے اندر قائم شکتیوں کی مدد سے رچنا کے کل مقاموں سے اسی طرح میل کیا جا سکتا ہے جیسے آنکھ کے چھدر کی معرفت سورج سے میل کیا جا سکتا ہے"

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

بروں رخت ہیں بجز ایں دو بینا بسے چشم دیگر تو داری نہانی

سرمد نے بھی اسی راز کو ذیل کی رباعی میں بیان کیا تھا جس پر اہل شرع نے کفر کا فتویٰ دے دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے اور موصوف کی عُریانی کو خلاف شرع کہکر مزید کفر اُن پر واجب ٹھہرایا اور قتل کرا دیا۔ رُباعی

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد او پہن تر از سپہر پہناور شد
مُلا گوید کہ بر فلک شد احمد سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

[1] Microcosm. کرنین

مغربی صوفی بھی اس مسئلہ

"The Kingdom of God within you."

کی تاویل اسی روشنی میں کرتے ہیں

انھیں دماغی سوراخوں کو اگر آلۂ عمل بنایا جائے تو عالم بالا سے تعلق پیدا ہو جائے، یہی اصل مذہب ہے، مولانا روم کے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں:۔

روزنے جانم کشا دست از صفا ۔۔۔ می رسد بے واسطہ نامہ خدا

نامہ و باراں تو رازِ روزنم ۔۔۔ می فتد در خانہ ام از معدنم

دوزخ است آں خانہ کاں بے روزن است[1] ۔۔۔ اصل دیں اے بندہ روزن کردن است

تیشہ بر ہر بیشۂ کم زن بیا ۔۔۔ تیشہ زن بر کندنِ روزن ہلا

اسی مضمون کے چند اور اشعار مثنوی مولانا روم سے ہم پیش کرتے ہیں:۔

گفت آں رویت کجا بینیم ما ۔۔۔ گفت اندر خلوتِ خاصِ خدا

حلقۂ خاصش بتو پیوستہ است ۔۔۔ گر نظر بالا کنی نے سوے پست

اندراں حلقہ چو رب العالمیں ۔۔۔ نور می تابد چو در حلقہ نگیں

اب پیشتر اس کے کہ ان عقیدوں کا ذکر کیا جائے جو روحانی مرکزوں کی کارفرمائی کے متعلق ہیں ان عقائد کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا جو ان مذاہب کے عمل آفرینش کے بارے میں ہیں۔ بلاطینوس کا بیان ہے کہ خدا منبع روحانیت ہے۔ اس منبع روحانیت سے اُبلی ہوئی زائد روحانیت رواں ہو جاتی ہے، اور اس رواں شدہ روحانیت کو وہ Vons کہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہی Vons خالق روح ہے، وہ کہتا ہے کہ دنیا میں مادّہ اور ہمارا جسم مادّی Vons اور روح کی دھار کے نزول سے ہی ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ روح کا رجحان دو رُخہ ہے اپنے مخرج و منبع کی طرف یعنی اوپر کی جانب اور مادیت کی طرف یعنی نیچے کی جانب۔ سنت مت کی رو سے اس تخلیق کائنات سے پہلے خدا یعنی منبع روحانیت میں جوش آیا، پھر روحانیت کی دھار رواں ہوئی جس نے اپنے بہاؤ کے لئے علوی۔ سفلی۔ داخلی وخارجی سمتیں اختیار کیں، رادھا سوامی مت کہتا ہے کہ روح کی بھی یہی حالت ہے اور چونکہ دونوں کا جوہر ایک ہے اس لئے:۔

"جیتن شکتی کے جس سے رچنا ظہور میں آئی ہے[2] خواص دریافت کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک معمولی

---

[1] یعنی سوراخ مسدود ہیں کارکن نہیں۔ [2] اصل

تجربہ کی بات ہے کہ کوئی بھی پرکرتی کی شکتی (طاقت) بغیر کینذر (مرکز) اور دھاروں کے کام نہیں کر سکتی ہے۔ یعنی جب تک دھاریں جاری نہیں ہوتیں اُس وقت تک شکتی گپت یعنی مخفی رہتی ہے اور دھاروں کے پرگٹ (ظاہر) ہونے ہی پر جو ہمیشہ شکتی کے کینذر میں ہو۔ (جوش) اُٹھنے کے بعد جاری ہوتی ہیں شکتی اوکیت سے وکیت یعنی کارفرما ہوکر اپنی کریا شروع کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بغیر بھنڈار کی موجودگی کے شکتی کی دھاریں ہرگز پرگٹ نہیں ہوسکتیں۔ معلوم ہووے کہ پرکرتی کی شکتیوں نے یہ خاصہ یعنی سبھاو چیتن شکتی ہی سے جو آد شکتی ہے حاصل کیا ہے۔ اگر ہمارا یہ بچار درست ہے تو ماننا ہوگا کہ رچنا کی ابتدا بھی اسی نیم کے انوسار (مطابق) ہوئی یعنی اول چیتن شکتی کے انت اور اپار سندھ سچے کل مالک کے اندر ہو رہا موج اُٹھی اور بعد میں اس سے چیتن دھاریں پرگٹ ہوئیں اور جب تک یہ دو صورتیں ظہور میں نہ آئیں اُس وقت تک رچنا پرگٹ نہیں ہوئی اور کل مالک نے اپنے تئیں کرتار روپ میں پرگٹ نہیں فرمایا۔ اس پستک کے رچنا بھاگ میں ہم مفصل طور پر بیان کریں گے کہ چیتنیہ شکتی کی دھاروں نے کس طریقہ سے رچنا روپ وان کیا ہے۔ یہاں پر اس وقت صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ چیتن شکتی کم و بیش چمبک شکتی (قوت مقناطیسی) کی مانند کریا کرتی ہے اور کریا چھیتر (دائرۂ عمل Field of action) قائم کرتی ہے چمبک شکتی کے چھیتر میں جتنے بھی نقطے ہوتے ہیں چمبک شکتی کے اثر کی وجہ سے اُن سب پر کھینچ اس کے (چمبک شکتی کے) کینذر کی طرف رہتی ہے۔ اگر ہم درشٹی چمبک شکتی کے صرف اس کینذر کی جانب کھینچنے والے انگ پر رکھیں تو اس کے کینذر سے نکلکر چھیتر کے اندر فاصلہ تک پھیلنے کا خیال غلط ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر ہم چمبک کے سروں کی اپنے نزدیک والے آکاس (اتیھر) کے اینوں کو چمبک بنانے والی کریا کو خیال میں لاویں (جو چمبک شکتی کے چھیتر میں پھیلنے ہی سے ظہور میں آتی ہے اور جس کا کام چمبک کے دھناتمک (Positive) اور رناتمک (Negative) سروں کے گرد آکاش (اتیھر) کے دھناتمک اور رناتمک پرمانوؤں کو الگ الگ ترتیب دینا ہے تو شکتی کا چھیتر میں پھیلنا اور آکرشن یا کھینچ کی کریا کرنا دونوں صحیح ہو جاتے ہیں اور اس سے کسی آکرشک شکتی کی دھاروں کے پرگٹ ہونے کا عمل بھی ٹھیک طور سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ معلوم ہووے کہ رچنا کے شروع میں چیتن بھنڈار سے چیتن دھار کا اظہار بھی اسی ڈھنگ سے ہوا"

(یہ اقتباس رادھاسوامی مذہب کی کتاب امرت بچن کا ہے)

رادھاسوامی مذہب کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مخزن۔ دھاینت کا وہ مرکز جس میں موج پیدا ہوئی

اور پھر روحانیت کی دھار نے رواں ہو کر کونین پیدا کئے، اس کی شکل بیضاوی تھی۔ یہاں پر کتب مذکورہ بالا کا ایک اور اقتباس نامناسب نہ ہوگا:۔

"یہ درست ہے کہ کل مالک کو اپار یعنی لامحدود کہتے ہیں، پر اس کے اندر روپ کی کلپنا[1] کرنے کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن اس اپار سندھ[2] کے اندر آدی چیتن دھار کے پرگٹ ہونے کے سلسلے میں جو پرتھم[3] آکار قائم ہوا اگر اُس پر خیال کرکے کل مالک میں روپ کی کلپنا کی جاوے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ دھار پرگٹ ہونے سے پہلے بھنڈار کے اندر ہور واقع ہوئی اور بھنڈار کے جس حصہ میں ہور واقع ہوئی وہ اول مرکز یعنی شکتی کا سب سے پہلا کریا وان کیندر بنا اور رچنا میں شکتیوں کے جیسے اور کیندر انڈا کار یعنی بیضاوی شکل کے ہیں اسی طرح یہ آد کیندر (Prime Centre) بھی بیضاوی شکل لئے ہوئے تھا۔ استھول رچنا کی شکتیوں کی کریاؤں کی وجہ سے قائم جو انیک انڈا کار روپ سرشٹی میں دکھائی دیتے ہیں ان کے اندر آد روپ کی چھاپ کا صاف پتہ چلتا ہے۔"

اب شمس تبریز کی ایک غزل سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

یک جوہرے چو بیضا جوشید و گشت دریا　　کف کرد و کف زمیں شد وز دود او سما شد

الحق نہاں سپاہے پوشیدہ بادشاہے　　ہر لحظہ حملہ آورد آنکہ بہ اصل وا شد

گرچہ زمانہا شد در عالمے رواں شد　　تا نیستش نخوانی گر از نظر جدا شد

گرچہ صدف ز ساحل قطرہ ربود و گم شد　　در بحر جو یدا اورا غواص کاشنا شد

مولانا روم بھی مخزنِ روحانیت میں جوش اُٹھ کر دھار نکلنے کا ذکر کرتے ہیں اور اس مخزن کی شکل بیضاوی بتاتے ہیں۔ دوسرے شعر میں اس روحانیت کی دھار کے دورخہ ہونے کا بھی ذکر ہے اس دھار کو بادشاہ اس مناسبت سے کہا کہ آخر اُسی خدائے تعالیٰ یعنی مخزن روحانیت کی لہر ہے۔ سپاہ سے غالباً اشارہ ان ارواح کی طرف ہے جو کہ اس موج روحانیت سے وابستہ ہوتی ہیں۔ تیسرے شعر میں اس موج روحانیت کے پوشیدہ طریقہ پر کارفرما ہونے کا ذکر ہے۔ رادھا سوامی مذہب کی کتاب امرت بچن کے دفعہ ۲۰ میں درج ہے کہ "وچن ہار شکتیاں نامعلوم طور پر کام کر رہی ہیں"۔ اس عنوان کے تحت میں اس رمز کا مفصل ذکر ہے۔ بلاطینوس کا بیان ہے کہ Vous اور روح کے نزول سے مادہ اور جسم مادی کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھکر مولانا روم کے اس شعر کے مصرعۂ ثانی کو ملاحظہ فرمائیے

یک جوہرے چو بیضا جوشید و گشت دریا　　کف کرد و کف زمیں شد وز دود او سما شد

[1] خواہش [2] سمندر [3] نقش اول

مادہ کی تخلیق کے بارے میں رادھا سوامی مذہب کی کتاب امرت بچن سے اقتباسات ذیل قابل غور ہیں :-

"کال اور آدیا کی دھاریں جو ست لوک سے اُتری تھیں، یہاں پر (ترکٹی میں) برہم اور آدیا روپ میں پرگٹ ہوئیں۔ رچناتمک کریا کے سلسلے میں چھنٹوتی ہونے پر یہاں سے نہایت سوکشم پرمانوؤں (Molecules) کے غلاف روپ بادل جاری مقدار میں خارج ہوئے۔ پرمانوؤں (Molecules) سے یہاں ہمارا مطلب ان معمولی ذرّوں یا اینوں (ions) سے نہیں ہے جو انسان کے تجربے میں آتے ہیں کیونکہ وہ پرمانو ان سے انتہائی سوکشم ہیں۔ (Infinitely subtle)"

"آکاش (سما) ان پرمانوؤں میں سے جو کہ ترکٹی میں بوقت آفرینش پیدا ہو گئے ایک علیحدہ تہہ کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی وجہ سے ترکٹی کے نیچے اس کا علیحدہ مقام قائم ہے۔"

رادھا سوامی مت کے بموجب لطیف ترین سالمات (Molecules) سے کرۂ ایثر (Ethereal sphere) پیدا ہوا اور جو سالمات (Molecules) کہ مقابلۃً کثیف تھے وہ جیسے کہ درجہ بدرجہ نیچے کے مقامات پیدا ہوتے گئے کثیف تر ہوتے گئے اور بالآخر انھوں نے مادہ کی صورت اختیار کر لی۔

راز آفرینش کے سلسلے میں مولانا روم کے اس شعر :-

گرچہ صدف زساحل قطرہ ربود و گم شد — وز بحر جوید او را غواص کا نہاں شد

کے مقابلہ میں رادھا سوامی مذہب کے عقائد مندرجہ ذیل اقتباسات کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں۔ رادھا سوامی مذہب کا بھی عقیدہ ہے کہ اس خلاقِ زمین و زماں کی روحانیت کے ایک قطرے سے کل عالم کا اظہار ہوا۔ اس سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے کہ واقعی اس روحانیت کی مقدار ایک معمولی قطرے کی طرح ہے بلکہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اس لامحدود مخزن کے مقابلہ میں وہ ایک قطرے سے زیادہ نہیں۔ اقتباس ذیل ملاحظہ ہو

"یہاں رچنا ترکیبی ہوئی۔ سوئیں کھول بتاؤں سبھی + مفرد بُند ہماری آئی + دوسر مایا آن ملائی۔
........ بُند دیش ترلوکی جانو ........ آئے کیا ہم شبد اپدیشا + شبد مانہ کرو پردیشا
بُند دیش کو چھوڑو اب ہی + سندھ دیش میں کھیلو تب ہی ......"

آفرینش عالم کے بارے میں چند عقائد ابھی اور پیش کئے جائیں گے۔ رادھا سوامی مذہب کی رو سے دنیا میں جتنی طاقتیں وغیرہ بھی کام کر رہی ہیں۔ ان کے ازلی قوی (Prime Energy) روحانیت ہی کے عکس سے مستخرج ہیں۔ رادھا سوامیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا جو روحانیت کا مخزن ہے ہمیشہ سے Polarisation کی حالت میں رہتا ہے یہ کیفیت ہمیشہ سے یعنی آفرینش عالم کے قبل سے تھی

اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

"سنت مت کی اصطلاح میں وہ مقام جس شکتی سے کسی قدر کھینچ گئی تھی کل مالک کا چرن انگ کہلاتا ہے اور وہ مقام جس میں شکتی بھرپور موجود تھی اس کا مستک انگ کہلاتا ہے۔ وگیانک (سائنٹفک) پربھاشا میں ان کو چیتن شکتی کے دھناتمک اور رناتمک دھرو یعنی مثبت و منفی قطب یا سرے کہتے ہیں۔"

آفرینش سے پہلے کشش کی جن دھاروں کی معرفت منفی قطب قائم تھا

"ان کے اندر ایک ہی رخ میں کام کرنے والے بیشمار نقطے قائم تھے یہی نقطے ابتدا میں روحیں تھیں۔ ان نقطوں کی اجتماعی تحریک (United action) سے جو چیتن دھار جاری ہوئی وہ خود پرم پرش کل مالک سے سدا سنیکت تھی اور اسی کے ذریعہ سے اسکو نیوں انگ کی ساری کیفیت کا گیان پراپت تھا۔ چنانچہ کل مالک کو اس وقت بھی موجودہ رچنا کے استھول حصہ کا گیان اس کے اندر میں موجود کمزور سے کمزور چیتنیہ انش ہی کے ذریعہ سے پراپت ہوتا ہے۔"

بلاطینوس کے یہاں بھی اس مرکزی کشش انفصالی Centrifugal Action اور اس کے ذریعہ خدا کو عالم مادی کے علم ہونے کا بیان ہے۔ روحوں کے اندر جو اجتماعی تحریک مخزن کی جانب تھی اس کے برعکس انفرادی تحریک تھی اور رادھا سوامی مذہب کے بموجب یہ انفرادی تحریک جو مخزن کے خلاف سمت تھی روح۔ کے نیچے کے طبقات میں نزول کا باعث ہوئی اور اسی کو سنت مت کی اصطلاح میں خودی یا 'اہنکار' کہتے ہیں۔ بلاطینوس کا بھی یہی بیان ہے کہ روح کے نیچے کی طرف نزول سے جسم مادی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ خواجہ عطار نے بھی ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ روح نے اپنی تصویر بنائی اور اُس سے ہم آغوش ہونا چاہا۔ مغربی تصوف میں بھی Originalsin (ابتدائی گناہ) کی تاویل یہی کی ہے کہ روح کا رجحان پستی کی طرف ہے۔ بلاطینوس کہتا ہے کہ روح کا نزول مادی دنیا میں اُس کے ارادے سے نہیں بلکہ Instinctive Necessity[1] کے تابع ہوا ہے۔ رادھا سوامی مذہب کی رو سے تمام مخلوق کی تخلیق منفی قطب میں ہوئی۔ مولانا روم فرماتے ہیں:۔

داؤد گفت اے بادشاہ چو بے نیازی تو زما | حکمت چہ بود آخر تراد خلقت ہر دو سرا
حق گفتش اے مرد زماں گنجے بدم من درنہاں | جستم کہ تا پیدا شود آں گنج در ویرانہا
آئینہ کردم عیاں پشتش جہاں رویش دلت | پشتش بود بہتر ز رو گر تو ندانی رو زپا

---

[1] ضرورت جبلی

رادھا سوامی مذہب کا بیان ہے کہ جب اس خالق المخلوقات نے کائنات کو پیدا کیا تو لاتعداد روحیں جو کہ قطب منفی میں واقع قطب مثبت کی سرحد سے نزدیک ترین تھیں اور جن میں انفرادی تحریک کا غلبہ بہت زیادہ نہ تھا تاہم آفرینش عالم سے بوجہ انفرادی تحریک بیہوش تھیں بیدار ہو گئیں اور انفرادی تحریک کے غلاف سے عریاں ہو کر روحانیت سے سرشار ہو گئیں جو روحیں اس طرح فیضیاب ہوئیں ان کی تعداد ان روحوں کے مقابلہ میں جو نیچے کے طبقات میں پیدا کی گئی ہیں کہیں زیادہ تھی اور کل قطب منفی قطب مثبت کے مقابلہ میں وہ حیثیت رکھتا ہے جو کہ ایک بادل کا ٹکڑا آسمان کے مقابلہ میں۔ پس خدا کے لامحدود ہونے پر کوئی اعتراض واجب نہیں آتا۔ امرت بچن کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:-

"مالک کے جوہر کی سرتہ دھار کی آمد سے نچلے درجوں کا وہ حصہ جو کل مالک کے قریب تھا اور جس کی وسعت باقی کے حصوں سے بہت زیادہ تھی فوراً ہی امر اور اناشی بنا دیا گیا اور اس میں ایسی چیتنتا بھر دی گئی کہ وہ دیش کا دیش مجموعی طور پر چیتنیہ ہو کر ہمیشہ کے لئے نج بھنڈار کے ساتھ ایک ہو گیا۔ اس دیش کے باسی بھی جن کی تعداد باقی درجوں کے باسیوں کی نسبت بیرون از قیاس زیادہ ہے خواب غفلت سے بیدار ہو کر اناشی اور ایک رس قائم رہنے والے پرم سکھ ایک جیون کو پراپت ہو گئے"

اب مقابلہ کے لئے اشعار مولانا روم ملاحظہ ہوں:-

خورشید رخت چو گشت پیدا — نمود ہزار سر و بالا
آں لحظہ چہ بود عین آں موج — آں موج چہ بود عین دریا
ہر جزو کہ بود عین کل شد — پس کل باشد سراسر اجزا
اجزا چہ بود مظاہر کل — اشیا چہ بود ظلال اسما
اسما چہ بود ظہور خورشید — خورشید جمال ذات والا
ہر ذرہ ز مہر نور رویش — خورشید صفت شد آشکارا
اے شمس تو ایں حدیث بگذار — سر دو جہاں مکن ہویدا

دیوان شمس تبریز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

زہے خورشید جاں افزا کہ یک تابش چو شد پیدا — ہزاراں جان انسانی بروئید از گل تیرہ

اشعار مندرجہ بالا میں اسما کی تفسیر لازمی ہے۔

اسما چہ بود ظہور خورشید — خورشید جمال ذات والا

اس شعر کو نظرِ غائر سے دیکھئے اس میں ایک رمزِ روحانی منکشف ہوتا ہے۔ رادھاسوامی مذہب کی رو سے ہر طبقہ کی مرکزی طاقت اسی طبقہ کی sub-deity ہے۔ مغربی تصوف کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ رادھاسوامی مذہب کہتا ہے کہ ہر طبقہ میں جب وہاں کی مرکزی طاقت (Sub-deity) سے روحانیت کی دھار رواں ہوتی ہے اور اس مرکزی طاقت کا اظہار ہوتا ہے تو ایک آواز پیدا ہوتی ہے اور اس آواز کی نقل انسانی بولی میں اس sub-deity کا روحانی نام ہے۔ اسمِ اعظم وہ آواز ہے جو اول اول اصل مرکز یعنی خدا میں پیدا ہوئی۔

"In the begining was word and the word was God"

کی صوفیانہ تاویل یہی ہے۔ امرت بچن کے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

"ہر ایک منڈل یا استھان ایک ایک مرکزی شکتی کے آسرے قائم ہے جس کو اس استھان کا دھنی کہتے ہیں۔ وہ دھنی اس استھان کی شکتی یا جان کا بھنڈار یا کیندر ہوتا ہے اور اس سے اتپن (پیدا) ہو کر شکتی کی دھاریں استھان کے اندر پھیلتی ہیں جن کے سنگ (ساتھ) خاص طرح کی گنجار یعنی آوازیں بھی شامل رہتی ہیں"

"جن ناموں کی نسبت اوپر ذکر ہوا وہ سب دھنیاتمک نام (روحانی نام) ہیں یعنی مختلف استھانوں کے شبدوں کی انسانی بولی میں نقل ہیں"

Discourses on Radhaswami Faith کے ضمیمہ (د) صفحہ ۲۳۴ کی چند سطور کا ترجمہ بھی ملاحظہ ہو:۔

"یہ نام انسانی بولی میں نقل اس آواز کی ہے جو روحانی موج اور روحانی مرکز سے پیدا ہو رہی ہے اور جس کی معرفت کل عالم کی تخلیق خدائے تعالیٰ نے کی ہے"

عقائد مذکورہ بالا کے بموجب مرکز میں روحانی آواز کا پیدا ہونا اظہار اس مرکزی طاقت کا ہے اور یہ آواز اور اظہار لازم و ملزوم ہیں۔ اس آواز کے اندر تمام خواص اس مرکزی طاقت کے موجود ہوتے ہیں، اس رمز کو خواجہ معین الدین چشتی نے شعر ذیل میں بیان فرمایا ہے۔

میان اسم و مسمیٰ چو فرق نیست ببیں — تو در تجلی اسماء جمال نام خدا
اسماء چہ بود ظہور خورشید — خورشید جمال ذات والا

اس شعر میں اسماء کی جو تفسیر ہم نے کی ہے اس کی تائید میں ہم اقتباس ذیل کتاب "نشاء لطیف" مصنفہ ملا رام سے پیش کرتے ہیں

The Sufis hold that the names of the Real Being contain the Distinct forms Called in the divine science اعیان ثابتہ and the intellectual forms (Called in Persian صور علیہ) Received existence in eternity without begining by فیض emanation from the essence of God."

کبیر صاحب فرماتے ہیں:-

سادھو شبد سادھن کی جے + جیہی شبد تے پرکٹ بھئے سب + سوئی شبد گہہ لیجے

شبد گورو شبد سن سشیہ بھئے شبد سو برلا بوجھے

سوئی سشیہ سوئی گورو مہاتم جیہہ انترگت سو جھے۔

شبد بید پران کہت ہیں شبد سب ٹھہراوے

شبد سُر منی سنت کہت ہیں شبد بھید نہیں پاوے۔

شبد کایا جگ اتپاتی شبدے کیر پسارا

کہیں کبیر جہاں شبد ہوت ہے تون بھید ہے نیارا۔

اس نظم میں شبد گورو سے مطلب مرشد کا روحانی پیکر ہے جو روحانی آواز اور نور سے بنا ہوا ہے وہ روحانی آوازیں جو کہ مختلف طبقات میں ہو رہی ہیں اور جن کا ذکر فقرا اور سنتوں نے کیا ہے خاص طور پر پانچ ہیں، اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں۔

"پانچ نام کا سمرن کرو، شام سیت میں سوات دھرو۔" (سار بچن)

"گھر میں گھر دکھلا دے سو ستگور پورش سجان پنج شبد دھن کار دھن تہ باجے شبد نشان" (گورونانک)

خاموش پنج نوبت بشنو ز آسمانے کاں آسماں بروں زاں ہفت ایں شش آمد (از دیوان شمس تبریز مولانا روم)

صوفی فقرا اور سنت مت کے بانیوں نے تعلیم اسی آواز کے شغل کی کی ہے کبیر صاحب کی تلقین اوپر درج ہو چکی، اب دیکھئے مولانا روم کیا فرماتے ہیں:-

از مسلمان و یہود و ترسا ہر سحر بانگ دعا می آید

خنک آں بندہ کہ در گوش دلش زا سماں بانگ صلا می آید

گوش دل راز ہوس پاک کنید زانکہ بانگے ز سما می آید

خواجہ نیاز علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:-

امر ربی ست روح و سِرِ خدا است ذکر بے کام و بے زباں او راست

حیف در بند جسم ماندستے نشنوی صوت پاک رحمانی

یار با ہر دم ست با تو کلیم — حیف تو نشنوی کلام قدیم
ہمہ عالم پُر است از آواز — لیک در ہائے گوش خود کن باز
باز کردن ہمیں بس ست ترا — بند سازی رہِ شنیدن[1] را
بشنوی یک کلام نا مقطوع — از حدوث و فنا بود مرفوع
اول و آخرش چو بے حد شد — زاں سبب نام او بہ انحد[2] شد
عالم صوت از و ظہور گرفت — از حضورش بساط نور گرفت
بشنو آں بانگ پُر سرور از گوش — کن فراموش خویش را ذی ہوش

رادھا سوامی مذہب کی کتاب Discourses on Radhaswami Faith کے ضمیمہ اول کے صفحہ ۲۲۳ کی چند سطور کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

"روح کا آواز مذکورہ کے ساتھ وصل حاصل کرنا کلی توجہ کے ساتھ اُس آواز کو سننا ہے جو کہ روح کی دھاروں یا Sensory Current کے ساتھ جو کہ دماغ میں رواں ہے پیدا ہو رہی ہے اور جس کا رخ اوپر اور اندر کی طرف ہے۔ Motor Current کے ساتھ بھی آوازیں پیدا ہوتی ہیں مگر ان سے پرہیز واجب ہے کیونکہ ان کا رخ نیچے اور باہر کی طرف ہے۔"

مولانا روم بھی بالکل یہی ہدایت فرماتے ہیں:۔

چرخ را در زیر پا آرے شجاع — بشنو از فوقِ فلک بانگِ سماع
ہر ندائے کاں ترا بالا کشد — آں ندائے داں کہ از بالا رسد
آں ندائے کاں ترا حرص آورد — بانگِ گرگے داں کہ او مردم درد

روح کی دھار کی روانی کے متعلق بھی مولانا روم کے بیان سے سنت مت کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا روم کا شعر ذیل ملاحظہ ہو:۔

بر عاشقاں فریضہ بود جستجوئے او — بر روے سر چو سیل روانست بجوئے او

مغربی تصوف کی رو سے، روح اس قالب انسانی میں (Pineal Gland) میں واقع ہے۔

---

[1] گوشِ ظاہر

[2] خواجہ نیاز علیہ الرحمہ کا مطلب अनहद शब्द سے ہے چونکہ وہ ہندوستان میں رہے ہیں اس لئے انھوں نے ہندو فقراء کا یہ اصطلاحی لفظ اس روحانی آواز کے لئے استعمال کر دیا ہے ہندی میں अनहद کے معنی ہیں جسکی حد نہ ہو۔ چونکہ یہ روحانی آواز مسلسل جاری ہے اسی اعتبار سے اُسے अनहद शब्द کہا گیا ہے۔ جیسا کہ خواجہ نیاز بھی فرماتے ہیں اور وہ بھی اس کو کلام نامقطوع کہتے اور بے حد کہتے ہیں۔

سنت مت بھی روح کی نشست کے متعلق بیان مندرجہ بالا کا موید ہے۔ مولانا روم بھی فرماتے ہیں:-

ع اقبال کف پائے تو بر چشم نہادہ

قرآن شریف میں بھی مذکور ہے نَحْنُ اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ گورو نانک بھی یہی پتہ دیتے ہیں فرمایا ہے:-

سکھمن کے گھر راگ سُن۔ سُن منڈل لو لائے

سکھمنا ناڑی اسی حبل الورید کو کہتے ہیں۔ تلسی (راماین کے مصنف نہیں بلکہ ایک اور مشہور فقیر) فرماتے ہیں ع

راستہ شہ رگ میں ہے جاناں کے جانے کے لئے

رادھا سوامی مت کی یہ ہدایت ہے کہ روح کو اس کی نشست کے مرکز میں بیدار کیا جائے اور روحانی آواز کی کشش بالائی و اندرونی کی مدد سے بالائی مرکزوں کی جانب رواں کی جائے تاکہ ان مرکزوں میں بیدار ہو کر بالائی طبقوں سے ہم آہنگ ہو سکے جسم انسانی کے اندر رہتے ہوئے معراج روحانی کا یہی ذریعہ ہے۔ اسی درجہ بدرجہ معراج اور انسان کے اندر ان بالائی طبقات سے مطابقت رکھنے والے مرکزوں کے واقع ہونے کی طرف شعر ذیل میں اشارہ کیا ہے:-

زاں دم کہ آمد ستی اندر جہان ہستی بہشت کہ تا بر ستی بنہادہ نردبا نست

اسی شغل کو سنت مت کی اصطلاح میں سرت شبد ابھیاس اور اہل تصوف کے یہاں شغل صوت کہتے ہیں، ان روحانی آوازوں کا سننا سخت دشوار رہے، کامل یکسوئی لازمی ہے۔ ان روحانی آوازوں کے سُن سکنے کے لئے اور دو ابتدائی شغل سنت مت میں اور اہل تصوف کے یہاں بتلائے گئے ہیں۔ انھیں اہل تصوف کے یہاں ذکر و فکر اور سنت مت کی اصطلاح میں سمرن اور دھیان کہتے ہیں۔ اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:-

"لیکن چونکہ چیتن شبد نہایت سوکشم ہیں اس لئے جب تک دو سرے دو سادھن کر کے جن کا ذکر آگے کیا جائیگا سرت کی گپت شکتیاں کسی قدر جگائی نہ جاویں...... چھ ہفتہ یا دو مہینہ تک نام کے سمرن اور چیتن سروپ کے دھیان کا سادھن کرنے پر یہ ابھیاس شروع کر دیا جاتا ہے۔" (از کتاب امرت بچن)

مولانا روم بھی ہدایت فرماتے ہیں:-

چنداں دعا کن در نہاں چنداں بنال اندر شباں کز گنبد ہفت آسماں در گوش تو آید صدا

(از دیوان شمس تبریز)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عقیدہ یہ ہے کہ صحیح و کامیاب ذکر (سمرن) وہ ہے جو کیفیت فکر (دھیان) کی پیدا کر دے۔ سندھ کے مشہور صوفی فقیر شاہ عبداللطیف فرماتے ہیں :-

الذّکر بلا فکرٍ کالشجرۃ بلا ثمرٍ (اقتباس شاہ عبداللطیف مصنفہ للارام صفحہ ۲۶)

فکر (دھیان) صحیح و کامیاب وہی ہے جو سالک کو روحانی آوازیں سنائی دے جانے کا موجب ہو۔ رادھا سوامی مذہب کی کتاب ست سنگ کے اُپدیش سے اقتباس ذیل پیش کیا جاتا ہے :-

"سمرن نام کا وہی درست ہے جس سے انتر میں دھیان بنے اور دھیان وہی درست ہے جس سے انتر میں شبد دھار پر گٹ ہو اور شبد دھار کا سننا وہی درست ہے جس سے دیہہ اور سنسار کی سدھ بسر کر انتر میں چیتن گھاٹ کے تجربے حاصل ہوں اور چیتن گھاٹ کے تجربے وہی درست ہیں جو سرت کو سچے مالک کی طرف لے جائیں۔۔۔۔"

مولانا روم فرماتے ہیں :-

در عالم دل نداشنیدن آخر نہ بروے آں[1] پری بود

دیگر :-

چنداں ہمی کن یاد حق کز خود فراموشت شود تا محو در مدعو شوی بے ریب داعی و دعا

ذکر (سمرن) کے متعلق اقتباس ذیل ملاحظہ ہوں :-

"نام تو بہت لوگ جپتے ہیں مگر اصل فائدہ تھوڑے ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو نام کے جپنے کا طریقہ معلوم نہیں ہے۔ کوئی محض زبان سے نام جپتا ہے کوئی دل سے۔ اصل فائدہ تب حاصل ہو جب روح کی زبان سے نام کا ذکر کیا جائے۔"

(از کتاب ست سنگ کے اُپدیش)

حضرت فریدالدین عطار فرماتے ہیں :-

یاد حق آمد غذا ایں روح را مرہم آمد ایں دل مجروح را

مومنا ذکر خدا بسیار گو تا بیابی در دو عالم آبرو

عام را نبود بجز ذکر زباں ذکر خاصاں باشد از دل بے گماں

ذکر خاص الخاص ذکر سر بود ہر کہ ذاکر نیست او خاسر شود

ہندو سنتوں اور مسلمان فقرا نے کسی مقام کی آواز کو گھنٹہ اور سنکھ، کسی مقام کی آواز

[1] تصور مرشد۔

کو ڈھول سے اور اسی طرح مختلف مقامات روحانی کی آوازیں مختلف نغموں سے متشابہ بتلائی ہیں۔ اس بارے میں بھی دونوں کے بیانات میں اتفاق کلّی پایا جاتا ہے۔ مقام ترکٹی کے متعلق جو برہمانڈ یعنی عالم عقل کل Region of Universal Mind میں واقع ہے، کبیر صاحب فرماتے ہیں:-

ترکٹی محل میں بڈیا سارا دھن ہر گرجیں بجیں نگارا (کبیر)

مولانا روم فرماتے ہیں:-

ع عالم چہ داند جز دُہل از عیدگاہِ عقل کل (از دیوان شمس تبریز)

سلسلۂ معراج میں جب روح نیچے کے طبقات کو عبور کرکے عالم عقل کل کے بالائی طبقہ سے تعلق پیدا کر لیتی ہے تو مادیت اور عقل سفلی (Lower Mind) کے بار سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:-

آمد زجاں بانگِ دُہل تا جزوہا آید بہ کل ریحاں بہ ریحاں گل بہ گل از حبس خارستانِ ما (از دیوان شمس تبریز)

مقابلہ کے لئے رادھا سوامی مذہب کی کتاب سار بچن کی سطور ذیل ملاحظہ ہوں:-

بجے سہاون گھٹ میں ڈھول سُن سُن بوجھ گرا ہوئی ہول

پہلے یہ روحانی آوازیں دُور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، مگر ان کی کشش رفتہ رفتہ سالک کی روح کو اوپر کھینچتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ روح اس مرکز میں پہونچ جاتی ہے جہاں کہ وہ آواز سنائی دیتی تھی۔ ابتدا میں سالک کامل یکسوئی قائم نہ رکھ سکنے کے باعث اس مرکز تک نہیں پہونچ سکتا پس اُسے وہ آوازیں دُور ہی سے سنائی دیکر رہ جاتی ہیں۔ پس خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اقتباس ذیل سے پتہ ملتا ہے کہ محمد صاحب بھی شغل آواز مستقیم کرتے تھے:-

"چوں آنحضرت (محمد) بسن چہل سالگی رسید آثار وحی بروے ظاہر گشت بروایتے آنکہ پانزدہ سال پیش از وحی آواز مستقیم می شنید و خوابہائے راست میدید و ہفت سال پیش از وحی انوار تجلیات می دید و در سال یک مرتبہ بغار حرا میرفت و یک ماہ بہ عبادت مشغول می شد۔"

(اقتباس از الانوار مصنفہ مولانا شیخ محمد اکرم صابری)

(باقی آئندہ)



# مفلس کا بچہ

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

سرد انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے — رو رہا ہے ایک بچہ، اک دکاں کے سامنے
اک کھلونے کی طرف انگلی اٹھا کر بار بار — کچھ نہیں کہتا ہے، لیکن رو رہا ہے زار زار
باپ کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے دنیا سیاہ — رخ پہ گرد مفلسی ہے، جیب خالی پر نگاہ
آتے جاتے اہل دولت کی بھی پڑتی ہے نظر — کچھ نہیں پڑتا مگر ان کے تبسم پر اثر
باپ کی نمناک آنکھوں میں ہے تکمیل یاس — کیا قیامت ہے، پسر کے آنسوؤں کا انعکاس
دل ہوا جاتا ہے بچے کے بلکنے سے فگار — کہہ رہا ہے زیر لب، فریاد اے پروردگار

واہ کیا تقدیر ہے اس بندۂ محروم کی
ہو چلی ہیں انگلیاں ٹھنڈی مرے معصوم کی

## غم انگیز کھلونا

ہاں یہی ہے وہ کھلونا اے دل آشفتہ حال — کھیلتا پھرتا ہے جس سے ایک طفل خورد سال
ہاں یہی ہے وہ کھلونا۔ دیکھ چشم اشکبار — جس کی حسرت میں، مرے بچے کا دل تھا بیقرار
اس کھلونے کی سبک گل کاریوں کے درمیاں — ثبت ہیں اک خفتہ قسمت باپ کی محرومیاں
اس کا آب و رنگ ہے آئینۂ عبرت فزا — یہ مگر رنگ پریدہ ہے کسی مایوس کا
اس کے آئینوں میں ٹکڑے ہیں دل محروم کے — اس کی تابانی میں آنسو ہیں کسی معصوم کے
اس میں غلطاں ہے کسی بچے کا شوق مضمحل — اس کے سینے میں دھڑکتا ہے کوئی ننھا سا دل

کھیل دولتمند بچے! تو سدا پھولے پھلے
ہم ادھر ہنستے ہوئے آئے تھے اور روتے چلے

# ہندوستان کی مشترکہ زبان

(از مسٹر سلیم جعفر)

آجکل ہمیں ایک ایسی زبان کی تلاش ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں آسانی سے سمجھ سکیں جسے دونوں اپنا کہہ سکیں، اور جس کی رسم تحریر اگر بدل جائے تو بھی حقیقت پر پردہ نہ پڑے، یعنی بعینہٖ وہی کیفیت ہو جو ہندوستانی جنٹلمین کی ہے کہ چاہے وہ سوٹ بوٹ پہن لے چاہے اچکن پائجامہ ہر حال میں ہندوستانی کا ہندوستانی ہی رہتا ہے۔

ایسی زبان کا پیدا ہونا ایک معجزے سے کم نہیں، کیونکہ ملک میں اس کے پیدا ہونے کے اسباب ہی سرے سے ندارد ہیں، بلکہ اعتراف حقیقت یہ ہے کہ حالاتِ موجودہ اس کے مخالف ہیں اور ان کا دور کرنا محال ہے۔ تاوقتیکہ ملک کی ذہنیت نہ بدل جائے۔ انقلابِ ذہنیت بذاتِ خود ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔

اپنی اپنی ذہنیت کی بنا پر ایک مسلمان کا بچہ جب میدان تعلیم میں قدم رکھتا ہے تو اس کو سال دو سال تک خالص اردو کی کتابوں سے سابقہ پڑنے کے بعد فارسی یا اردو سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ہندو کا لڑکا ہندی کی بہت ہی ابتدائی منزلوں سے نکلتے ہی سنسکرت حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب تک دونوں کی وسعت نظر ہندی یا اردو کی کتابوں تک محدود رہتی ہے اُن کے سامنے شاذونادر ہی ایسے نمونے آتے ہیں جو اُن کو روزمرّہ یا اگر میں اس کو غلط نہیں سمجھتا ہوں تو آسان و عام فہم زبان کے دائرے سے باہر لے جائیں۔ ابھی تک ان کے خیالات کی پرواز بھی بلند نہیں ہوتی۔ ان کی ضرورتیں بھی اتنی کم ہوتی ہیں کہ روزمرہ ان سب کو نہایت آسانی سے پورا کر دیتا ہے۔ لیکن عمر اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ خیالات میں جو وسعت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے اظہار کے لئے کسی طرح روزمرہ کی پابند نہیں رہ سکتی۔ وہ فوراً اس کی کمزور زنجیروں کو توڑ دیتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ وسعت خود ایک خارجی اثر کا نتیجہ ہوا کرتی ہے اور جو ذخیرۂ الفاظ کلاسیکل زبانوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلے لڑکے نے گھر میں یا گھر کے باہر حاصل کیا تھا وہ کچھ تو ناکافی ہو جاتا ہے اور کچھ کلاسیکل زبان اسے اظہار خیال کے لئے ایسے لفظ سکھا دیتی ہے جو خیال کے ساتھ ساتھ زبان پر آجاتے اور قلم سے نکل جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اس کی

کیفیت اُس شخص کی سی ہوتی ہے جسے کسی چیز کی ضرورت ہو اور اُس کا خیال آتے ہی وہ چیز خود بخود اُس کے سامنے آجائے، اور وہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسے بے پس وپیش اُٹھا کر کام میں لے آئے۔ جس کی عمر کا ایک بہت بڑا حصّہ اور خاصکر وہ حصہ جب کہ لوح دل بے تامّل ہر قسم کا نقش قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ ایک اجنبی فضا میں گزر رہا ہو، اُس سے اس کے سوا کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ اس کی زبان وقلم سے جو کچھ نکلے گا اُس پر اجنبیت کا رنگ چڑھا ہو گا اگر ہماری تعلیم خالص اُردو یا ہندی ادب تک محدود ہوتی اور کلاسیکل لٹریچر سے ایک ایسی منزل پر دو چار ہوتے جبکہ خیالات میں پختگی آ چکتی اور وسعت زیادہ تر "سودیشی" اثر کا نتیجہ ہوتی تو تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے ثقالت کوسوں دُور رہتی کیونکہ جو تعلیم خیالات میں وسعت و پرواز پیدا کرتی وہی اُن کے لئے لفظ بھی سکھا دیتی اور زبان پر اجنبی رنگ چڑھنے میں مانع ہوتی۔ اب ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ٹھیٹھ اُردو اور ہندی کے لفظ ہی نہیں معلوم، دوسری طرف یہ حالت کہ ایک گڑھا گڑھایا لفظ سامنے موجود، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یقین کہ جو پڑھے لکھے ہیں وہ اس کو سمجھتے ہیں، پھر اس کے استعمال سے دریغ کے کیا معنی؟

لیکن سنسکرت اور عربی ہی کی گردن پر سارا بوجھ نہیں رکھا جا سکتا۔ موجودہ تعلیم انگریزی کے بغیر ادھوری مانی جاتی ہے۔ سنسکرت اور عربی وفارسی کو ہندی اور اُردو سے کچھ نہ کچھ لگاؤ تو ہے اِس بدیشی زبان کو اِن دونوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ میں یہاں لسانیاتی حیثیت سے بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ دونوں زبانوں کی بولنے والی قومیں بر اعظم ایشیا سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے ان کی معاشرت میں بہت سی باتوں میں ہم رنگی وہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کے لئے بہت سے لفظ ملتے ہیں جو خیالات مشترک ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں اسلوب بیان بھی ایک ہی ہے۔ اس لئے اگرچہ سنسکرت اور عربی وغیرہ اُردو اور ہندی پر اثر انداز ہوتی ہیں مگر طرز ادائے خیال کا تختہ نہیں الٹتیں اور اجنبیت کا رنگ چڑھنے پر بھی وہ ہلکا ہی رہتا ہے اور آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ لیکن انگریزی کی تعلیم تو ستم ہی ڈھاتی ہے اُردو یا ہندی سے ناواقفیت اور اُس کے مقابلے میں انگریزی سے اچھی خاصی واقفیت، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ بلکہ یوں کہئے کہ ہر وہ شخص جس پر تعلیم یافتہ کی تعریف صادق آتی ہے بالعموم اس سے بے بہرہ ہوتا ہے کہ ٹھیٹھ اُردو کا اسلوب بیان کیا ہے۔ وہ بے تکلف اظہار خیال کے لئے قریب قریب انگریزی کے لفظی ترجمے کی طرف مائل ہو جاتا ہے جیسے بعض وقت مجھ سا

پڑھا لکھا جاہل بھی دیکھکر گھبرا جاتا ہے۔ اگرچہ میں اس کا مدعی نہیں کہ مجھے اُردو آتی ہے یا میری زبان پر انگریزی کا اثر نہیں آخر میں بھی تو موجودہ تعلیم ہی کا نتیجہ ہوں، ایسا تعلیم یافتہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار رہتا ہے، اپنی زبان دست گیری نہیں کرتی اور مقابلۃً غیر زبان دست اعانت دراز کرتی ہے وہ شکریہ کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس منجدھار سے نکل جاتا ہے اور جب یوں زبان میں اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے اس میں ثقیل نامانوس لفظ بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ بے شبہ موردِ الزام ہیں جو بے وجہ عربی فارسی یا سنسکرت کے لفظ اپنی عبارت میں لکھتے ہیں، اس کو بجا طور سے شوق خود نمائی کہہ سکتے ہیں لیکن جنھیں اس کا الزام نہیں دیا جا سکتا وہ بھی لفاظی سے نہیں بچ سکتے۔ اخبار و رسائل کی زبان بیشک وہ زبان نہیں جو ہم گھروں میں بولتے ہیں لیکن اکثر موقعوں پر "لغت آرائی" سے دامن بچانا محال ہے

دو تین سال ہوئے ٹائمز آف انڈیا میں کسی نے اس بحث کا جواب دیتے ہوئے کہ ہندوستان کی عام زبان بننے کی کس زبان میں صلاحیت ہے۔ اس ملک کی ساری زبانوں کو ناقابل توسیع اور مشکل قرار دیکر لکھا تھا کہ صرف انگریزی ہی اس کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بہت سی وجہوں میں سے ایک وجہ یہ بھی بتائی تھی کہ انگریزی میں "یک جزے" لفظ بہت رائج ہیں۔ اور اردو ہندی عربی فارسی اور سنسکرت کے "کثیر جزے" اور ثقیل لفظوں سے کام لیتی ہے۔ میرے ایک دوست نے جو انگریزی پڑھے ہوئے ہیں اثنائے گفتگو میں انگریزی کی حمایت کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ٹائمز کہتا تو سچ ہے۔ میں نے مؤدبانہ عرض کی کہ یہ ضرور نہیں کہ جو کچھ وہ کہے اسے ہم بے چون و چرا مان لیں لفظوں کی نوعیت خیال کے تابع ہے۔ اور جس خیال کو ادا کرنے کے لئے جو لفظ اہل زبان نے تراشا یا استعمال کیا ہے وہی بولنا اور لکھنا پڑیگا۔ اس کی لمبائی چوڑائی اس کو مردود نہیں بنا سکتی۔ انھیں دق کرنے کے لئے میں نے یہ بھی کہا کہ آپ ماشاء اللہ گریجویٹ ہیں لوکل سینیر کیمبرج تک یوروپین اسکول میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے ذرا آپ "Administratively impossible" کے لئے دو "یک جزے" لفظ تو تلاش کر لائیے۔ آج تین سال کے قریب ہونے کو آئے مگر ابھی تک ڈھونڈھ ہی رہے ہیں۔ جو خیال یہ لفظ ظاہر کرتے ہیں، اگر اُردو یا ہندی میں ظاہر کرنا پڑے تو مجبوراً سنسکرت یا عربی فارسی کی مدد لینی پڑے گی۔

انگریزی ہم پر اس طرح چھائی ہوئی ہے جس طرح کسی زمانے میں عربی اور فارسی چھائی ہوئی تھیں اس زمانے میں ہم دانستہ یا نادانستہ اِن زبانوں کی کورانہ تقلید پر تلے ہوئے تھے۔ آج انگریزی ہمارا

چشمۂ فیض ہے اور وہی حالت۔ انگریزی داں تو قابلِ معافی ہیں کیونکہ اُن کا ذوقِ ادب بگڑ چکا لیکن وہ لوگ جنھیں اس کا خطاب نہیں دیا جاسکتا اُن کی عبارتوں میں بھی اِس کے اثر کی جھلک نظر آتی ہے۔

خیر یہ باتیں بہ سبیلِ تذکرہ تھیں، مسئلہ جو درپیش ہے وہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں کوئی ایسی زبان موجود ہے یا آئندہ بن جائیگی جسے ہندو اور مسلمان دونوں اپنا لیں۔ میں سطور بالا میں عرض کرچکا ہوں کہ ذہنیت مانع ہے، پہلے تو آپ دونوں کی ذہنیت بدلئے، اور اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں میں سے ایک کو اس پر راضی کرلیجئے کہ جو زبان اِس وقت اس کا چشمۂ فیض بنی ہوئی ہے اس کو چھوڑکر وہ اس چشمے سے اپنی پیاس بجھائے جس سے دوسرا فیضیاب ہے پھر بیڑا پار ہے۔ اگر آپ یہ کوشش نہیں کرسکتے تو پھر آپ کا یہ تقاضا کہ ایک کو دوسرے سے شکایت نہ ہو اور ایک دوسرے کے مذاق کو پسند کرنے لگے بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص سے جو عمر بھر کھاری پانی پیتا رہا ہے اور بربنائے عادت اُسے پسند کرتا ہے یہ کہنا کہ تو میٹھا پانی پیتے ہی اسکی داد دے یا اس کے برعکس۔ اگر چشمۂ فیض نہیں بدل سکتا تو اس کا پتا لگانا بھی دشوار ہے کہ ایک دوسرے کی سمجھ اور علم سے کونسا لفظ باہر ہے اور وہ کسے پسند اور کسے ناپسند کرتا ہے۔

اُردو جس وقت اور جس صورت میں بنی ہے اُس وقت خواہ ضرورتاً خواہ مصلحتاً دونوں نے ایثار سے کام لیا تھا اور دونوں میں ایک قدرِ مشترک موجود تھی یعنی فارسی جس پر اور بدیسی زبانوں کا اثر پڑ چکا تھا۔ اس وقت قدرِ مشترک بدل چکی، اس کی جگہ انگریزی نے چھین لی اور دونوں نے اپنے اپنے مذاق کی الگ الگ آب و ہوا میں پرورش شروع کردی اور اپنے اپنے معیارِ فصاحت و بلاغت مقرر کرلئے۔ اس حالت میں سوا اس کے کہ یا تو ہندو اُردو اور اُس کی معاون زبانوں کی طرف مائل ہوجائیں یا مسلمان ہندی اور اُس کی معاون زبانوں کی طرف متوجہ ہوں۔ کسی صورت سے ایک نئی زبان جو دونوں کو یکساں آلۂ اظہارِ خیال کا کام دے پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ انگریزی جسے قدرِ مشترک کا درجہ حاصل ہے اس کے بہت سے لفظ اور اسلوب بیان ہندی اور اُردو دونوں میں زبردستی داخل ہوجائیں گے کوئی لاکھ چیختا چلاتا رہے۔

اگر ایک زبان کا پیدا کرنا ضروری ہے، تو اور نہیں تو ہندو اور مسلمان اسی پر رضامند ہوجائیں کہ دونوں اپنے اپنے بچوں کو ہندی اور اُردو دونوں زبانیں مدرسوں میں پڑھوائیں گے اور جو اہمیت اس وقت انگریزی کو حاصل ہے اُس کی جڑ کاٹ دیں گے، دفتروں کی زبان بدلوا دیں گے، عدالتوں میں

فیصلے ملکی زبانوں میں لکھے جائیں گے اور وکیل ملکی زبانوں میں بحث کریں گے، کیونکہ ان باتوں کے بغیر انگریزی کی اہمیت پر آنچ نہیں آسکتی۔ آج دفتروں اور عدالتوں میں اس کی کوئی قدر نہیں جو اچھی اُردو یا ہندی لکھتا ہے بلکہ اس کی پوچھ ہے جو "بابو انگلش" اچھی لکھتا ہے۔ پھر کوئی ان زبانوں کی طرف کیوں رُخ کرے اور انگریزی کے اثر سے کیونکر بچے جس کی کرشمہ سازیاں رنگ لا رہی ہیں۔ کیا وہ اصحاب جو ملک میں ایک زبان مشترک پیدا کرنے کے حامی ہیں ان منزلوں کو طے کر سکتے ہیں؟

---

# نوائے راز

(از حضرت راز چاندپوری)

دنیا کہ بظاہر اک چمن ہے — واللہ عجیب سحر فن ہے
ہر لب پہ ہے نغمۂ من و تو — اہلِ دل کی یہ انجمن ہے
واعظ پہ ہے ختم خوش کلامی — کتنا کمبخت سحر فن ہے
اِس حُسنِ سخن کی داد دینا — جو بات ہے اسکی دل شکن ہے
اربابِ جہاں ہیں پاک باطن — ہم سے رندوں کا حُسنِ ظن ہے
دیکھے کوئی شیخ سادہ دل کو — کتنا گُلکار پیرہن ہے!
اے رہروِ منزلِ محبت — ہشیار کہ خضر راہ زن ہے
کیوں پوچھتے ہیں یہ اہلِ غربت — میں کون ہوں اور کہاں وطن ہے
آخر میں کسی کو کیا بتاؤں — وہ راز کہ زیبِ انجمن ہے
ذرہ ذرہ ہے مہر در بر — حیرت زدہ چشمِ سحر فن ہے
اِک عالمِ بیخودی ہے طاری — اللہ یہ کس کی انجمن ہے
خاموش امینِ رازِ فطرت! — دنیا خوش فہم و خوش سخن ہے

اے راز بنوش بے محابا
خوش کیفیتا یہ بادۂ کہن ہے

# شانِ عبادت

(از پنڈت اندر جیت شرما صاحب ماچھروی)

پھر چاروں طرف اُڑنے لگے پرچمِ انوار — گردوں پہ درخشندہ ہے پھر مہرِ صداقت
پھر اُٹھنے لگے پردے جہالت کے دلوں سے — پھر کھلنے لگے دہر پہ اسرارِ حقیقت
پھر پیکرِ فانی کے ہیں ذرّوں میں تلاطم — پھر چشمِ جہاں بن گئی آئینۂ حیرت
پھر نغمۂ بیدار سے گونجی ہیں فضائیں — پھر مطربِ نوخیز ہے سرشارِ محبت
اُٹھنے لگیں پھر وجد میں لہرا کے نوائیں — پھر لحن شکر ریز ہے اور گوشِ ملاحت
چلنے لگا پھر جامِ طرب بزمِ عمل میں — پھر قلب میں بیتاب ہے ارمانِ مسرت
پھر جرأتِ مخفی کو ہے جنبش کا تقاضا — پھر ساغرِ ہمت میں ہے صہبائے عقیدت
احساس کی پھر برق نے بھڑکا دیئے جذبات — موجود ہر اک سر میں ہے پھر شوقِ شہادت
دنیا میں نئے دور کا آغاز ہوا پھر — مخلوق پہ خالق کی ہے پھر چشمِ عنایت

ظاہر ہے عجب شان سے اعجاز کسی کا
لائی ہے نیا رنگ کوئی شانِ عبادت

# شاعر سے خطاب

از جناب مصطفےٰ حسین صاحب ناظر رامپوری

قفلِ درِ حیات کی اے دل کلید بن — اُجڑے ہوئے چمن میں بساطِ اُمید بن
کبتک سنائیگا گل و بلبل کی داستاں — اِس دورِ انقلاب میں سازِ جدید بن
مُردہ دلوں کو آج سُنا مژدۂ حیات — تشنہ لبوں کے واسطے تو جامِ عید بن
مثلِ کلیم طالبِ نظارہ کیوں بنے — خود اپنی جلوہ گاہ میں پیغامِ دید بن
ہو جا نثار جلوۂ حسنِ وطن پہ آج — حق دوست ہے تو ملتِ حق کا شہید بن

# مرحوم رائے دیبی پرشاد صاحب پورن

از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی

ضلع کانپور کو پرانی ہندی کے کئی نامی گرامی شعراء کے مولد یا مسکن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ رزمیہ شاعری کا یگانۂ آفاق شاعر بھوشن، تغزل (سنگار رس) میں لطافت و نفاست لانے والا متی رام، حسن و عشق کے رنگین جذبات و احساسات کا باکمال مصور پدماکر، رندی، زندہ دلی، اور آزاد خیالی کو نظم کے دلکش پیرایہ میں پیش کرنیوالا پرتاپ نراین مشر، ان سب کا کسی نہ کسی صورت میں کانپور سے تعلق رہا ہے۔ اسی دور کے آخری شاعر رائے دیبی پرشاد پورن تھے اور اُن کی شاعری بھی اُسی دور کے مطابق کلیتاً اُسی نوعیت کی تھی جس میں شعریت کم اور صراحت زیادہ ہوتی ہے۔ اُن کی زبان بھی زیادہ تر برج بھاشا یا پرانی ہندی ہے۔ پورن جی کی رائے میں شاعری کی زبان خواہ کچھ ہو مگر اُسے پُرزور ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وہ دیگر زبانوں کے مروج الفاظ کے استعمال کے حامی تھے۔ مگر شاعر کا ذی حس دل اُس جدت سے بھی بے اثر نہیں رہا جو بیسویں صدی کا مایہ الامتیاز ہے، اُن کی اکثر نظمیں حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہیں۔ نئے خیالات کے ساتھ طرز بیان بھی نیا ہے اور برج بھاشا کے بجائے کھڑی بولی استعمال ہوئی ہے اس لئے لطافت کے ساتھ زور بیان بھی قدرتاً زیادہ ہے۔ سلاست اور روزمرہ کی کثرت اس کے علاوہ ہے "بسنت ویوگ" (بسنت کی جدائی) "سودیشی کنڈل" "سال نو" (سنہ ۱۹۱۱ء) کا خیر مقدم اور نمایش کا خیر مقدم[1] اسی قبیل کی نظمیں ہیں اور سب کی سب بہت دلچسپ ہیں۔

بسنت ویوگ ایک طویل نظم ہے جو سنہ ۱۹۱۱ء میں ہندی کے مشہور رسالہ 'سرسوتی' میں شائع ہوئی تھی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں کتابی صورت میں چھپی، اس میں قدیم ہندوستان کے بسنتی مناظر اپنے دلفریب رنگ میں پیش کئے گئے ہیں۔ نازک خیال شاعر نے قدرتی مناظر کے ایسے دلکش نقشے کھینچے ہیں جو آپ

---

[1] اس نظم کو پورن جی نے ۷۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء کو جوبلی پور ضلع کانپور کی نمایش کے موقع پر بحیثیت چیرمین استقبالیہ کمیٹی پڑھا تھا۔

اپنی نظیر ہیں۔

دوسری نظم سودیشی کنڈل بھی ۱۹۱۰ء کی تصنیف ہے جو نمایش الہ آباد کے موقع پر کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی، اس نظم میں باون ۵۲ بند ہیں اور وہ ہندی شاعری کی اُس پسندیدہ صنف میں ہے جسے کُنڈلیا کہتے ہیں، اِسے سودیشی کی ایک پُرزور اپیل کہنا چاہیئے جو ہندوستانیوں سے عام طور پر بلا لحاظ مذہب و ملت کی گئی ہے۔ ضرورتاً ہند و مسلم اتحاد کا بھی ذکر آ گیا ہے جس کے پورنؔ جی زبردست حامی تھے۔ سال نو بھی "سرسوتی" میں چھپ چکی ہے اور حب الوطنی کے اعتبار سے ایک بہترین نظم ہے۔ اس میں سال کے بارہ مہینوں میں جُدا گانہ طور پر بہت سی سبق آموز اور اُمید افزا باتوں کا ذکر ہے۔ نمایش چوبے پور والی نظم چھپّے نامی چھند میں ہے جسے مسدس کا قائم مقام سمجھنا چاہیئے۔ اس میں بھی موضوع کے لحاظ سے سُودیشی ہی کی تلقین ہے اور اس کے متعلق اپنی مدد آپ کرنے کی بھی اپیل کی گئی ہے۔ یہ نظم بھی سُرسوتی میں شائع ہو چکی ہے ور اُس کے ایڈیٹر پنڈت مہابیر پرشاد دُویدی نے اسے بڑی قدردانی سے درج رسالہ کیا تھا۔

اب ہم اسی جگہ پورنؔ جی کے سودیشی کنڈل اور نمایش چوبے پور والی نظموں کے چند بند ہدیۂ ناظرین ہیں، جس سے ناظرین کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اُنھیں اپنی تحریر کو مؤثر ورعام فہم بنانے کے لئے زبان پر کتنا قابو تھا۔ موقع و محل کے لحاظ سے وہ اُردو کا سہارا لینے میں بھی تامّل نہ کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے لئے اُنھیں اکثر ہندی کے سرگرم حامیوں کی زبان سے بھلا بُرا بھی سننا پڑتا تھا۔ بند ملاحظہ ہوں:۔

(سودیشی کنڈل سے)

دیشی پیارے بھائیو ہے[1] بھارت سنتان — اپنی ماتا بھوم کا ہے کچھ تم کو دھیان؟
ہے کچھ تم کو دھیان دشا ہے اُس کی کیسی — شوبھا دیتی نہیں کسی کو نِدرا[2] ایسی
واجب ہے ہے متر! تمھیں بھی دُور اندیشی — سُن لو چاروں اُور[3] مچا ہے شور سُودیشی

---

دامنگیر نفاق ہے ہائے ہند افسوس — بگڑ رہا اخلاق ہے وائے ہند افسوس
وائے ہند افسوس، زمانہ کیسا آیا — جس نے کرکے ستم بھائیوں کو لڑوایا
مسلمان ہندو ہو! وہی ہے قومی دشمن — جُدا جُدا جو کرے پھاڑ کر چولی دامن

---

[1] اے [2] نیند [3] طرف

بندے ہو سب ایک کے نہیں بحث درکار ۔ ہے سب قوموں کا وہی خالق اور کرتار
خالق اور کرتار ، وہی مالک پرمیشور ۔ ہے زبان کا بھید نہیں معنی میں انتر[1]
ہو اس کے برعکس کرومت چرچے گندے ۔ کہکہ "رام رحیم" میل رکھو سب بندے

---

گاڑھا جھینا جو ملے اس کی ہی پوشاک ۔ کیجئے انگیکار[2] جو رہے دیش کے ناک
رہے دیش کی ناک سودیشی کپڑے پہنے ۔ ہیں ایسے ہی لوگ دیش کے سچے گہنے
بنجھیں نہیں درکار چلن یوروپ کا کاڑھا ۔ تن ڈھکنے سے کام گزی ہووے یا گاڑھا

"گزی گاڑھا" کا بہت قبل از وقت ذکر کرکے شاعر نے اپنی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے

(نمایش کا خیر مقدم)

افسران ذیشاں! زمینداران گرامی ۔ پنڈت ودّیا وان! چتر کاریگر نامی!
کاشتکار تجّار، مبارک سب کا آنا ۔ ہے عزت کا سبب قدم رنجہ فرمانا

ہمدردی کے اظہار کا بدل سبار کباد ہے
یکجہتی کے آثار کا بدل مبارکباد ہے

ہے دھیروں[3] کا کام دیش کی سیوا کرنا ۔ ہے ویروں کا کام قدم آگے کو دھرنا
دیشونت[4] کا کام نہیں دس بارہ دن کا ۔ ہے یہ ان کا کام مقولہ ہے یہ جن کا

کرکے پرن[5] اچھے کام کا منہ کو موڑیں گے نہیں
ہم کامیاب جبتک نہوں کوشش چھوڑیں گے نہیں

پورن جی کی زندگی بجد مصروفیت کی زندگی تھی، وکالت کا پیشہ خود ہی ہر وقت کی مصروفیت چاہتا ہے، شہر کی مختلف تحریکوں سے بھی آپ کا گہرا تعلق تھا۔ سناتن دھرم کے بھی آپ سچے سیوک تھے۔ آپ سناتن دھرم مہا منڈل کی شاخ کانپور کے بانی اور پریسیڈنٹ تھے۔ آپ رسک سماج (ہندی شعرا کی انجمن) کا کام بھی بڑی لگن سے کرتے تھے۔ یوں تو یہ سماج پہلے سے ہی قائم تھی، مگر ایک قالب بیجان کی صورت میں، اُسے از سر نو زندہ کرنے والے اور اپنی زندگی بھر قائم رکھنے والے پورن جی ہی تھے۔ اُن کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی مگر اس کے باوجود اُنھوں نے جو ادبی خدمت کی وہ بہت قابل قدر ہے۔ اُن کی متفرق نظموں کا ایک مجموعہ گنگا

[1] فرق [2] قبول [3] مستقل مزاجوں [4] ملکی ترقی [5] عہد۔

پستک مالا آفس لکھنؤ سے شائع ہوچکا ہے۔ اُس کے بہت پہلے اُنھوں نے ۱۹۰۲ء میں کالیداس کی مشہور نظم میگھدوت کا ترجمہ بھی" دھارا دھر دھاون" کے نام سے شائع کیا تھا، جس کا شمار آج بھی پرانی ہندی کی بہترین تصانیف میں ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے سوامی شنکر اچاریہ کی مشہور و معروف سنسکرت کتاب" تتو بودھ" کا بھی منظوم ترجمہ کیا۔ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے" چندر کلا بھانو کمار" نامی ایک ناٹک بھی لکھا تھا، جو قدیم ہند کے باہمی سلوک کا ایک دلکش مرقع ہے۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ اسکول اور کالج میں فارسی پڑھتے ہوئے بھی آپ نے اپنے ادبی مشاغل کے لئے ہندی ہی کو پسند کیا اور اُس میں خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔

ہندی زبان پر عبور حاصل کرنے میں آپ کو اپنے خسر منشی شنکر پرشاد داس ساکن بھوپال سے بڑی مدد ملی تھی۔ وہ ابتدا میں اُن کی ہندی نظموں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ سنسکرت اُنھوں نے اپنے وطن موضع بھدرس تحصیل گھاٹم پور ضلع کانپور کے پنڈت کامتا پرشاد شاستری سے پڑھی تھی۔ آپ کے قدیم بزرگ اسی موضع کے رہنے والے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ بیردا س سرلواستو (کھرے) تھے جو اسلامی حکومت کے زمانہ میں اس موضع کے ٹھیکہ دار تھے، جو راسی گانوں نانکار کے علاوہ اُن کو تین ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ ملتی تھی، اور رائے کا خطاب بھی تھا۔ اُن سے کئی پشتوں بعد رائے بنسی دھر جبلپور میں وکالت کرتے تھے، پورن جی اُنھیں کے بیٹے تھے اور ۱۸۶۸ء میں جبلپور میں پیدا ہوئے تھے، مگر بچپن ہی سے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا، چنانچہ آپ کے حقیقی چچا رائے لیلا دھر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر صوبۂ متوسط نے آپ کی پرورش و پرداخت اور تعلیم کا بار اپنے ذمہ لیا۔ پورن کی طالب علمی کا زمانہ نہایت شاندار تھا۔ اُنھوں نے رائے پور سے ۱۸۸۱ء میں انگریزی مڈل وظیفہ میں پاس کیا اور ۱۸۸۴ء میں جبلپور ہائی اسکول سے کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان میٹرکیولیشن میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں بی اے اور پھر کلکتہ یونیورسٹی کا بی۔ ایل پاس کرکے ناگپور میں اپنے حقیقی چچازاد بھائی رائے درگا پرشاد (ولد رائے لیلا دھر) کے ساتھ دو سال تک وکالت کرنے کے بعد کانپور آگئے، جہاں رفتہ رفتہ اُن کا شمار دیوانی کے قابل ترین وکلا میں ہونے لگا۔ اُن کے وقت کے مشہور ترین وکیل پنڈت پرتھی ناتھ صاحب مرحوم کا قول تھا کہ" اگر کوئی صرف گھنٹہ بھر میں مقدمہ کی مسل دیکھکر معقول بحث کرسکتا ہے تو رائے دیبی پرشاد ہیں۔"

وہ بڑے پروپکاری، فیاض طبع اور مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ہندو یونیورسٹی کو بھی پانچہزار روپیہ دیا تھا، وکالت میں بھی وہ ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آتے تھے، اور

اُس میں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہ تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۱۱ء میں اجودھیا کی گاؤکشی کا مقدمہ چلا تو سادھوؤں کی طرف سے اُنھوں نے بلا فیس وکالت کی، اور اُسی طرح مسجد مچھلی بازار کانپور کے مقدمے میں وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ وہ اپنے مذہب کے بڑے پابند تھے اور ہر کام میں دھرم کا پورا خیال رکھتے تھے۔ خوش تقریری کا اُن میں فطری مادّہ تھا چنانچہ عدالت میں بحث کے علاوہ پبلک جلسوں اور سناتن دھرم سبھا کے پلیٹ فارم پر اُن کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ قابل قدر ہوتی تھی۔

آپ بڑے منکسر مزاج اور "مرنجان و مرنج" واقع ہوئے تھے۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی کے ممبر بھی تھے اور مسز بیسنٹ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ آپ پراگ نرائن کے مندر کے احاطہ میں ایک مکان میں رہتے تھے اور اُسے "بیکنٹھ" کے نام سے نامزد کئے ہوئے تھے۔ آپ کو اس مکان سے اس قدر محبت تھی کہ آخر دم تک اسی میں قیام پذیر رہے، حالانکہ علالت کے زمانہ میں آپ کے اکثر احباب سکونت تبدیل کرنے پر مُصر تھے، یہیں سے آپ رام نامی اوڑھے ہوئے گنگا اشنان کو جایا کرتے تھے۔ آپ وید پُران اور شاستروں کے ماننے والے اور سادھوؤں سنتوں کے بڑے سیوک تھے اور علماء و شعراء سے عزت سے پیش آیا کرتے تھے۔ فن موسیقی کے بھی آپ بڑے قدردان تھے، چنانچہ اکثر گانے بجانے والے ماہرینِ فن کی آپ بڑی قدردانی کرتے تھے، خود بھی فن موسیقی سے بے انتہا رغبت تھی، ستار، ہارمونیم، طبلہ وغیرہ بجانے میں کمال حاصل تھا۔ اتنا ہی نہیں آپ کو ایکٹنگ کا بھی شوق تھا۔ اپنے گانوں میں ہر سال ہولی کے زمانہ میں "دھنش یگیہ" کراتے تھے جس میں خود پارٹ لیا کرتے تھے۔

آپ ایک زبردست نقادِ فن تھے، آپ کی تنقیدیں عموماً سخت ہوتی تھیں، اور اکثر مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔

سیاسیات میں آپ اعتدال پسند خیال کئے جاتے تھے مگر موقع پر کھری بات کہنے میں کبھی ہچکچاتے نہ تھے، غرض کھراپن آپ کا خاصہ تھا جو ہر جگہ ظاہر ہوتا تھا، اِس کا اصل سبب ایشور پر وہ اٹل وشواس تھا جس کی بدولت وہ کسی بات سے نہیں ڈرتے تھے۔

یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ پورن جی کو اپنی موت کا علم سا ہو گیا تھا، مرنے کے تین چار ماہ قبل اپنے گانوں والے دھنش یگیہ کے موقع پر آپ نے لوگوں سے کہا کہ "اگر میں آئندہ سال دھنش یگیہ تک زندہ نہ رہوں تو بھی اس کو پریم اور بھگتی کے ساتھ برابر کرتے جانا۔ مرنے کے دو تین ماہ قبل آپ نے

# نواب ملکہ جہاں

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بی حسینی خانم ایک شریف مجہول الحال اور اوسط درجہ کے خاندان کی لڑکی تھیں۔ اُن کے والد محلہ رستم نگر لکھنؤ میں رہتے تھے، اُن کی ابتدائی تاریخ ایسی تاریکی میں ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کا خاندان کہاں سے آیا تھا اور کس طرح لکھنؤ میں آباد ہوا۔ بہرحال یہ خاندان کی شریف مگر غریب تھیں، مزاج نیک تھا، فیاضی کا قدرت سے غیر معمولی حصہ ملا تھا، چنانچہ اس غریبی میں بھی اُن کی فیاضی مشہور تھی حُسن کا بھی چاروں طرف شہرہ تھا۔

رفتہ رفتہ مرزا محمد علی شاہ کے کانوں تک یہ آواز پہونچی کہ رستم نگر میں ایک سلیقہ مند اور نہایت قبول صورت لڑکی ہے۔ مرزا صاحب اُس وقت ولیعہد اور سلطنت کے امیدوار تھے مگر نواب سعادت علی خاں بادشاہ اودھ کے انتقال کے بعد اُن کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ لوگوں کا تو یہی خیال تھا کہ اب سلطنت انھیں کو ملے گی کیونکہ نواب سعادت علی خاں کے لائق اور کارکردہ فرزند تھے، ان کے بڑے بھائی اور نواب سعادت علی کے بڑے بیٹے نواب غازی الدین حیدر مجنوں اور پاگل تھے اور اُن سے اکثر ناقابل برداشت حرکتیں ظہور میں آچکی تھیں جن کے سبب سے نواب سعادت علی خاں نے ان کو نظربند کردیا تھا اور مرزا محمد علی شاہ اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھکر عدالت کا کل کام انجام دیتے تھے۔ مگر وزرا نے اپنی چرب زبانی سے رزیڈنٹ بہادر گورنر جنرل یعنی بڑے صاحب کو اس بات کا اطمینان دلادیا تھا کہ وہ اب مجنوں نہیں ہیں اور کوئی بات خلاف تہذیب اُن سے ظاہر نہیں ہوتی ہے اور یہ بات دستور قدیم کے خلاف ہے کہ بڑے بیٹے کے ہوتے ہوئے چھوٹے بیٹے کو تخت سلطنت دیدیا جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کے بعد ارادہ بدلنا پڑے۔

اُس وقت ایک والیِ ملک کو تخت سے اُتارنا اور دوسرے کو تخت نشین کرنا دشواری سے خالی نہ ہوگا جیساکہ مرزا وزیر علی خاں کے متعلق پیش آچکا تھا۔ بات تھی چبھتی ہوئی اور مثال قریب کی تھی رزیڈنٹ بہادر نے اِس بارہ میں دیر تک غور کیا اور اپنے حاشیہ نشینوں سے مشورہ کیا اور میر منشی سے بھی دریافت کیا سب کی تجویز یہی تھی کہ فرزند رشید کے ہوتے ہوئے چھوٹے بیٹے کا تخت پر کوئی حق نہیں ہے۔

آخر رزیڈنٹ بہادر نے محمد علی شاہ سے کہا کہ معاف کیجئے ہماری خواہش تو یہی تھی کہ آپ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوں مگر قانون سلطنت سے مجبور ہوکر آپ کی تخت نشینی مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ محل میں تشریف لے جائیں۔ یہ جواب سنتے ہی مرزا محمد علی شاہ نے کہا، آپ کو لیاقت بھی دیکھنا چاہیئے۔ نواب سعادت علی خاں کی حیات میں کل کاروبار سلطنت میرے اختیار میں تھا مجھ سے بڑھکر سلطنت کا کون مستحق ہوسکتا ہے۔ رزیڈنٹ بہادر نے کہا کہ ہمارا بھی یہی خیال تھا مگر سلطنت کا قانون یہی ہے کہ تخت کی مالک اولاد اکبر ہوتی ہے۔

آپ خیال کرسکتے ہیں کہ جس کو گھڑی بھر میں سلطنت ملنے والی ہو اور وہ ایک لحظے میں اُس سے محروم کردیا جائے یا جس شخص کے سامنے دسترخوان نعمت بچھا ہوا اور وہ زبردستی دسترخوان سے اُٹھا دیا جائے تو اُس کا کیا حال ہوگا۔ یہی حال مرزا محمد علی شاہ کا ہوا۔ ایک دم سے ایسا دلشکن جواب سُنکر جو رنج وغم انھیں ہوا اُس کا تحمل کوئی شخص نہیں ہوسکتا دوچار ٹھنڈی سانسیں لیں اور بادل دردمند کوٹھی فرحت منزل سے بچشم اشکبار چلے آئے۔ اور دل میں فیصلہ کیا کہ ہماری قسمت میں سلطنت نہیں ہے۔ بہرحال قریب تھا کہ وہ اس صدمۂ جانکاہ سے مجنوں ہوجائیں اور اُن کا قلب اُلٹ جائے، مگر رفیق الدولہ عظیم اللہ خاں نے اُن کے لئے ایک دوسرا مشغلہ نکالا اور ایک نئے پہلو سے اُن کا دل بہلانے لگے کبھی سیر وشکار سے دل بہلایا، کبھی علمی مشاغل میں اُلجھایا، کبھی شطرنج میں لگایا۔ جب دیکھا کسی طرح صدمہ کم نہیں ہوتا تو رفیق الدولہ نے کہا کہ حضور نے سُنا ہوگا کہ محلہ رستم نگر میں ایک نوخیز گوہر بے بہا ہے اور وہ حضور ہی کے لائق ہے، اگر حضور اُسے اپنے عقد میں لائیں تو عیش زندگی حاصل ہو۔ یہ بیان ۱۸۱۴ء کا ہے جب مرزا محمد علی شاہ کی عمر چالیس سال کی تھی۔ رفیق الدولہ نے جو نمک مرچ لگاکر یہ داستان بیان کی تو انکی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوگیا اور کہنے لگے کمبخت تیری زبان میں کس قدر سحر بھرا ہے، اچھا اب یہ مرحلہ بھی تمھیں طے کرو۔ رفیق الدولہ نے عرض کی کہ حضور میں کوئی قاضی نہیں ہوں، یہ کام مجھ سے انجام نہ پائیگا، کسی مشاطہ کو بھیجئے۔ فرمایا ہاں کسی مشاطہ کو بھیجو تم نہ جاؤ، آخر اس بہانے سے ہزاروں کے وارے نیارے ہوئے اور مہینوں دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ اگر محمد علی شاہ نے ذرا فرمایا یہ تذکرہ اس سے پہلے بھی ہم نے سُنا تھا، سب نے کہا بجا ہے حضور اس فتنۂ عالم کے حُسن دل افروز کی تمام شہر میں دھوم ہے اور بہت سے شاہی خاندان کے لوگوں نے پیام بھیجے کسی کی دعا قبول نہ ہوئی۔ اب ہم لوگ کوشش کرتے ہیں امید ہے کہ کشتی ساحل مراد پر پہونچے۔ آخر ایک دن یہ خوشخبری سنائی کہ لڑکی والے اس شرط پر رضامند ہیں کہ اگر بادشاہ سہرے جلوس کے ساتھ ہمارے یہاں بیاہنے تشریف لائیں

تو ہم کو کوئی عذر نہیں۔

غرض حسینی خانم کی شادی پندرہ برس کی عمر میں مرزا محمد علی شاہ سے نہایت شان وشوکت کے ساتھ ہوگئی۔ شادی کے بعد اُن کی اس قدر محبت ہوگئی کہ محمد علی شاہ نے نواب ملکہ جہاں حمیدہ سلطان خطاب اور نواب تاج النسا بیگم لقب عنایت فرمایا۔ ملکہ جہاں نہایت سیر چشم اور فیاض تھیں، پڑھی لکھی خوشنویس تھیں خاصکر خط نسخ میں اُن کا نظیر نہ تھا۔ اُنھوں نے تمام عملہ کا انتظام درست کیا اور خیرات میں بڑا نام پیدا کیا، خدا نے پہلے اُن کو ایک بیٹی دی جو بہت کم سنی میں انتقال کرگئی اس کا مقبرہ جمنا باغ میں بنا جہاں اب حسین آباد ہے۔ پھر شادی کے پندرہ برس کے بعد خدا نے اُن کے شوہر کو بادشاہی دلوادی، یعنی جب نواب غازی الدین حیدر بادشاہ نے انتقال فرمایا اور وہ نجف اشرف میں مدفون ہوئے تو سریر آرائے سلطنت مرزا نصیر الدین حیدر ہوئے، یہ غازی الدین حیدر کے بیٹے تھے، مرزا نصیر الدین حیدر بھی کچھ زمانہ تک سلطنت کرکے راہیِ ملکِ بقا ہوئے تو وہ اپنے بیٹے مُنّا جان کے متعلق لکھ گئے کہ میرا بیٹا نہیں ہے اسے سلطنت نہ ملے" اور یہ اس لئے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بیگم اپنی والدہ سے سخت ناخوش تھے اور بادشاہ بیگم نے مُنّا جان کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا تھا اس لئے اُن کی ضد میں مُنّا جان کا ابطال کردیا۔ چونکہ بادشاہ کی اور کوئی اولاد نہ تھی اس لئے بادشاہ کے چچا مرزا محمد علی شاہ کو سلطنت ملی۔ عین یاس و ناامیدی کی حالت میں حسنِ اتفاق اور خدا کی قدرت سے مرزا محمد علی شاہ اودھ کے فرمانروا ہوئے۔ اِسی کو خدا کی دین کہتے ہیں۔ بہرحال بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ یہ سلطنت مجھے صرف ملکہ جہاں کی قسمت سے ملی ہے۔

اُس زمانے میں نواب ملکہ جہاں صاحبہ نواب مبارک محل کی عالیشان عمارت میں رہتی تھیں جو دریا کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ اب ان کا عروج روز افزوں ہونے لگا۔ خدا نے اپنی قدرت سے ایک بیٹا بھی دیا جس کا نام احمد علی خاں اور لقب ابو المظفر سکندر قدر خورشید حشم صاحب عالم ہمایوں بخت مرزا احمد علی خاں بہادر تھا۔

اب نواب ملکہ جہاں کے ساز وسامان عیش وعشرت کا کیا کہنا، صرف بیس سیر موگرا موتیا بیلا اُن کی مسہری پر بچھایا جاتا، پھولوں کے زیور میں اس کے علاوہ صرف ہوتا تھا۔ چاندی کے تار اور منقیش چاندی کے پھول جو زیور میں خرچ ہوتے تھے اور صبح کو سب باسی زیور مہترانی اور فراش لیکر کئی روپیہ کی چاندی بیچ لیتے تھے۔ چار مالی اسی خدمت پر نوکر تھے کہ پھول لائیں اور زیور گوندھیں۔

میاں اعتماد علی خاں خواجہ سرا توشہ خانہ کے محافظ تھے۔ دو سو عباسنیں سفر حج سے مول لائی

تھیں جو ڈیوڑھی کی خدمت پر مقرر تھیں۔ عباسن قوم کی حبشن ہوتی ہے جس کا رنگ سیاہ اور بال سخت اور گھونگھر والے ہوتے ہیں جن کی چوٹی نہیں گندھ سکتی۔ ناک چپٹی ہوتی ہے، سب محل میں رہتی تھیں اور نہایت دیانتدار اور اپنے آقا کی جان نثار تھیں۔ اُن کی شادی بھی بیگم صاحب اپنے حبشی غلاموں کے ساتھ اُن کی مرضی اور پسند کے موافق کر دیتی تھیں اور محل سے الگ جو بہت سے مکانات بنے ہوئے تھے وہ اُنھیں رہنے کو دیدیئے جاتے تھے، وہ باری باری سے محل میں کام کرتی تھیں اور حبشی اُن کے شوہر بھی اُنھیں کے ساتھ رہتے تھے اُن کی تنخواہ بھی سرکار سے عین تھی۔

ایک عباسن مکاندار کہلاتی تھی جس کے قبضہ میں محل کے شیشہ اور آلات فرش فروش دری چاندنی وغیرہ کی دیکھ بھال اور اُن کی مرمت اور جدید خرید تھی۔

ایک سو گرجنیں تھیں جنھیں کربلائے معلّی میں مقام گرز سے خرید کیا تھا مگر گرز کے غلام نہیں مل سکے ان کا رنگ چمپئی، ناک نقشہ کی بہت خوبصورت ناک پتلی آنکھیں نیلگوں، عقلمند ذکی شریف خاندان سے تھیں۔ ان سب کی مرضی لیکر شہر کے نواب اور شرفا کے ساتھ شادی کر دی، اور سب کو ایک ایک ہزار کا جہیز دیکر اچھی شان و شوکت سے رخصت کیا، اور تنخواہ بھی پچاس پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر دی اور ہمیشہ باری باری سے وہ محل میں مہمان بلائی جاتی تھیں، اور جب ان کے یہاں لڑکا بالا ہوتا تھا تو بیگم صاحبہ کی طرف سے چھٹی بھیجی جاتی تھی۔ اس برتاؤ سے تمام شہر کے رئیس اور امیر نہایت خوشی سے اُن کے ساتھ شادی کرنے کی درخواست کرتے تھے، اور اُن کا شمار محل کے ذی اقتدار لوگوں میں ہو جاتا تھا، اور جب بیگم صاحبہ کسی کو کسی تقریب میں یا مہمان کے طور پر بلاتی تھیں تو وہ اپنی اپنی رتھوں میں سوار ہو کر آتی تھیں، سب کے نام کی ایک ایک رتھ بیگم صاحبہ نے خرید کر دی تھی اور اُس کے مصارف بھی بیگم صاحبہ ہی کے ذمہ تھے۔ پچاس ساٹھ پیش خدمتیں تھیں جو بیگم صاحبہ کا منہ دُھلانے اور چوکی پر لوٹا رکھنے پر ملازم تھیں۔ سیکڑوں باری داریاں تھیں جن کا کام یہ تھا کہ دو دو گھنٹہ پنکھا جھلتی تھیں اور باری بدلواتی تھیں اور چٹکی کرتی تھیں۔ پہرہ دارنیاں تھیں جو رات کو بندوق کندھے پر رکھے ہوئے پہرہ دیتی تھیں اور حکم حیدر پکارا کرتی تھیں، مغلانیاں ان کے علاوہ تھیں جو دن رات نئی پوشاکیں تیار کیا کرتی تھیں، آتوجی قرآن شریف سُنتیں اور مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو فنِ نسخ بحدِ کمال آتا تھا اس کی اصلاح کے لئے ایک خوشنویس نوکر تھا۔

بیگم صاحبہ کی ذات خاص کی تنخواہ پانچہزار ماہوار کی تھی جس کا وثیقہ آتا تھا، اس کے علاوہ لاکھو روپیہ کے جواہرات تھے کیونکہ تنخواہ میں تو اس قدر خرچ پورا نہیں پڑتا تھا جواہرات اسکی تلافی کرتے تھے۔

محلدار تمام محل کا حساب کتاب درج کیا کرتی تھیں۔ پانچہزار کی کوئی حقیقت نہ تھی، دراصل بادشاہ نے اُن کو اس قدر زیور و جواہرات دیے تھے کہ ان کے پاس اچھا خاصہ خزانہ جمع ہوگیا تھا۔ جب آپ حج کعبہ و مدینہ اور عتبات عالیات کی زیارت کو تشریف لے گئی ہیں تو وہاں پچیس لاکھ روپیہ صرف کیا بیشمار بدوؤں کو دیا، تربت حسین علیہ السلام پر سچے موتیوں کی چادر چڑھائی، نجف اشرف میں خالص سونے کی قندیلیں چڑھائیں، نہر آصفیہ جو نواب آصف الدولہ کی یادگار تھیں اور اس وقت بند تھی اُسے دوبارہ اپنے مصارف سے جاری کیا۔ لکھنؤ میں آکر بڑی نفیس مجلسیں کیں۔ خواجہ حسام الدین اس عہد میں کم سن تھے اُن کا بیان ہے کہ یہ غدر کے بعد کا زمانہ تھا مگر اتنا یاد ہے کہ ملکہ جہاں کی مجلسیں پہلی محرم سے چہلم تک روزانہ صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک ہوتی تھیں۔ پہلے شہر کے نامی مصائب خواں محمد شاہ صاحب کشمیری امام حسین کے مصائب بیان کرکے لوگوں کو بٹھا دیتے تھے، اس کے بعد مولوی سید علی صاحب بعنوان شائستہ ایسے درد آمیز الفاظ میں مصائب بیان کرتے تھے کہ اکثر لوگ روتے روتے بیہوش ہوجاتے تھے اس کے بعد مجلس ختم ہوتی تھی۔ مجلس میں میٹھی چائے تقسیم ہوتی تھی اور اتنی بڑی پیالی ہوتی تھی کہ کوئی شخص دو پیالیاں پینے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ غرض یہ مجلس بہت پاکیزہ ہوتی تھی، ہر طرف سفید پوش شریف ہی نظر آتے تھے اور اہتمام کے لئے خواجہ سرا مقرر کئے جاتے تھے۔

ملکہ جہاں کی تین بہنیں اور بھی تھیں، ایک کا نام چھوٹی خانم تھا جس کی شادی شہزادہ اسلم مرزا صفوی سے ہوئی تھی، ان کے چار فرزند ہوئے سلطان مشرف شاہ مرزا صفوی، مرزا سلطان محمد شاہ صفوی فرخ مرزا شاہ صفوی، مرزا اکبر شاہ صفوی، اور ایک لڑکی تھی جس کے دو بیٹے تھے مرزا معظم بخت، مرزا بہادر بخت۔ دوسری مہدی خانم زوجہ آصفیہ مرزا صاحب صفوی، ان سے چار بیٹے ہوئے سلطان مرزا سلیمان مرزا قیصر مرزا اسکندر مرزا، اور دو لڑکیاں تھیں زینب بیگم، امیر بیگم۔ تیسری بسم اللہ خانم ان کے شوہر کا نام نہیں معلوم ہوسکا، ان کے ایک فرزند تھے سید محمد جو گول دروازے کے قریب رہتے تھے

ہم ذکر کرچکے ہیں کہ نواب ملکہ جہاں کے ایک فرزند مرزا احمد علی خاں صاحب تھے اُن کی شادی نہایت شان و شوکت سے ہوئی، اور ملکہ جہاں نے بہو کو خاقان بہو کا خطاب دیا اور ایک بہت بڑی عمارت کوٹھی تمام باغ کے قریب وزیر گنج کے بنوادی اور اس کوٹھی کا نام خاقان منزل رکھا۔ مرزا احمد خاں صاحب کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ صاحبزادہ کلاں کا نام نواب صاحب مرزا، صاحبزادہ دوم کا نام نواب امداد حسین خاں بہادر یہ بھی صاحب اولاد تھے۔

نواب ملکہ جہاں نہایت سخی دل چلی اور مخیر تھیں، میر احمد علی صاحب پیارے صاحب رشید کے

والد اسی سرکار میں ملازم تھے، سادات سمجھکر ان کی بہت خاطر کیجاتی تھی۔ کنبہ پرور بھی بہت تھیں اپنے اعزا کی بہت عزت کرتی تھیں۔ میر ہدایت علی ہدایت ریختی گو کی پرورش بھی اسی سرکار سے کیجاتی تھی۔ ہر تقریب پر قصیدہ کہکر پیش کرتے تھے اور کافی انعام پاتے تھے۔

لوگ کہتے ہیں نواب ملکہ جہاں کی کوئی پوت بہو تھیں نہایت سلیقہ مند نیک اور سخی، خدا نے سب کچھ دیا تھا مگر اولاد سے محروم تھیں، ہزارہا روپیہ دوا علاج میں صرف کیا، دعا تعویذ، گنڈا، جھاڑ پھونک میں کوئی بات باقی نہ رکھی مگر اولاد نہ ہوئی، اتفاق سے ان کے گھر میں ایک جان پہچان عورت کسی وسیلہ سے آیا کرتی تھی، اُس نے کہا بی بی میں صدقے جاؤں، قربان ہوجاؤں تمھارے اولاد نہ ہونے کا جو غم مجھے ہے وہ بیان کرنے کے قابل نہیں، جہاں جاتی ہوں یہی ذکر ہے، ایک دیہات کی زمیندار کی بی بی تھیں، ان کی بہو کے یہاں کسی طرح اولاد نہیں ہوتی تھی، غریب آدمی تھیں دوا دعا میں اپنی اوقات سے زیادہ خرچ کیا جب کسی طرح اولاد نہ ہوئی تو ہار کر بیٹھ رہیں۔ ایک دن ایک فقیر دروازے پر آیا تو خود اُسے پیسہ دینے گئیں۔ اُس نے کہا تو نے ضعیفہ ہو کر کیوں تکلیف کی، کسی بچے کے ہاتھ پیسہ بھیجدیا ہوتا۔ بڑھیا نے کہا، گھر کے مالک کا تو انتقال ہوگیا ہے، میرا بیٹا نوکری پر ہے، اُس غریب کی کوئی اولاد نہیں، پندرہ برس شادی کو ہوچکے آج تک بچہ نہ ہوا اب بچہ آئے تو کہاں سے آئے۔ فقیر نے کہا مائی ایک فقیری ٹوٹکا بھی کر دیکھ، خدا نے چاہا تو تیری بہو کے یہاں بچہ ہوگا۔

بھونرا ایک جیتا پکڑ لے اُسے شکر میں لت پت کرکے اپنی بہو کو نگلوا دے خدا نے چاہا تو اسی مہینے میں پیٹ رہ جائے گا۔ قربان جائیے اس خدا کے فقیر کی بات اُس وقت خدا نے سُن لی، گرمی کے دن تھے اُس بڑھیا نے ایک بھونرا پکڑ کے اور شکر میں ملا کے اپنی بہو سے کہا لے بیٹا بسم اللہ کہہ کے اسے نگل جا۔ دوا ہے اِس بیچاری نے نگل لیا خدا نے اُسی نو مہینے کے اندر بیٹا دیا۔ اور لگاتار تین بیٹے ہوئے آج تک سب زندہ ہیں، چلتے وقت فقیر نے کہا تھا یہ دوا اکسیر ہے جسکو دی جائیگی فوراً فائدہ کرےگی سب بیش خدمتوں نے کہا یہ کیا مشکل ہے فوراً اسی وقت ایک بھونرا پکڑ کے شکر میں لت پت کرکے نگلا دیا۔ دن بھر تو کچھ نہ معلوم ہوا مگر شام سے پیٹ میں درد شروع ہوا اور منہ سے بھونرے کے بچے نکلنا شروع ہوئے تب معلوم ہوا کہ یہ بھونرا نہ تھا بھونری تھی، آخر اسی تکلیف میں بیچاری پھڑک پھڑک کر مرگئی۔ اور کوئی دعا کوئی دوا کام نہ آئی شہر کے تمام حکیم ہاتھ ملتے رہ گئے جس نے یہ بات بتائی تھی اس عورت کو سارے شہر میں ڈھونڈھ مارا کہیں پتہ نہ لگا، یہ واقعہ بھی آج تک حسرت

سے بیان کیا جاتا ہے۔

ایک واقعہ بیگم صاحبہ کی سیر چشمی کا اور زبان زد خلائق ہے، ایک گروہ چوروں کا قحط کے زمانے میں اطراف حیدرآباد سے لکھنؤ آیا اور اُس نے پتہ لگایا کہ نواب ملکہ جہاں کا خزانہ مشہور ہے بے شمار دولت ہے، چور تھے شاطر منہ میں پانی بھر آیا بہت سی فکریں کیں کچھ چھکڑے ایک گاؤں سے خرید کے اور بارہ بجے رات کو سرنگ خزانہ کے قریب لگائی باوجودیکہ بیگم صاحبہ کے یہاں رات بھر پہرہ رہتا تھا اور بندوق کندھے پر رکھے ہوئے جلشنیں پھرا کرتی تھیں۔ چوروں نے کچھ ایسی آہستگی سے دیوار میں سیند لگائی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اور بہت سامال و اسباب زر و جواہر لیکر چھکڑوں پر لاد کر روانہ ہوگئے۔ صبح کو جب پہرہ دارنیوں نے نہایت شرمندگی سے خبر دی تو تیور پر بل بھی نہ آیا اور فوراً سیند بند کروا دی۔ کسی نمک حلال نے عرض کیا کہ معلوم ہوتا ہے چور چھکڑوں پر مال لاد کر لے گئے ہیں۔ راستوں سڑکوں پر جا بجا کوسوں تک مال پھیلا ہوا ہے۔ اگر حکم ہو تو ہم سب لوگ جاکر چن لائیں تخمیناً ایک چھکڑا بھر مال تو مل ہی سکتا ہے۔ کہا جو مال ہماری قسمت سے اُٹھ گیا اسکو سمیٹنا فضول ہے۔ جانے دو وہی مونڈی کاٹے لے جائیں۔ اِس ہمت کو دیکھکر سارے عملے نے سر جھکا دیا اور دعا دی کہ خدا ہماری بیگم صاحبہ کو رہتی دنیا تک قائم رکھے۔

اُن کی محلدار صاحبہ کا مکان وزیر گنج میں لالہ روشن لال کے اندارے کے قریب تھا، لاکھوں روپیہ بیگم صاحبہ کی بدولت کمایا اور زندگی بھر بیٹھکر کھایا، ان کے ایک بیٹے مرزا غلام حسین صاحب تھے جن کا شمار شہر کے رؤسا میں تھا۔ جب کبھی خرچ کی قلت ہوتی تو کچھ جواہر لیکر کلکتہ چلے جاتے اور وہاں بیچکر پچاس ساٹھ ہزار لیکر چلے آتے اور سال بھر فرے اُڑاتے۔

ایک محلدار پر کیا موقوف تھا جس نے برس دو برس بھی نوکری کر لی' لاکھوں کا مالک ہوگیا، گھر بھر لیا اور زندگی بھر بیٹھے بیٹھے کھایا کیا غرض ملکہ جہاں پارس تھیں جو ان سے چھو گیا مالا مال ہوگیا بادشاہ کا التفات نواب ملکہ جہاں کی طرف بحدِ کمال تھا، روزانہ شام کو تامجان پر سوار ہوکر دولت سرائے ملکہ جہاں میں تشریف لاتے تھے، اس وقت ملکہ جہاں مبارک محل کی کوٹھی میں لب دریا فروکش تھیں۔

داروغہ عاشق علی خاں نے عیش باغ میں کربلا بنوائی تھی جو اس زمانے میں بہت پسند کیگئی سبب یہ تھا کہ یہ کربلا جمنا سٹرک کے قریب واقع ہوئی تھی۔ جمنا سٹرک عیش باغ میں تھی اور اس میں بہت سی دوکانیں بھی شامل تھیں جس کی آمدنی سے کربلا کے مصارف چل سکتے تھے۔ اور ایک گاؤں کی زمین اس میں شامل کردی تھی۔ اس میں مومنین کی قبریں بنتی تھیں۔ ملکہ جہاں کو یہ کربلا پسند آئی

اور داروغہ صاحب کو بلا کر کہا کہ یہ کربلا آپ ہم کو دیدیں اور جو معاوضہ تجویز کریں ہم ادا کردیں۔ داروغہ صاحب نے عرض کیا کہ معاوضہ کی کیا ضرورت ہے، کربلا آپ کی ہے اور میں آپ کے خاندان کا پروردہ ہوں غرض اس روز سے کربلا ملکہ جہاں کے نام سے مشہور ہوگئی، اب سُنا گیا ہے وہی کربلا بیگم صاحب کے ورثا نے کسی مہاجن کے ہاتھ قرض کی علت میں گنوادی اور وہاں کھیتی ہونے لگی ہے اور کربلا کی شان جاتی رہی۔ ملکہ جہاں کے انتقال کے بعد بہت سی املاک فروخت ہوگئی اب اس کا نشان بھی نہ رہا۔ آغا میر کا عالی شان محل جس کے مختصر حصہ میں اب جوبلی کالج ہے ملکہ جہاں نے خرید کیا تھا، غدر کے بعد بھی بڑی شان وشوکت سے مع اپنے عملے کے اسی عمارت میں رہتی تھیں ان کے مرنے کے بعد تمام املاک گورنمنٹ کی طرف سے خرید کر یہیں اسٹیشن بنا اور گولہ تک ریل کی پٹری ڈالی گئی اور اسی عمارت کی اینٹ لکھیم پور تک ریل کی پٹری پر بچھائی گئی۔

تخمیناً ۱۸۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ نعش کربلائے معلیٰ بھیجی گئی اور بہت اچھی جگہ دفن کی گئیں۔ کربلا کے عرب ان کو ہندوستان کی شہزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، کیونکہ انھوں نے وہاں بہت سخاوت کی تھی۔ ملکہ جہاں کا نام سخاوت اور الوالعزمی سے آج تک یادگار زمانہ ہے اگرچہ ان کی ہڈیاں بھی گل گئیں۔

---

# جذبات بیتاب

(از حضرت بیتاب بریلوی بی اے ایل ایل بی)

کشتۂ برق جمالِ رخِ جانانہ ہے
دل کا قصہ بھی وہی طور کا افسانہ ہے

جس کو دیکھو وہ ترے حُسن کا دیوانہ ہے
کتنا رنگین مرے عشق کا افسانہ ہے

ذوقِ نظارہ جسے دیکھ کے دیوانہ ہے
زندگی کیا ہے اُسی خواب کا افسانہ ہے

شعلۂ حُسن دبے پاؤں ہو سرگرم خرام
شمع کی گود میں سویا ہوا پروانہ ہے

حُسن گر جانِ جوانی ہے تو رنگینیٔ عشق
اے جوانی! تری اک لغزش مستانہ ہے

حُسن کا رنگ وہی عشق کا عالم ہے وہی
شمع کے نور میں ڈوبا ہوا پروانہ ہے

مستیٔ بادۂ رنگیں ہے محیطِ گلشن
ابر اُٹھا ہے کہ اُڑتا ہوا میخانہ ہے

# اُردو زبان کی ترقی کا مسئلہ

( از بھوشن )

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ایک خاص زبان کے سمجھنے والے لوگ ملک میں جتنے ہی زیادہ ہونگے اُسی قدر اُن کے خیالات یکساں ہونگے، اور آپس کی محبت بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس وقت بدقسمتی سے ہندوستان میں کسی زبان کا ملک کی مشترکہ زبان قرار پانا سخت مشکل ہو رہا ہے۔ ایک گروہ ہندی کو ملکی زبان بنانے کے لئے لڑ رہا ہے تو دوسرا اُردو پر شہید ہونے کو تیار ہے۔ اس نزاع میں نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ ایک دوسرے کو شریف گالیاں بھی دینے سے باز نہیں آتے۔

ہندی کے حامی اس بات کے دعویدار ہیں کہ ہندی آسان ہے اور ملک کے دوسرے صوبوں کی زبانوں کے حرف بھی ہندی سے ملتے جلتے ہیں، اس لئے تھوڑے سے تردد میں ہندی کو ملکی زبان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے جاں نثار کہتے ہیں کہ اُردو شاہی زبان ہے، ہندوؤں کی سات پشت کو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا یہ بھی صحیح ہے کہ اُردو جلدی لکھی جاتی ہے اور لکھنے میں کم جگہ گھیرتی ہے اور غالباً انھیں آسانیوں کی وجہ سے وہ ابھی تک عدالتوں میں زندہ ہے۔

لیکن جہاں تک خیال کیا جا سکتا ہے نہ تو ہندی کے قدردان اُردو کو مٹا سکتے ہیں اور نہ اُردو کے خیرخواہ ہندی کا بال بیکا کر سکتے ہیں، دونوں طاقتیں برابر کی ہیں، اُن کے لڑنے کا وہی نتیجہ ہوگا جو ریل گاڑی کے دو انجنوں کے لڑنے کا ہوتا ہے، مجھے تو خوف یہ ہے کہ اس بحث و تکرار اور ردّ و کد میں دونوں زبانیں مٹ جائیں گی اور اُن کی جگہ ایک تیسری ہی زبان لے گی۔ ایسی نازک حالت میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ملک کے خیرخواہ آپس میں ملکر مشورہ کریں اور اُردو ہندی دونوں کو بخوشی زندہ رہنے دیں۔

اُردو پڑھنے والوں کا آج تک خیال ہے کہ انھیں ہندی خود بخود آجاتی ہے اور اس بات سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا ہے کہ ہندی حروف سے واقفیت بہت آسان ہے۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اُردو پڑھنے والے ہندی کی اتنی لیاقت ضرور پیدا کر لیتے ہیں کہ روزانہ کا کام آسانی سے چلا سکیں

لیکن یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ آپس میں ملکر کام کرنے کے بدلے لوگ نت نیا شگوفہ چھوڑ کر اُردو اور ہندی کے درمیان اختلاف کی خندق اور گہری کھود رہے ہیں۔ اُردو کے حامی کبھی کبھی یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ ہندی کوئی زبان ہی نہیں اور یہ تو روزمرہ سننے میں آتا ہے کہ ہندی دیہاتیوں کی زبان ہے ہم اسے جلد نہیں لکھ سکتے، اس کے حروف لکھنے میں زیادہ جگہ گھیرتے ہیں، معلوم نہیں ان لڑکپن کی باتوں سے اُردو کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ ہندی میں ہزاروں بُرائیاں سہی لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ اُردو سے کہیں زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد کثیر ہے، اس کا دائرۂ اثر وسیع ہے، اس کے حامیوں میں ایثار، خلوص اور انتظام اُردو کے حامیوں سے کہیں زیادہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ وہاں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور یہاں باتیں بنانے والوں کی۔

مالی امداد و اعانت کے سوال کو جانے دیجئے اور محض ان باتوں کو دیکھئے جن کا تعلق علمی کوشش سے ہے۔ اکثر اخباروں رسالوں میں اس قسم کے مضامین پڑھنے میں آتے ہیں کہ آئندہ اُردو کی صورت یہ ہونا چاہیئے، اس کو سہل اور عام فہم بنانا چاہیئے اور مشکل لفظوں سے پاک کر دینا چاہیئے لیکن خود اس قسم کی صلاح دینے والے اصحاب جب مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں تو سیکڑوں الفاظ ایسے لکھ جاتے ہیں جن کا مطلب معمولی اُردو خواں نہیں سمجھ سکتا۔ الفاظ کے طرز املا کے متعلق بیسوں مشورے دیکھنے میں آتے ہیں لیکن ان پر باضابطہ طور پر شاذ و نادر ہی عمل کیا جاتا ہے۔ اُردو کی ترقی چاہنے والوں کو چاہیئے کہ اُسے اتنا آسان بنا دیں کہ لوگوں کی دلچسپی بڑھے اور گھبرانے کے بجائے لوگ خواہ مخواہ اُس کی طرف جھکیں

خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہندو مسلمان دونوں طبقوں میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں اُردو کی محبت باقی ہے۔ اور درحقیقت دونوں زبانیں بہت کچھ مشترک ہیں۔ آپ کسی اَن پڑھ دیہاتی سے باتیں کرکے دیکھ لیجئے، کم سے کم پچاس فیصدی الفاظ ایسے ہونگے جن کو آپ اُردو کی ملکیت سمجھیں گے اور آپ خود اُنھیں استعمال کرتے ہونگے۔ یہ اور بات ہے کہ بیچارے دیہاتی کا لہجہ درست نہ ہوگا اور اسکا تلفظ ٹوٹا پھوٹا ہوگا۔ بہرحال اُردو کی ترقی سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔

کیا اچھا ہو اگر ہندی اور اُردو کے خیر خواہ متفقہ طور پر اس بات کی سفارش کریں کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کی کتابوں کا مضمون ایک ہو خواہ وہ اُردو رسم الخط میں ہوں یا ہندی میں۔ اس طرح روزمرہ الفاظ یکساں ہونگے۔ میری رائے میں تو سنسکرت اور فارسی کی تعلیم کم از کم انٹرنس کلاس کے کورس تک، تو ضرور خارج کر دی جائے، کیونکہ یہی دونوں زبانیں ہندی اُردو کو ایک ہونے سے روکتی ہیں۔ اور ان دونوں کے بجائے اُردو۔ ہندی کو انٹرنس تک لازمی کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہندی پڑھنے والے لو

کے لئے اُردو پڑھنا سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ آسان ہوگا، اور اُردو والوں کے لئے ہندی پڑھنا تو ایک معمولی بات ہوگی۔ پنڈتوں اور مولویوں کو اسکول کے نکلے ہوئے طالبعلموں کو مذہبی حیثیت سے سنسکرت اور عربی مفت پڑھانا چاہیئے، اس طرح مذہبی ضروریات بھی پوری ہوجائینگی اور ملکی لٹریچر بھی کم نہ ہوگا اور ملک میں ہر جگہ ہندی اُردو سمجھنے والے لوگ موجود ہونگے۔

"لکھیں عیسیٰ پڑھیں موسیٰ" والی کہاوت جو اُردو کے بارے میں ہندی والے کہتے ہیں بالکل ٹھیک ہے۔ جلدی لکھنے سے کیا فائدہ اگر ہم اُسے جلدی پڑھ نہیں سکتے۔ (۱)۔ اُردو کے خیر خواہوں کو صاف لکھنا چاہیئے (۲) اور اگر زیر و زبر نہیں تو کم سے کم حروف میں نقطے لگانا نہ بھولا کریں (۳) ناجائز طور پر کئی حروف ایک میں نہ ملا دیا کریں[1] (۴) اپنی طرف سے نت نئے الفاظ نہ تراشا کریں[2]۔ غرض اس بات پر کہ اُردو آسان کردی جائے محض زبانی زور نہ دیا جائے بلکہ اُس پر صدق دل سے عمل بھی کیا جائے۔ اُردو یا ہندی کے حامیوں کو یہ کوشش نہ کرنا چاہیئے کہ سارے ہندوستان میں صرف اُردو یا ہندی ہی رائج ہو، دونوں زبانوں کے ایک ساتھ ترقی کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے البتہ دونوں زبانوں کے درمیان گہری خندق نہ ہونا چاہیئے۔

اُردو کے نام پر شہید ہونے والے حضرات اگر اب اُردو کے حال پر رحم کریں تو بہت اچھا ہو۔ درحقیقت اُردو کو شہید ہونے والے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُسے ایسے عاشق چاہیئے جو کچھ دھن دولت اِس کی ترقی پر نچھاور کرسکیں اور اُسی کی بھلائی کی عملی تدبیریں سوچ سکیں۔

ذاتی یا قومی پروپیگنڈا کا خیال چھوڑ کر خالص اُردو کا (جو اصلی معنوں میں اُردو ہو) پروپیگنڈا ہونا چاہیئے

اُردو کانفرنسوں میں ہندی کے عاشقوں کو بھی مدعو کیا جائے اور اُردو کے حامیوں کو ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسوں میں شریک کیا جائے۔ اِس سے جو فائدہ ہوگا ظاہر ہے۔

اگر ان باتوں پر عمل کیا جائے تو ہندی۔ اُردو دونوں کی ترقی ساتھ ساتھ ہوسکتی ہے۔ اور کسی کو دوسرے پر رشک و حسد کا موقع نہیں مل سکتا ہے۔

---

[1] جیسے فیدرجن علٰحدہ کرکے فی درجن لکھنا چاہیئے۔
[2] جیسے صوبہ کی زبان کے بجائے صوبیاتی زبان غلط ہے۔

# قصیدہ

## در تہنیت جشن سلور جوبلی اعلیحضرت قدر قدرت شہنشاہ معظم جارج پنجم قیصر ہند دام اقبالہ

(از مولوی سید ظفر حسن عاصی امروہوی، فاضل منشی فاضل)

خود بخود آج مرا دل ہے مسرت مسکن
نہ خلش ہے، نہ کھٹک ہے، نہ تعب ہے نہ محن

غنچۂ گل سے فزوں، دل ہے شگفتہ میرا
اور طبیعت ہے مری، رشکِ بہارِ گلشن

لذت اندوزِ طرب ہیں جو حواسِ خمسہ
جوش کہتا ہے کہ لکھ دو کوئی نظمِ روشن

نظم وہ نظم کہ چشمک زنِ نظمِ پرویں
شعر وہ شعر کہ شعریٰ سے فزوں تر روشن

فکر وہ فکر کہ جس کو کہیں فکرِ عذرا
لفظ وہ لفظ کہ جس پر ہو فدا دُرِّ عدن

نقرئی جوبلی کنگ کا موقع آیا
اس سے بہتر نہ ملے گا، سببِ نظمِ سخن

مدح سلطانِ معظم میں وہ مطلع لکھوں
مطلعِ غور سے جو ہو سیکڑوں درجہ روشن

جارج پنجم شہِ آفاق، شہنشاہِ زمن
خسروِ امن و اماں تخت نشینِ لندن

مہر و مہ کیا؟ ترے اکلیل کے جوہر پارے
انجمِ چرخ ہیں کیا چیز؟ گلِ پیراہن

آسماں خوابگہِ خاص کی چھت گیری ہے
کہکشاں قصرِ زر اندود کی گویا چلمن

برق کیا ہے؟ غضبِ شاہ کا ہلکا سا نشاں
ابر کیا ہے؟ اثرِ رحمتِ سلطانِ زمن

لطفِ شاہی کی حکایت ہے نسیمِ سحری
خُلقِ خسرو کا کرشمہ ہے شمیمِ گلشن

پرتوِ خور ترے رایت کا سنہری پرچم
چاندنی کیا ہے؟ عرق گیرِ ہمایوں توسن

عدلِ کسریٰ ترے انصاف کے آگے کیا ہے
مہر کے سامنے کیا چیز بھلا شمعِ لگن

دادِ کسریٰ سے تھا اک خطۂ ایراں آباد
اور ترے عدل سے ہے سارا زمانہ روشن

بختِ جم، سطوتِ دارا و سکندر حشمت
تیرے اقبال کے آگے یہ فسانے ہیں کہن

کون دارا؟ ترے دربار کا ادنیٰ درباں
کون جم؟ غاشیہ بردار ہمایوں توسن

ایرج و تور و سکندر ہوں کہ خسرو پرویز
کوئی بہرام ہو، کاؤس کہ کسرائے زمن

قیصرِ روم ہو کوئی، کہ خدیوِ مصری
ملکِ چیں کا کوئی خاقان ہو یا میرِ یمن

اِن سے بڑھکر کہیں رتبہ ہے غلاموں کا ترے
رشک کرے گا نہ کوئی اسمیں سوائے کودن

عہد سابق کو ترے عہد سے نسبت کیا ہے
نور و ظلمت کا سا دونوں میں ہے فرق بیّن

دور وہ دَورِ جہالت تھا یہ دَورِ علمی
ظلمت انگیز تھا وہ عہد۔ یہ عہدِ روشن

اُس زمانہ میں تعصب کی گھٹا چھائی تھی
عہد میں تیرے ہے آزادیٔ مذہب کا چلن

ایک دو ملک کے مالک تھے سلاطینِ سلف
ہفت اقلیم کا مالک ہے تو اے شاہ زمن

شام تک صبح سے چلتا رہے گو مہرِ فلک
تاب کیا تیری حکومت سے نکل جائے کرن

پہلے لوگوں نے کہاں دیکھی تھی یہ امن و اماں
پہلے دَوروں میں تھا کب ایسا زمانہ روشن

ایسا دیکھا تھا زمانے نے کہاں نظم و نسق
سر اُٹھا سکتا نہیں ملک میں کوئی دشمن

راہیں پُر امن، کہیں کیل کا کھٹکا ہی نہیں
اب نہ چوروں کا خطرا اور نہ خوفِ رہزن

غیر ممکن ہے نظر بھر کے بھی دیکھے کوئی
کسی رہرو کو اگر سر پہ ہو سونے کی لگن

شہر ہو، گاؤں ہو، یا دشت و بیابان و جبل
عدل سلطانِ معظم سے ہے رشکِ گلشن

بے سزا پائے ترے ملک میں ظالم نہ رہے
چھپ نہیں سکتا کسی جا کوئی بانیٔ فتن

وہ حکومت ہے تری جس میں ہے خلقت دلشاد
وہ سیاست ہے تری جس سے پریشاں دشمن

عہد میں تیرے ہر اک مذہب و ملت آزاد
اور قانون میں یکساں ہے ہر اک مرد و زن

بحر میں بَر میں تجارت کی کھلی ہیں راہیں
اور سفر کے وہ ذرائع ہیں کہ پردیس وطن

جا بجا صنعت و حرفت کی ترقی کا نشاں
دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے قدرِ ہر فن

علم کی ایسی ترقی بھلا پہلے تھی کہاں؟
اب تو ڈھونڈے بھی نہیں ملتا ہے کوئی کودن

درسگاہوں کی وہ کثرت ہے کہ گنتی ہی نہیں
درس و تدریس کا شائق ہے ہر اک مرد و زن

ہند کے حق میں مبارک ہے یہ دورِ فرخ
چپّہ چپّہ پہ نظر آتی ہے شانِ گلشن

خسروا جشنِ ہمایوں یہ مبارک تجھکو
قیصرا سر پہ ترے ظلِ خدائے ذوالمنن

تاجدارا ترے اقبال کا سایہ ہم پر
سیکڑوں سال اِسی شان سے ہو جلوہ فگن

سلطنت میں تری ہونے کا شرف ہند کو ہے
تیرے الطاف و کرم سے ہے وہ رشکِ گلشن

تاجِ برطانیہ، تا حشر الٰہی قائم
اور رہے ہند یوں ہی زیر نگینِ لندن

نقرئی جوبلی جس طرح کہ دیکھی ہم نے
"گولڈن جوبلی" دیکھیں یونہی اے شاہِ زمن

عاصیِ زار کو ہے تیری ستایش کا شرف
اِک نظر اس پہ بھی اے خسروِ ہند و لندن

# گنگا اشنان

(از مسٹر ایم - ایچ - قریشی)

انسان کی بھی عجب حالت ہے۔ بچپن بے فکری بے پروائی میں گزرتا ہے۔ آندھی آئے، مینھ جائے، سلطنتیں زیروزبر ہو جائیں، قومیں خاک میں مجائیں یا آسمان پر پہونچ جائیں، اس کے خیال اس کی روش میں فرق نہیں آتا۔ نہ خوف عقبیٰ ہے نہ فکر دنیا۔ بچہ خود اپنے قول و فعل کا جوابدہ نہیں۔ اس کے رنج و راحت کے ضامن اور ہی لوگ ہوتے ہیں جن سے وہ خون کے تعلق کا مدعی ہوتا ہے، وہ بےخبر بیہوش ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے کہ فطرت کی کرشمہ سازیاں اس بےخبر کو چٹکی لیکر جگا دیتی ہیں یہ غفلت شعار سوتا سوتا چونک اُٹھتا ہے۔ قدرت کی ہر صناعی اس کے لئے دل فریب بنجاتی ہے۔ ہر جزو کائنات میں ایک حُسن پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی آنکھوں میں کھُب کر دل میں سما جاتا ہے۔ تمام عالم ایک تماشاگاہ معلوم ہوتا ہے جس کی کوئی شے قوت جذب و کشش سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ آہن اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ سنگ آہن ربا۔ دنیا کی نیرنگیاں اسے اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہ بےبسی کے عالم میں اسکی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اس سرشار شباب کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ ہر صدا اُس کے لیے نغمۂ روح پرور اور ہر شئے پیکر حُسن ہے۔ اس کی دانستہ حرکتیں اور با لا ادہ فعل امروزی کی کسوٹی پر نہیں کسے جاتے، اور وہ مآل اندیشی کا دشمن، خواہشات کا پرستار، عیش و نشاط کے سیلاب میں بہا چلا جاتا ہے۔

لیکن زمانہ سدا یکساں نہیں رہتا۔ ایک دن آئینے میں چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے، سیاہ داڑھی اور سیاہ موچھوں میں جو دیکھنے والوں کو طاقت و توانائی کا یقین دلاتی تھیں سفیدی نظر آنے لگتی ہے تو دل سے ہوک اُٹھتی ہے، منہ سے آہ نکل جاتی ہے اور آدمی کلیجہ تھام کر بیٹھ جاتا ہے، خواب غفلت سے آنکھیں کھُل جاتی ہیں، خود بخود ماضی پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے، بچپن کی حرکتوں کا اسے غم ہی کیوں ہونے لگا، معصومیت اُن کی کفیل تھی، لیکن جوانی کی سیہ کاریوں کا وہ جوابدہ ہے، انکی بھیانک تصویر دیکھ دیکھ کر دل دہلا جاتا ہے وہ بڑھاپے کو مہلت تصور کرتا اور تلافی مافات کی فکر میں

پڑھا جاتا ہے وظائف واوراد کے دامن میں پناہ لیتا ہے، احکام مذہب دستور العمل بن جاتے ہیں اب ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا جب تک مذہب اس کے جواز کا فتویٰ نہ دیدے، وہ روزے رکھتا نمازیں پڑھتا اور پیروں پیمبروں کی قبروں کی زیارتیں کرتا پھرتا ہے۔ کیوں؟ تاکہ شباب کی کجرویوں کا کفارہ ہو جائے۔ اور کیفر وکردار سے بچ جائے۔

امیر وغریب سب پر یہ تینوں زمانے گزرتے ہیں اور بلا امتیاز فرقہ و مذہب عمر کی آخری منزل میں سب کی دماغی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ اپنی اپنی بساط کے موافق دونوں سے زندگی کی دوسری منزل میں لغزشیں ہوتی ہیں اور تیسری منزل میں قدم رکھتے ہی دونوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس لئے شب جوانی کے بعد صبح پیری نمودار ہوتے ہی کوئی فکر عقبیٰ سے خالی نہیں ہوتا۔

رنگ ناتھ بھی معصومیت و معصیت کی منزلوں سے گزر چکا تو اسے بھجن سندھیا وغیرہ کا شوق پیدا ہوا۔ اس کا نت نیم یہ تھا کہ صبح کو اٹھکر پہلے گھنٹہ بھر گنگا جی کی پوجا کرتا، اس کے بعد مندر جاکر درشن کرتا، واپس آکر کھانا پکاتا اور کھاپی کر نوکری پر چلا جاتا، شام کو چھ بجے مندر میں سادھو سنتوں کی سیوا میں حاضر ہو کر گیان دھیان کے اپدیش سنتا رہتا اور آرتی میں شریک ہو کر گھر آتا۔

ایک دن ایک گیانی مہاتما نے گنگا جی کی استت کی اور مہاکرتے کرتے پنڈت راج جگناتھ کا قصہ بطور مثال سنایا۔ رنگ ناتھ جویائے حق اور طالب نجات تھا، اس قصہ سے اسے پختہ یقین ہو گیا کہ گنگا جی کے چرنوں پر عقیدت کے پھول چڑھانے سے نجات ہے، شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی، چنانچہ اس نے گنگا اشنان کرنے کی ٹھان لی۔

لیکن امیر وغریب کا فرق یہی ہے کہ امیر کے دل میں ہوس پیدا ہوتے ہی دولت فوراً گوہر مقصود سے دامن بھر دیتی ہے، اور غریب کی آرزوئیں مدتوں دل میں شاہد مستور کی مانند پردہ نشین رہتی ہیں اور انھیں طلسم پیچ وتاب سے اس وقت تک آزادی نصیب نہیں ہوتی جب تک وہ ریاضت ونفس کشی کی کڑی منزلیں طے نہ کرلیں۔ رنگ ناتھ کے وسائل میں اس قدر وسعت کہاں تھی کہ گنگا اشنان کا خیال آتے ہی چل کھڑا ہوتا۔ اس کے وطن سے الہ آباد پانچسو کوس تھا۔ پیدل جاتا تو آتے جاتے مہینوں لگ جاتے۔ دان لیکر جانا اس کی غیور طبیعت کے خلاف تھا۔ کسی سیٹھ ساہوکار سے قرض لیتا تو عمر بھر کو اس کے ہاتھ بک جاتا، اب صرف ایک ہی صورت باقی تھی اور وہ یہ کہ محنت ومشقت کرکے روپیہ جمع کرے۔ چنانچہ اس نے سادھو سنتوں کی سنگت چھوڑ دی، شام کو صرف آرتی میں شریک ہوتا اس طرح جو وقت بچتا اس میں "پڑیاں" بناتا، سال بھر محنت کرکے پچاس روپیے جمع کرلئے

مہینہ بھر کی رخصت لی اور گنگا اشنان کی تیاریاں کرنے لگا۔

رنگ ناتھ اسٹیشن ذرا دیر سے پہونچا۔ ٹکٹ بٹ رہے تھے، گھبراہٹ میں اُسے خیال نہ رہا، اس طرف جاکر ٹکٹ مانگنے لگا جہاں سے صرف اول درجہ کے مسافروں کو ٹکٹ ملتا ہے۔ بابو صاحب نے پہلے تو اس کی طرف توجہ ہی نہ کی، دو چار منٹ بعد گرج کر بولے "تیسرے درجے کا ٹکٹ یہاں نہیں ملتا اُدھر کی کھڑکی سے لو۔" رنگ ناتھ کمرے کا طواف کرتا ہوا دوسری کھڑکی پر پہونچا۔ وہاں مسافروں کی بھیڑ تھی ایک دوسرے کو دھکا دیتا اور چاہتا تھا کہ میں سب سے پہلے ٹکٹ لے لوں۔ رنگنا تھ سب سے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد کچھ اور مسافر آئے اور اُس کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور اُسے دباناڈ ھکیلنا شروع کر دیا۔ اس مصیبت سے مفر نہ دیکھکر اُس نے صرف اپنی جگہ پر قائم رہنے کی کوشش کی۔ خدا خدا کر کے کھڑکی تک پہونچا۔ ٹکٹ بابو کو کرایہ دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک آدمی نے جو قد میں اُس سے لمبا تھا اس کے کندھے پر سے ہاتھ بڑھا کر کہا بابو جی دہلی کا ٹکٹ دینا۔ بابو جی نے اس کے پیسے لیکر ٹکٹ دیدیا اور وہ رنگ کو دباتا ڈھکیلتا نکل گیا۔ اس کے بعد رنگ کو بھی ٹکٹ مل گیا اور وہ اس بلا سے نجات پا لیا۔

تھوڑی دیر مسافر خانے میں انتظار کرنے کے بعد گاڑی آئی، پھاٹک کھلا اور مسافر گھبرائے ہوئے پلیٹ فارم پر دوڑنے لگے، جنھیں خالی گاڑی ملگئی وہ جھٹ سے جا بیٹھے مگر بیٹھتے ہی دروازہ بند کر لیا اور اب جو مسافر آتا ہے اس سے کھڑکی سے آدھا دھڑ باہر نکالے کہہ رہے ہیں "یہاں جگہ نہیں ہے دوسری گاڑی میں جاؤ۔" رنگنا تھ ایک گاڑی میں سے چند سفید پوش مسافروں کو اُترتا دیکھکر اس میں گھسنے لگا، لیکن اُن میں سے ایک نے زور سے اُسے پیچھے ڈھکیل دیا اور گرج کر بولا ابے گھبراتا کیوں ہے، ہم اُتر لیں تو بیٹھ جانا۔" رنگ ناتھ گرتے گرتے بچا، لیکن سنبھل کر پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ جب یہ اُتر چکے وہ جا بیٹھا۔ سارے کا سارا درجہ خالی تھا، پاس کے درجوں میں بھی زیادہ مسافر نہ تھے، مگر جو تھے غریب تھے۔

گاڑی چلنے والی ہی تھی کہ ایک پنڈت جی سر سے پاؤں تک صاحب بنے درجے میں داخل ہوئے۔ قلیوں نے جلدی سے سامان پھینکا۔ ایک ٹرنک کا کونہ رنگ کے گھٹنے سے رگڑتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف جا پڑا۔ اُس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی مگر ضبط سے کام لیا اور فقط اتنا ہی کہا "جناب، دیکھکر سامان نہیں رکھتے"۔ سودیشی صاحب نے رنگ ناتھ کو کڑی نگاہوں سے دیکھا اور قلیوں سے حجت کرنے لگے، وہ آٹھ آنے مانگتے تھے اور یہ چار آنے دیتے تھے

قلی لیتے نہ تھے۔ بحث ہو رہی تھی کہ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چلنے لگی، قلی کچھ دور ساتھ ساتھ دوڑے مگر صاحب نہ پسیجے اور جب گاڑی کی رفتار ذرا تیز ہو گئی اور قلی درجے سے پیچھے رہ گئے تو صاحب نے چونی پلیٹ فارم پر پھینک دی جسے قلیوں نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھکر اُٹھا لیا۔

اب سودیشی صاحب کو اسباب کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہوئی، ایک طرف کی پٹری پر "ہولڈال" کھولکر بستر لگایا، دوسری پٹری پر اپنے ٹرنک اور ٹفن باسکٹ جمانے لگے، جگہ کچھ کم معلوم ہوئی رنگ سے ڈپٹ کر بولے "تم دوسرے درجے میں جا کر بیٹھو" اُس نے عاجزانہ لہجہ میں کہا کہ سامان کی جگہ پٹری کے نیچے ہے لیکن صاحب نے پھر دل دہلا دینے والی آواز سے ڈانٹ دی اور کہا "تم اُٹھ جاؤ، ہم۔ ہم یہاں اپنا کھانا رکھیں گے، تم ہمارے کھانے کے پاس نہیں بیٹھ سکتے" آشتی کو جنگ سے بہتر سمجھ کر رنگ ناتھ دوسرے درجے میں چلا گیا۔ صاحب اسباب جما کر بستر پر دراز ہوئے اور ذرا سی دیر میں سینے سے ہارمونیم کے سے سُر بلند ہونے لگے۔

رنگ ناتھ کے درجے میں جو مسافر تھا وہ بھی غریب ہی تھا۔ رنگ سے گھنٹہ دو گھنٹے باتیں کرتا رہا۔ ایک اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہری تو بولا "ذرا میرا سامان دیکھتے رہنا، میں اپنے ایک دوست کے پاس جاتا ہوں، وہ کہیں پچھلی گاڑی میں ہیں، میں جب دو اسٹیشن پہلے پانی پینے اُترا تھا تو نظر پڑے تھے"۔ رنگ نے جواب دیا "مل آؤ، میں دیکھتا رہونگا"۔

رنگ ناتھ اپنے درجے میں اکیلا رہ گیا، دو چار اسٹیشن نکل گئے اور دوسرا مسافر اپنے دوست سے باتوں میں ایسا لگ گیا کہ اپنے درجے میں نہ آیا۔ اتنے میں ایک ٹکٹ کلکٹر ہاتھ میں کانٹا لئے درجے میں داخل ہوا، سامان پر نگاہ ڈالی اور کڑک کر بولا "یہ سامان کس کا ہے، زیادہ معلوم ہوتا ہے"۔

رنگ: "یہ چھوٹی گٹھری اور یہ بستر میرا ہے اور باقی سامان ایک اور مسافر کا ہے جو اپنے دوست کے پاس کسی پچھلی گاڑی میں بیٹھا ہے"۔

ٹکٹ کلکٹر: "ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے، یہاں رات دن تجھ جیسے چوروں ہی سے پالا پڑتا ہے تجھ سے ناخنوں میں بھرے پڑے ہیں"۔

رنگ: "بابو صاحب یہ سامان میرا نہیں، ابھی اس کا مالک آیا جاتا ہے"۔

ٹکٹ کلکٹر: "فضول ٹر ٹر کیوں لگا رکھی ہے، ہم ابھی تولتے ہیں، تجھے دام دینے ہونگے، ٹکٹ دکھا، کہاں سے سوار ہوا ہے"

رنگ: "یہ لیجئے، لیکن میرے پاس مشکل سے پندرہ سیر سامان ہوگا" "بس دوسرے مسافر کے سامان

کے پیسے ہرگز نہ دونگا۔

ٹکٹ کلکٹر:۔ (تھپڑ مار کر) "ابے میں نے تجھ سے بہت سے ہیکڑ سیدھے کئے ہیں، سیدھا رہ نہیں تو پولیس کے حوالے کر دونگا۔"

رنگ ناتھ بابو صاحب کے رعب میں آکر چپ ہو گیا، لیکن گاڑی دوسرے اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی، ٹھہرتے ہی دوسرا مسافر آگیا اور اُس نے اپنا ٹکٹ بابو صاحب کو دکھا دیا۔ وہ کچھ ایسے کھسیانے ہوئے کہ اُنھوں نے سودیشی صاحب کو جتنا کر ٹکٹ بھی نہ مانگا اور اُتر کر چلتے ہوئے۔

اِس کے بعد کوئی واقعہ نہیں پیش آیا اور رنگ ناتھ رات کے آٹھ بجے آگرہ پہونچ گیا، اُتر کر پھاٹک پر ایک بابو صاحب کو ٹکٹ دیا اور مسافر خانے میں داخل ہو کر انتظار کرنے لگا کہ بھیڑ کم ہو تو بابو صاحب سے پوچھے کہ الہ آباد جانے والی گاڑی کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ جب بھیڑ کم ہوئی تو اُس نے بابو صاحب سے بات چیت کرنی چاہی مگر وہ پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور ایک دوست سے باتیں کرنے لگے۔ رنگناتھ نے خدا خدا کر کے اُنھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے سوال کا جواب ملا تو یہ "اب تک کیا سو رہے تھے" وہ سامنے جو گاڑی جا رہی ہے اس میں جانا چاہیئے تھا۔ اب صبح آٹھ بجے گاڑی ملے گی۔"

مسافر کی جگہ مسافر خانے کے سوا کہاں۔ امیر ہوتا تو کسی ہوٹل کا رُخ کرتا۔ اب جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے جگہ نظر نہیں آتی۔ کوئی بستر جما کر خراٹے لے رہا ہے، کوئی پڑا پڑا بیڑی پی رہا ہے۔ ایک دری پر دو مسافر بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ رنگ ناتھ نے بڑی تلاش سے ایک کونے میں اپنا بستر رکھا اور بیٹھ گیا اتنی جگہ نہ تھی کہ وہ بھی بستر بچھا کر سو جاتا، بیٹھے بیٹھے دوچار دفعہ آنکھ لگ گئی لیکن تکلیف کی وجہ سے ہر بار کھل گئی۔ چار بجے کے قریب بیٹھے بیٹھے تھک گیا، کھڑا ہو گیا مگر کب تک کھڑا رہتا آخر تھک کر بیٹھ گیا۔ اُس نے مجبوراً دوتین دفعہ ایسا ہی کیا۔ پولیس والے کی نظر پڑ گئی، اُسے شک ہوا کہ کوئی چور اُچکا موقع کی تاک میں ہے، اُس نے آکر ڈانٹا اور مسافر خانے سے نکال باہر کیا۔

رنگ ناتھ جائے تو کہاں جائے مسافر خانے سے کچھ فاصلے پر کھلے میدان میں جا بیٹھا۔ جاڑوں کے دن تھے نسیم سحری اٹھکھیلیاں کر کر کے ستم ڈھانے لگی، لیکن قہر درویش برجان درویش جو کچھ پڑی جھیلی۔ آٹھ بجے اُس نے الہ آباد کا ٹکٹ لیا اور مسافروں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دوسرے دن الہ آباد پہونچا، اسٹیشن سے باہر کچھ فاصلے پر ایک پنڈت جی نے راما شاما کے بعد دو چار منٹ بات چیت کر کے ایک دوسرے مسافر کی طرف رُخ کیا۔ رنگ پوچھتا ہی رہا

پنڈت جی میں کہاں ٹھہروں، مسافر ہوں کسی کو نہیں جانتا۔ لیکن اسے جواب نہ ملا کیونکہ فقیر کی صورت سوال ہے، وہ سمجھ چکے تھے کہ اس سے کچھ ہاتھ نہیں لگنے کا اور اس کی طرف توجہ کرنا محض وقت ضایع کرنا ہے۔ رنگو نے مجبوراً شہر کا رخ کیا اور پوچھتا پچھتا ایک دھرم شالے میں جا اترا۔ رات بھر آرام کر کے صبح اشنان کو گیا۔ گنگا تٹ پر بھی اُس سے کسی نے بات نہ کی وہ کچھ شرادھ وغیرہ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی پنڈت پجاری اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ مجبوراً اُس نے گھاٹ سے پانی میں اُتر کر چند غوطے لگائے اور باہر نکل آیا۔ جب غوطہ لگا کر باہر آتا تھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلتا تھا۔

"ہے گنگے کر گوڑ گرہن کی
طالع ور تو جی جائیں گے
مسکل ہے تو گرہن کی
ہے گنگے کر گوڑ گرہن کی"

---

# غزل

(از ادیب فاضل وکال منشی ہری کرشن سکسینہ بی اے بی ٹی)

یہ حالت قلب کی ہے جب سے اپنا آشیاں اُجڑا
کہ شاخِ گل نظر آتی ہے دستِ باغباں مجھکو
نہیں واقف چمن سے جان دیتا ہوں اسیری پر
ہیں تنکے آشیانے کے قفس کی تیلیاں مجھکو
سوادِ عشق میں دارفتگی سے اب یہ عالم ہے
حیات و موت سے کچھ بھی نہیں سود و زیاں مجھکو
فنا کی روشنی نے بیخودی میں صاف دکھلایا
بنائے منزلِ دل میں مکانِ لامکاں مجھکو
حیاتِ جاوداں کا راز ہے ترکِ تمنا میں
کمندِ خود فراموشی بنی ہے نردباں مجھکو

---

سلہ غور سلہ غریبوں

# تنقید کتب

## ایوانِ تصوّر[1]

ہندوستان کا کوئی فردبشر مسز سروجنی نائیڈو کے نامِ نامی سے ناواقف نہ ہوگا۔ آپ کی علمی فضیلت اور حب الوطنی کا چار دانگ ہند میں شہرہ ہے۔ سیاسیات میں آپ آل انڈیا لیڈر علم وفضل میں فخرِ ملک اور شعر وسخن میں ٹیگور ثانی ہیں۔ آپ کی شان میں مولانا ظفر علی خاں صاحب اڈیٹر زمیندار نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ

سارے چمن کے اندر اک گونج سی ہے پیدا — اے عندلیب شیدا تیری نوازنی سے
تیری زبانِ شیریں وہ کام کر دکھائے — جو ہو سکے نہ ہرگز تلوار کے دھنی سے

اس کتاب میں اسی سحر بیان شاعرہ کی دلآویز انگریزی نظموں اور غزلوں کا اردو نثر میں ترجمہ ہے جو ملک کے نوجوان ادیب مسٹر ظفر قریشی دہلوی نے آزادانہ مگر دلپذیر اسلوب میں کیا ہے۔ شروع میں مسز نائیڈو کا پیغام خواتین ہند کے نام دیا گیا ہے جو محترمہ موصوفہ نے زبان اردو میں تحریر فرمایا ہے اس پُر مغز پیغام کی سلیس و نفیس زبان بہت سے ادیبوں کے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ آپکی پند و نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرقی عورت کو قدیم حسن وخوبی کا خزانہ اور جدید تعلیم وتہذیب کے بہترین جوہروں کا آئینہ ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ جزو پر مسٹر اختر دہلوی کی لکھی ہوئی مسز نائیڈو کی سوانحعمری ہے جس میں آپ کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ بعض غیر متعلق باتیں بھی لکھدی گئی ہیں۔ مثلاً عربی وفارسی شاعری کا قصہ، اور بنگالیوں کی انگریزی شاعری وغیرہ۔ اس مضمون میں جسے درحقیقت کتاب کا مقدمہ کہنا چاہیئے مسز نائیڈو کے کلام پر قابل قدر تبصرہ کیا گیا ہے۔

محبت، حب وطن، شفقت مادری، انسانی ہمدردی، غرض کوئی قابل قدر جذبہ ایسا نہیں جسکا جلوہ ان کی کسی نہ کسی نظم میں نظر نہ آتا ہو۔ ہر طبقہ اور ہر نوع کے انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرنے

[1] قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ: دار الادب پنجاب باروو خانہ اسٹریٹ لاہور

میں انھیں خاص ملکہ ہے اور ان کی نظموں میں مؤذن کی اذان اور پجاری کے بھجن سے لیکر پسنہاریوں کے گیت، پالکی برداروں کے گانے اور فقیر کی صدا تک سب نغمے موجود ہیں۔ اشیاء کے رنگین اور نمایاں پہلو دیکھنے کا اُن کو خاص ملکہ ہے اور بسا اوقات وہ چند فقروں یا چند لفظوں میں کسی واقعہ یا نظارہ کی پوری تصویر ہماری نگاہ کے سامنے کھینچ دیتی ہیں۔

۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۱۷ء تک مسز نائیڈو کی نظموں کے تین مستقل مجموعے پانچ پانچ برس کے وقفہ سے جداگانہ ناموں کے ساتھ شائع ہوئے جن کے ناموں کا ترجمہ فاضل مترجم نے "طلائی آستانہ"[۲] "طائرِ وقت" اور "شکستہ پر" کیا ہے۔ اور تینوں مجموعے علی الترتیب اس ترجمہ میں شامل ہیں۔ اگرچہ ایک زبان کا دوسری زبان میں صحیح ترجمہ کرنا محال کے قریب ہے، لیکن فاضل مترجم نے بڑی محنت سے ترجمہ کیا ہے اس پر بھی اکثر جگہ الفاظ ثقیل اور ترکیبیں نامانوس رہ گئی ہیں۔ مثلاً پالکی والوں کے گیت میں لکھتے ہیں:۔ "وہ پالکی میں اس طرح تیرتی ہوئی جا رہی ہے جیسے الفاظ فضائے تصور میں بیراں ہوں" "بیراں" کوئی لفظ نہیں ہے، اگر "بیرنا" سے "بیراں" بنایا گیا ہے تو نامرغوب ایجاد ہے۔ سپیرے کے گیت میں تحریر ہے:۔ جس پر چاند کی کرنیں جذب ہو رہی ہیں" یہاں "پر" کے بجائے "میں" ہونا چاہیے اسی گیت میں تحریر ہے کہ "یاسمینی شگوفوں کی صورت میں نور آگل رکھا ہے" یہاں اُگلنے کی تقریب مذاقِ سلیم پر گراں ہے۔ "ایک سیلِ آتشیں بہا رکھا ہے" سیل مؤنث ہے۔ اسی طرح "خواہشات" کی سیمیں کرنِ ماہتاب" کی ترکیب بھی فصیح نہیں ہے۔

پسنہاریوں کے گیت میں انگریزی لفظ granary کا ترجمہ غلہ خانہ بھی کچھ نامانوس سا ہے

بایں ہمہ فاضل مترجم کی محنت قابلِ داد ہے جس کی بدولت مسز نائیڈو کے شاعرانہ جذبات سے اُردو داں جماعت بھی ناواقف نہ رہیگی۔ کتاب کی لکھائی چھپائی بہت صاف اور روشن ہے جلد اور ٹائیٹل بھی دیدہ زیب ہے، چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات

## عجیب[۱]

یہ قاضی عبدالغفار صاحب کے نصف درجن افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں ہر افسانہ دلچسپ دلآویز ہے۔ مغربی ممالک کی دیکھا دیکھی آجکل مختصر فسانہ نویسی کا شغل ہندوستان میں بھی عام ہو گیا ہے۔ کوئی ایسا ادبی رسالہ نظر نہیں آتا جو افسانوں سے خالی ہو۔ لیکن جس چیز کو واقعی افسانہ کہہ سکتے ہیں وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے اکثر افسانے دل بہلاؤ کے علاوہ علم و حکمت

---

[۱] قیمت ایک روپیہ حجم ۱۵۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ: دار الادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

[۲] انگریزی نام یہ ہیں: (1) Golden Threshold (2) Bird of Time (3) Broken Wings.

کے نکتوں سے بھی خالی نہیں ہوتے۔ مثلاً کھٹملا نامی فسانہ میں خوف کے فلسفہ پر بالکل درست لکھا ہے،

"انسان کے تمام محسوسات میں خوف سب سے قوی ہے۔ مذہب والوں نے بھی اس کی قوت سے کام لیا ہے، پیر، فقیر، اور حاکم سب اس سے کام لیتے ہیں۔ خوف نہ ہو تو دنیا میں کوئی کسی کا محکوم نہ رہے۔ یہ جو سب لمبی لمبی داڑھیوں والے اپنے ہاتھوں پر بیعت کراتے ہیں، لوگوں سے جھولاتے ہیں، گلے میں ہار ڈلواتے ہیں، یہ سب اسی جنس کے سوداگر ہیں۔ دلوں میں خوف پیدا کرکے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ اپنی زندگی کی ترکیب سے خوف کے عنصر کو نکال دو، پھر دیکھو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مرعوب نہ کر سکے گی۔ سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزا کو شامل سمجھتے ہو وہ درحقیقت زہر کے اندر موجود ہی نہیں، وہ خود تمہارے اندر ہیں۔ اپنے اندرون کو ان اجزا سے پاک کر لو، پھر سانپ کے منہ میں انگلی ڈال دو، ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا میں ہوں۔۔۔۔۔۔ شیرخوار بچہ بالکل بیخوف ہوتا ہے۔ سانپ کا منہ اس کے منہ پر رکھ دو، آگ کی طرف اسکا ہاتھ لیجاؤ، کبھی خوفزدہ نہ ہوگا۔ مگر جب شعور آئیگا تو وہ دیکھے گا کہ آگ سے سب ڈرتے ہیں۔ سانپ سے سب خوفزدہ ہیں، خوف کے جراثیم اس کے دماغ میں جگہ پائیں گے اور اسکی فطرت مسخ ہو کر رہجائیگی۔"

"رویائے صادقہ" میں مقصد حیات اور فلسفۂ افادیت پر اس طرح بحث کیگئی ہے:۔

"بے ثباتِ زندگی کے متعلق یہی نقطۂ نظر زندگی کی ضمانت ہے۔۔۔۔ زندگی کے پھل کو آنا نچوڑو کہ اس کے رس کا آخری قطرہ بھی باقی نہ رہ جائے۔۔۔۔۔۔ مرتے دم تک زندگی کے مزے اٹھائے جاؤ رو تے ہوئے گئے تو کیا گئے۔ موت کے اندیشہ میں گھلنے سے موت ٹل نہیں سکتی! پھر اندیشہ کیوں!!"

اسی طرح "چاہ نخشب" میں فلسفۂ جبر و اختیار پر لکھا ہے:۔

"ارادے خود بخود بدل جایا کرتے ہیں۔ منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے اور انسان مغرب کی طرف چلتا ہے اس کارخانہ میں جس کو دنیا کہتے ہیں ہم، ہم اپنے ارادوں کے فرعون کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں رسیاں ہمارے گلوں میں ہیں اور کوئی ہمارے پیچھے ہے۔۔۔۔۔ چابک بدست! جس کے تازیانہ کی ضربیں سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی کب دیتی ہیں!!۔۔۔۔۔ یہ غلام کیا جانیں کہ کدھر سے آئے اور کدھر جانا ہے!!"

قاضی صاحب کی حکیمانہ جنت ملاحظہ ہو:۔

"اگر جنت کا تخیل بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آدمی زندگی کی کثافت سے محفوظ ہو جائے۔۔۔۔۔ سکون کامل ہو اور زندگی بلے مقصود اور بے حساب ہو!!"

غرض یہ چھوٹی سی کتاب بہت دلچسپ ہے۔ اسکی زبان بھی پاکیزہ ہے، کیونکہ اس میں کہیں بھی عربی فارسی اور سنسکرت الفاظ کی خواہ مخواہ ٹھونس ٹھانس نہیں ہے۔ البتہ ایک آدھ لفظ کے متعلق ہم کو ضرور شک ہے۔ مثلاً قاضی صاحب نے خوابؔ[1] کو مؤنث لکھا ہے جو کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا اسی طرح ایک آدھ اور الفاظ نظر ثانی کے محتاج ہیں، لیکن ہمکو پوری امید ہے کہ یہ معمولی فروگذاشتیں نظر ثانی پر آیندہ اڈیشن میں باقی نہ رہیں گی۔

لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ انگریزی وضع کی دیدہ زیب جلد ہے۔

## فردوس خیال[2]

ناظرینِ "زمانہ" مولانا محمود اسرائیلی کے نام نامی سے ناواقف نہیں ہیں۔ آپ کی گرانمایہ نظمیں اکثر "زمانہ" میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب مولانا محمود اسرائیلی کی ۱۰۰ رباعیات وقطعات کا دلپذیر مجموعہ ہے۔ جن میں سے ہر رباعی یا قطعہ کسی مستقل عنوان کے ماتحت ہے۔ ہر صفحہ پر جلی قلم سے صرف ایک ہی رباعی مع عنوان درج کی گئی ہے۔ کلام کی خوبیاں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، اور بہت سی رباعیاں درسی کتب میں رکھے جانے کے قابل ہیں، نمونہ کے طور پر صرف چند نذر کیجاتی ہیں

"صرفِ بے محل" کے عنوان سے فرماتے ہیں:۔

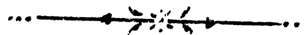
اوقات کی اپنی قدر و قیمت سمجھو — جو وقت ملے اُسے غنیمت سمجھو
اِک مفلس باوضع غنی ہو تو ہو — مُسرف کو مگر کبھی غنی مت سمجھو

"فلسفۂ حیات" میں فرماتے ہیں:۔

ہر بزم میں اِک حُسنِ ادب پیدا کر — ہر رنج میں اِک رنگِ طرب پیدا کر
ماضی سے بہرحال یہ حال اچھا ہے — جینا ہے تو جینے کا سبب پیدا کر

کائنات کی حقیقت اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

قطرہ ہی تو ہے گوہرِ تاباں کیا ہے — پتھر ہی تو ہے، لعلِ بدخشاں کیا ہے
اِک چاک ہے کوزہ گر کا دہرِ رقصاں — مٹی کا کھلونا ہے یہ انساں کیا ہے



---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۳ وہ اکثر خوابیں دیکھا کرتے تھے۔

[2] لکھائی چھپائی روشن، کاغذ نفیس، تقطیع جیبی حجم ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ۸؍ آنہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

## رام کہانی[1]

رامائن کی داستان شروع سے آخر تک مرقع عبرت و نصیحت ہے۔ تعدد ازدواج کی خرابیاں، سچی برادرانہ محبت، ہندی خاتونوں کی شوہر پرستی، والدین کی اطاعت، مصیبت میں صبر و ضبط، خطرہ میں دلیری قول کی پابندی، دوستی کا نباہ، ظلم و ستم کی بیخکنی، غرور و نخوت کے نتائج، نیکی کی جزا، بدی کی سزا، حق کی فتح، ناحق کی شکست، آئین جنگ اور راج نیتی وغیرہ وغیرہ سب کچھ رامائن میں موجود ہے "رام کہانی" میں مولوی سید سلطان حسین صاحب سابق مدرس اردو و فارسی گورنمنٹ ہائی و نارمل مدارس صوبۂ متحدہ نے رامائن کا سلیس اور عام فہم خلاصہ پبلک کے سامنے پیش کیا ہے یہ کتاب طلباء کے پڑھنے کے قابل ہے۔

## گلہائے جعفری

یہ ننھی منی سی کتاب خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے۔ لکھنوی ڈپٹی کلکٹر کے پاکیزہ کلام کا ایک روح پرور انتخاب ہے۔ جو جیبی تقطیع کے ڈھائی جزو پر شائع ہوا ہے۔ شروع میں مولانا نیاز فتحپوری اڈیٹر رسالۂ "نگار" لکھنؤ کا لکھا ہوا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں اثر صاحب کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت چار آنہ۔ شائقین "نگار" بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب فرمائیں۔

## خوشۂ پروین

جب سے ملک میں مشہور سخنوروں کے چیدہ سو سو شعر کا انتخاب چھوٹی تقطیع میں شائع کرنے کی ہوا چلی ہے۔ اُس وقت سے یہ مشغلہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب مشہور یا غیر معروف کی کوئی قید نہیں رہی۔ جس دوست کا کلام پسند آیا، سو شعر چُنے، اور ایک مقدمہ نما تقریظ لکھکر چھپوا دیے۔ اسی قسم کے چمکدار شعروں کا ایک ننھا سا مجموعہ یہ "خوشۂ پروین" بھی ہے جس میں منشی فضل دین صاحب فدا دینانگری کے سو اشعار سید کاظم دہلوی اڈیٹر "کہکشاں" دہلی نے انتخاب کر کے شائع کئے ہیں۔ حسب معمول شروع میں سید کاظم اور برہمی جہان آبادی کی دو مختصر تقریظیں بھی ہیں۔ کلام کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے جس سے ناظرین خود اندازہ فرما سکیں گے:۔

| | |
|---|---|
| برق و بجلی نہ بنے دل کہ شرارہ نہ بنے | وہ نظر میں جو سما جائیں تو کیا کیا نہ بنے |
| ہر نفس میں کوئی شامل نظر آتا ہے مجھے | آج دل حسن کے قابل نظر آتا ہے مجھے |
| نفس جذب وحدت سے معمور ہو کر | بھڑک اٹھا شمع سر طور ہو کر |

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۱۱۶ صفحات مجلد یا بے جلد قیمت درج نہیں غالباً بارہ آنہ ہوگی ملنے کا پتہ ماڈرن بکڈپو آگرہ

# لطفِ سخن

(از جناب اختر جوناگڑھی)

گلۂ ستم کشِ الفت دراز ہو نہ سکا — تھا کوئی راز جو افشائے راز ہو نہ سکا
ہوا نہ نازشِ بیجا کا حوصلہ، پھر بھی — تمھارے ناز سے میں بے نیاز ہو نہ سکا
تمھارے چاہنے والوں کی وہ ہوئی کثرت — کہ خاص و عام میں کچھ امتیاز ہو نہ سکا
گلہ نہ کیوں ہو مجھے پرسشِ غمِ دل کا — کہ تم سے اتنا بھی بندہ نواز ہو نہ سکا
نظر جو آئی بلندی میں شانِ پستی کی — تو امتیازِ نشیب و فراز ہو نہ سکا
پڑا جو پردہ حقیقت کا چشمِ باطن پر — تو ظاہرا کبھی ترکِ مجاز ہو نہ سکا
کسی کے جور نے مجبور کر دیا اختر — کہ نیک و بد میں کبھی امتیاز ہو نہ سکا

(از حضرت فرحت کانپوری، بی اے۔ ایل ایل بی)

دل میں اعجازِ نظر سے ہے تلاطم پیدا — حسن میں حسنِ کشش سے ہے تکلم پیدا
شوخیِ بادِ صبا کوئی چمن میں دیکھے — آج ہر غنچے سے ہے شانِ تبسم پیدا
گوش ہیں گوش اگر غور سے سن لے غافل — ہے زبانِ گل و غنچہ سے تکلم پیدا
میں جو خاموش ہوں کیا کیا ہے سمجھتی دنیا — میری ہستی سے ہے اک شانِ توہم پیدا
اک نظر مجھ پہ بھی اے ساقیِ میخانہ نواز — دل میں ہے جوشِ تمنا سے تلاطم پیدا
اللہ اللہ! مرے ذوقِ نظر کی شوخی — جلوۂ حسن میں ہے حسرتِ تلاطم پیدا
میں نے چھیڑا ہے عجب نغمۂ سازِ ہستی — میرے ہر تارِ نفس سے ہے ترنم پیدا
میری آنکھوں میں سمایا ہے تمھارا جلوہ — میری نظروں میں ہر اک شے سے ہوا ہے تم پیدا
مقصدِ حسن ہے آسودگیِ دل فرحت — جلوۂ حسن سے ہے کیفِ تبسم پیدا

(از حضرت فرخ ابوالعلائی کانپوری)

موت ہے یا غش ہے، یا خوابِ گراں ہے زندگی — غافلوں کی زندگی کیسی، کہاں ہے زندگی
عشق کے جلووں سے روشن ہے یہ ساری کائنات — دل ہے شعلہ، اور شعلوں میں نہاں ہے زندگی
زود تابِ دل ابھی سے اور شبِ فرقت دراز — ایک اک تارے میں اب تک شعلہ فشاں ہے زندگی

یاد ہے، ہاں یاد ہے، ہجرت ازل کی بزم سے　　مرحلہ اک میرے اُس کے درمیاں ہے زندگی
خضر بھی مرتے ہیں اب ذوقِ فنائے عشق پر　　اے حجابِ مرگ کیا تجھ میں نہاں ہے زندگی
تو کبھی تھا زندگیِ عارضی پر نوحہ خواں　　تیری بدنظمی پہ خود اب نوحہ خواں ہے زندگی
عشق دل میں، پھول گلشن میں، شرارے سنگ میں　　ہر جگہ ہر رنگ میں شعلہ فشاں ہے زندگی
قبر کی منزل پہ یارب تفرقہ کیسا پڑا　　میں کہاں ہوں، اور خدا جانے کہاں ہے زندگی
اختلاف آپس میں اتنا اور اُس پر یہ نظام　　حسنِ فطرت سے عناصر میں نہاں ہے زندگی
دم بخود کیونکر نہ ہوں، اتنا سکوں، اتنا جمود　　غور کر فرخ کہ یہ خواب گراں ہے زندگی

(از منشی بابو رام بھٹناگر ایم۔ اے۔ مست بریلوی)

فکرِ مآل کا میں گنہگار بھی نہیں　　دنیا میں کوئی مجھ سا سیہ کار بھی نہیں
حلقہ بگوشِ سبحۂ و زنار بھی نہیں　　ایماں فروشیوں کا روادار بھی نہیں
آنکھوں میں اپنی طاقتِ دیدار بھی نہیں　　پہلو میں یار آنے کو تیار بھی نہیں
آسودۂ تپش یہ دلِ زار بھی نہیں　　آمادۂ ستم وہ ستمگار بھی نہیں
تم کیا ہو جانِ جاں مری رگ رگ سے پوچھ لو　　میں کیا ہوں اس سے تم کو سروکار بھی نہیں
پیوست ہو گیا مری رگ رگ میں نشترِ غم　　تیرِ نگہ جگر کے ہوا پار بھی نہیں
بدنام ہو رہی ہیں مری سجدہ ریزیاں　　تیری تجلیوں کو مگر عار بھی نہیں
فانوسِ کائنات میں تیری تجلیاں　　آزاد بھی نہیں ہیں گرفتار بھی نہیں
مضمر نگاہِ ناز میں ہیں بے رُخائیاں　　درمانِ دردِ دل مجھے درکار بھی نہیں
پیری نے سر جھکا لیا فرطِ حجاب سے　　سجدہ کیا شباب نے اکبار بھی نہیں
روزہ نماز مست کا مشرب سہی مگر　　تم ہاتھ سے پلاؤ تو انکار بھی نہیں

(از جناب مظہر عزیز صاحب ایم۔ اے۔ میور ہوسٹل الہ آباد)

نہ یوں کوئی کسی کے درپئے آزار ہو جائے　　کہ اک کر خواب میں بھی "فتنۂ بیدار" ہو جائے
وہ خوش آیند نغمہ چھیڑ مُطرب جس کے سننے سے　　گراں خوابی سے بختِ خفتہ بھی بیدار ہو جائے
نہیں ملتی اگر راہِ حرم، افسوس کیسا ہے؟　　طوافِ بتکدہ ہی، زاہدِ دیندار ہو جائے
کبھی دیکھی ہے اے پیرِ مغاں وہ چشمِ میگوں بھی؟　　کہ جسکی دید سے ہشیار بھی سرشار ہو جائے
میں وہ برگشتہ قسمت ہوں کہ صحرائے جنوں ہی میں　　مجھے اک اک قدم بھی منزل دشوار ہو جائے

مسرت بھی تو ہے میرے لئے خالی مسرت سے — طبیعت زیست سے یارب نہ یوں بیزار ہو جائے
کسی کے واسطے مرنا نہ نصب العین ہو جبتک — حیاتِ جاوداں بھی باعثِ صد عار ہو جائے
اگر دل میں رہے تو دردِ پنہاں وجہِ نازش ہے — یہ کیا! آ کر زباں پر صورتِ اشعار ہو جائے
ترے افکار عالی ہیں مگر مضطر مجھے ڈر ہے — کہیں تو خود نہ وقفِ کوششِ اظہار ہو جائے

## انتخاب مشاعرہ گورنمنٹ ہائی اسکول ہاتھرس

(۳- اپریل ۱۹۳۵ئہ کو گورنمنٹ ہائی اسکول ہاتھرس میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جسکا مختصر انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے)

(از منشی بھیروں سہائے ماتھر مائل دہلوی ہیڈ ماسٹر۔ ہاتھرس)

صحرائے دل کو سینچا ہے اشکوں سے اس قدر — جو ایک مشتِ خاک تھا گلزار ہو گیا
مجھ کو ہے کچھ خیالِ جدائی نہ ہوشِ وصل — ایسا شرابِ عشق سے سرشار ہو گیا
ہچکی میں کوئی قوتِ برقی ضرور ہے — اس پار تھا شیدا ابھی اس پار ہو گیا

(از مولوی احمد میاں انور قائم گنجوی)

رحمت نے عاصیوں کو گلے سے لگا لیا — جس نے خطا نہ کی وہ خطاوار ہو گیا

(از جناب حسرت قائم گنجوی)

ساقی کے پائے ناز پہ میں پی کے گر پڑا — بیہوش ہو کے اور بھی ہشیار ہو گیا
الفت میں موت زیست ہے عاشق کے واسطے — ڈوبا جو بحرِ عشق میں وہ پار ہو گیا

(از مولوی اقبال الدین احمد صدیقی اقبال)

خود رعبِ حسن مانعِ دیدار ہو گیا — در بھی حریمِ ناز کا دیوار ہو گیا
اللہ رے ذوقِ دید کہ میں وقتِ نزع بھی — آہٹ کسی کی سنتے ہی ہشیار ہو گیا

(از مولوی برکت علی شیدا ہاتھرسی)

لو آ کے دیکھ لو مرے صد چاک دل کی سیر — کوچہ تمھارے عشق کا گلزار ہو گیا
کعبہ سے کام ہے نہ کلیسا سے کچھ غرض — سر رکھ دیا جہاں وہ درِ یار ہو گیا

(از منشی کنہیا لال ماتھر طالب ہاتھرسی)

ہر قطرہ اشک کا تری الفت کے فیض سے — ٹپکا جو آنکھ سے دُرِ شہوار ہو گیا
زاہد نے کی ہزار نصیحت مجھے مگر — میں فصلِ گل کے آتے ہی میخوار ہو گیا
آنے لگا ہے کچھ ستمِ یار میں مزہ — طالب میں جب سے خوگرِ آزار ہو گیا

# عالمِ نسواں

ابھی تک جاپان میں سرکاری ملازمت میں مردوں کو عورتوں پر کسی قدر تفوق حاصل تھا لیکن اب شہنشاہ جاپان نے عورتوں کے مساوی حقوق بذریعہ شہنشاہی فرمان تسلیم کرلئے ہیں اور سرکاری احکام نافذ ہوگئے ہیں کہ جب کسی دفتر میں اسامیاں خالی ہوں تو اُن میں سے نصف عورتوں کو دی جائیں۔

---

جاپان نے علاقہ مانچوکو میں تعلیم نسواں کو ترقی دینے کی غرض سے مفت ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اس علاقہ میں افیون کا استعمال بھی ممنوع قرار دیدیا گیا ہے اور گھر گھر پھر کر بچوں کو نشہ آور چیزیں کھلانے کے خلاف پرچار کرنے کیلئے ملازم رکھے گئے ہیں۔ مانچوکو میں ہر عورت کے لئے شادی کرنا بھی قانوناً لازمی قرار دیا گیا ہے۔

---

پچھلے دنوں کراچی کے ایک زنانہ مدرسہ میں ایک استانی کی جگہ خالی ہوئی جس کی تنخواہ تیس روپیہ ماہوار تھی۔ چنانچہ اس کے اشتہار کے جواب میں دوسو چونسٹھ عورتوں کی درخواستیں آئیں جن میں دو گریجویٹ، چھیالیس انڈر گریجویٹ اور باقی میٹرک تھیں۔ اس سے ملک کی موجودہ اقتصادی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ضمنی طور پر اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب عورتوں میں بھی تعلیم عام ہو رہی ہے۔

---

ہندوستان میں مسلمانوں کو طلاق کا حق حاصل ہے لیکن عورتوں کو چند خاص صورتوں کے سوائے خلع کا حق حاصل نہیں ہے، اس نقص کو رفع کرنے کیلئے مولوی محمد احمد صاحب کاظمی ایم۔ اے ممبر لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک مسودۂ قانون مرتب کیا ہے جو اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں پیش ہوگا۔

---

۱۲۔ اکتوبر کو انجمن خواتین بمبئی نے ایک ریزولیوشن پاس کرکے برٹش گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ گورنر جنرل ہند اور صوبجات کے گورنروں کو جدید آئین کے رو سے جو شاہی ہدایات جاری کیجائیں انہیں ایک دفعہ یہ بھی رکھی جائے

کہ عورتوں کو صوبجاتی اور مرکزی حکومتوں کے نظم و نسق خصوصاً سررشتہ تعلیم صحت عامہ وغیرہ محکموں میں کافی حصہ دیا جائے، اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کی حالت درست کیجائے اور ایام زچگی میں ان کے ساتھ رعایتی سلوک کیا جائے۔



انجمن خواتین دہلی حبش کے زخمیوں کی طبی امداد کے لئے ہندوستانی عورتوں کی طرف سے ایک میڈیکل مشن بھیجنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دیکھئے یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے اور گورنمنٹ ہندیہاں کے ڈاکٹروں کو حبش جانے بھی دیتی ہے یا نہیں۔ جنگ بلقان میں ڈاکٹر انصاری صاحب کی رہنمائی میں ہندوستان سے ایک طبی وفد سرکاری اجازت سے بھیجا گیا تھا۔



میسور کی مسز اقبال النساحسین صاحبہ بی۔ اے نے پردہ میں رہتے ہوئے نجی طور پر انگریزی تعلیم حاصل کی تھی جس کے بعد آپ نے اعزاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ جسکے صلے میں میسور یونیورسٹی نے آپکو سونے کا وہ تمغہ دیا جو سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنیوالے طالب علم کو عطا کیا جاتا ہے۔ آپ سات بچوں کی ماں ہیں اور مسلم مشاورتی کمیٹی میسور کی ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ انگلستان گئی تھیں جہاں سے آپ نے معلمی کا ڈپلوما حاصل کیا ہے۔ اپریل گذشتہ میں آپ استنبول گئی تھیں جہاں آپ انٹرنیشنل وومین کانگریس میں شریک ہوئیں اگست گذشتہ میں آپ سوئیزرلینڈ میں گرل گائڈ کی بین الاقوامی کانفرنس میں بھی مدعو تھیں۔



لاہور کی مس لیلاوتی اور مس بھنڈاری لندن یونیورسٹی سے ٹیچرس ڈپلومہ لینے انگلستان تشریف لیگئی ہیں۔ امسال پنجاب یونیورسٹی کے ہندی امتحان میں کماری پریم کماری گپتا نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے۔



مسز چندراوتی لکھن پال ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کو سال کی بہترین ہندی کتاب لکھنے کے صلے میں "ناگری پرچارنی سبھا بنارس" نے بارہ سو روپیہ کا بیش بہا انعام دیا ہے۔ آپکو پہلے بھی عورتوں کے متعلق ایک کتاب لکھنے پر پانچسو روپیہ کا انعام مل چکا ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں علم الاقتصاد کے ایم۔ اے امتحان میں امسال مس سدھا گپتا سب سے اول آئی ہیں



# علمی خبریں اور نوٹ

"اُردو۔ہندی۔ہندستانی" کے مسئلہ پر جو بحث "زمانہ" میں چھڑی ہوئی ہے اُس کے متعلق اس پرچے میں بھی دو مضمون مندرج ہیں۔ اُردو کے اکثر معزز رسالوں نے بھی منشی پریم چند صاحب کی رائے اور خیالات کی پُرزور تائید کی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ہمارے نئے ہمعصر "کنول" (آگرہ) نے لکھا ہے کہ:۔

"منشی پریم چند صاحب کا مضمون اپنی افادی اور تعمیری حیثیت سے بہت ممتاز ہے، میں اُن کے خیال سے بالکل متفق اور تائید میں ہوں۔ کہ ہندوستانیوں کی ایک زبان ہونی چاہئیے اور لسانی انجمن کی جو تحریک پیش کیگئی ہے اسکا عملاً ظہور پذیر ہونا بھی اشد ضروری ہے جبتک ایسا نہ ہوگا اور جس وقت تک ہم اُردو ہندی کو باہم ملا نہ دینگے یہ افتراق جو آج نظر آرہا ہے دُور نہیں ہوسکتا۔ "کنول" منشی پریم چند کی تجویز کا پُرجوش خیر مقدم کرتا ہے اور یقین ہے کہ اُردو کے تمام رسالے اور اخبار اس مسئلے کے لئے اپنے کالم وقف کرینگے اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوتاہی و دریغ نہ کرینگے۔ "نیرنگ خیال" کے مشرق نمبر میں حضرت لطیف احمد کی تائید شائع ہوئی ہے۔ امید کہ دیگر ادبا، اور انشا پرداز بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔"

اسی طرح ہمارے دوسرے معاصرین نے بھی اس تحریک کی پُرزور تائید کی ہے۔ ایڈیٹر صاحب "نگار" (لکھنؤ) نے البتہ اس قسم کی "مفاہمت" کو نہ صرف ناممکن و ناقابلِ عمل قرار دیا ہے بلکہ اس سے اصولاً اختلاف بھی ظاہر کیا ہے۔ صاحب موصوف کی رائے میں اُردو ہندی کا اختلاف ہندو مسلمانوں کے "کلچرل" اختلافات کا نتیجہ ہے اور "دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے چنانچہ ان میں اتحاد معاشرت و معیشت کی صورت پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہے"۔ اس بات کو تسلیم کرنیکے باوجود کہ "ہندو مسلمان وطنیت کے لحاظ سے یقیناً ایک ہی چیز ہیں" آپکا خیال ہے کہ "جس حد تک ذوق و میلان، تہذیب و معاشرت کا تعلق ہے یہ دونوں بالکل ایک دوسرے سے علحدہ ہیں اور ہمیشہ علحدہ رہینگے" اور...... "چونکہ زبان قومی خصوصیات میں سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز ہے اس لئے مسلمانوں کیلئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ ہندی زبان یا ہندی رسم الخط اختیار کریں۔ اور ہندوؤں سے بھی یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندی پرچار کو چھوڑ دیں بالکل خلاف عقل ہے"۔ "دونوں جماعتوں کی ذہنیتوں کے درمیان اتنا زبردست فرق ہے کہ کبھی ملکر کام ہی نہیں کرسکتے"۔ ہم کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہندو مسلمان اپنی قومی خصوصیات یا مذہبی ضروریات سے دست بردار ہوئے بغیر ہندستانی زبان کو مشترکہ ملکی زبان کا درجہ دیسکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے دونوں کو کسی قدر کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی سے کام لینا پڑیگا۔

ترکی میں جب سے دور جدید شروع ہوا ہے ترکی زبان سے غیر زبانوں کے لفظ خارج کرنے کی تحریک شروع ہوگئی ہے عربی الفاظ کی جگہ بھی ترکی میں اب پُرانے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈکر رکھے جارہے ہیں۔ گورنمنٹ نے ایک کمیشن مقرر کیا ہے جو روزانہ پانچ غیر ملکی الفاظ نکال کرکے انکی جگہ پانچ جدید ترکی الفاظ تجویز کرکے اخبارات میں شائع کرادیتا ہے۔ ایران میں بھی حب الوطنی

کی تحریک نے بھی صورت اختیار کی ہے۔ چنانچہ ایرانی حکومت نے شہروں کے پُرانے نام تک بدل دیئے ہیں۔ علماء کی ایک مجلس قائم کردی گئی ہے جس کا کام یہ ہے کہ فارسی زبان کی ایسی لغت مرتب کیجائے جس میں کوئی لفظ غیر ایرانی نہو۔ عوام بھی اس تحریک کے پیرو اور حامی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایران کے موجودہ شاعروں کے کلام میں ایران قدیم کے مذہب، معاشرت اور تہذیب کی جھلک نمایاں ہے۔

---

ہندی ساہتیہ سمیلن کے گذشتہ اجلاس میں جو مہاتما گاندھی کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا ایک تجویز یہ بھی پاس ہوئی تھی کہ ہندی زبان میں ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جسمیں ملک کی مختلف زبانوں کے مشہور اہل قلم کے بہترین مضامین شائع کئے جائیں تاکہ ہندی داں جماعت کو مختلف صوبوں کی زبانوں کی توسیع و ترقی کا اندازہ ہوسکے اور اُن کے جذبات و خیالات سے واقفیت ہو اس تحریک کے حامیوں کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ اس طرح ہندی خواں لوگوں کی نظر وسیع اور خیالات بلند ہونگے جس سے ہندی زبان کی ترقی میں بھی بہت بڑی مدد ملیگی۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تین اصحاب کی ایک مختصر کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس کے ممبر مسٹر کنہیا لال منشی (بمبئی) پنڈت گردھر شرما (جھالراپاٹن) اور پنڈت ہری ہر شرما (مدراس) منتخب ہوئے تھے۔ اس کمیٹی نے ہمارے دوست منشی پریم چند صاحب کے رسالہ "ہنس" کو ایک لمیٹیڈ کمپنی کے ماتحت دوبارہ جاری کرنیکا فیصلہ کیا ہے۔ اب اس میں مختلف زبانوں کے متعدد ادیبوں کے خاص خاص مضامین ترجمہ کرکے ہندی میں شائع کئے جائیں گے، ملک کے خاص خاص واقعات پر نوٹ لکھے جائیں گے۔ مختلف زبانوں کی تاریخ اور ارتقا کے خاکے پیش کرکے اُن کے موجودہ رجحانات پر توجہ دلائی جائیگی مختلف صوبوں کے بہترین گیتوں کے اقتباسات درج ہونگے۔ مختلف زبانوں کے رسالوں کا خلاصہ ہوگا۔ خاص خاص تصانیف کا ریویو اور مشہور انشاپردازوں کی سوانحعمریاں وغیرہ شائع کیجائینگی۔ اس رسالہ کی ایڈیٹری کے لئے منشی پریم چند صاحب اور مسٹر کنہیا لال منشی منتخب ہوئے ہیں۔ اس کا پہلا نمبر اسی مہینہ میں نکلنے والا ہے، جسکے لئے خود مہاتما گاندھی نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے اور ڈاکٹر ٹیگور اور ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنی نظمیں عنایت فرمائی ہیں۔ ہم اس رسالہ کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور اسکی کامیابی کیلئے دست بدعا ہیں۔ یوں بھی منشی پریم چند کی ہراوبی کوشش سے "زمانہ" کو خاص دلچسپی ہونا چاہئے۔

"زمانہ" کے کسی گذشتہ نمبر میں حضرت جوش ملیح آبادی کے مجوزہ "رسالہ کاخ بلند" کا مفصل اعلان شائع ہوچکا ہے۔ اب اس پرچے کا نام بدلکر "کلیم" کردیا گیا ہے۔ یہ رسالہ دہلی سے شائع ہوگا اور اسکا کاروباری پہلو لالہ دلیش بندھو صاحب ڈائرکٹر "تیج" کے ذمہ ہوگا۔ ہمکو امید ہے کہ قدردانان اُردو اس رسالہ کی خریداری منظور کرکے جوش صاحب کی ادبی اُولوالعزمی کی داد دینگے۔ موصوف اُردو کے شاعر اعظم ہیں اور اُن کی ذات گرامی پر قدردانان اُردو کو جتنا فخر ہو کم ہے۔

---

مولوی امیر احمد صاحب علوی ڈپٹی کلکٹر پنشنر اُردو ادب کے قدیم خادم ہیں، اور سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد آپ ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے ہیں۔ آخری شاہ دہلی کے سوانحی حالات مرتب کرنیکے بعد آپنے بنی اسرائیل کے زوال کی تاریخ قلمبند کرنا شروع کردی ہے جسمیں آپ نے متعدد کتابوں سے تحقیق کرکے واقعات درج کئے ہیں۔ کتاب عنقریب ہی شائع ہونیوالی ہے۔ اس کے ابتدائی باب کا کچھ حصہ آیندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔

حضرت جگر مراد آبادی کا مکمل دیوان "شعلۂ طور" کے نام سے نہایت اہتمام کے ساتھ نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ نواب سید علی حسن صاحب طاہر کی قدردانی اور مولانا وصل بلگرامی کی جانفشانی سے یہ دیوان جیس شان واہتمام کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ اس پر ہم اپنے عزیز دوست جگر صاحب کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں جگر زمانہ حال کے بہترین اُردو شاعروں میں ہیں۔ اور ایک مدت کے انتظار کے بعد ان کا قابل دید مجموعہ کلام دیدہ زیب صورت میں شائع ہوا ہے۔ شائقین دو روپیہ میں منیجر نامی پریس لکھنؤ سے طلب فرمائیں۔

---

حضرت منور لکھنوی نے شری مد بھگوت گیتا کا جو منظوم ترجمہ گلزار نسیم کی بحر میں شروع کیا تھا، وہ اب مکمل ہو گیا ہے اور بنارس کے نامور ادیب و فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس صاحب نے اس کا مقدمہ لکھنا منظور فرمایا ہے یہ ترجمہ چھوٹی تقطیع کے تین سو صفحات پر ختم ہوا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ عنقریب ہی اس کی اشاعت کا انتظام مکمل ہو جائے گا۔ ملک کے اولو العزم پبلشروں کو اس کی اشاعت کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔

---

پانی پت میں ۲۶۔ اکتوبر کو شمس العلماء مولانا حالی کی سالگرہ کا صد سالہ جشن بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کے زیر صدارت منایا جانیوالا ہے۔ اس یادگار میں ہم شمس العلماء مرحوم کی تصویر ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

## تصحیح

اس نمبر کے اول مضمون میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں، ناظرین درست فرمالیں:۔

صفحہ ۲۰۳ پر فٹ نوٹ نمبر ۳ اس طرح پڑھا جائے: "ذکر کے مطابق مغربی تصوف مختلف فرقوں میں پانچ عقائد مشترک ہیں ان میں ایک عقیدہ درمیانی دیوتاؤں کی موجودگی اور ان کی معرفت خدا کا عالم شہود پر کارفرما ہونا ہے"

صفحہ ۲۰۶ سطر ۱۹ میں "دوسرت" کے بجائے "سرت" پڑھنا چاہیئے۔

صفحہ ۲۰۶ سطر ۱۰ میں "برون رخت" کی جگہ "درون جست" پڑھیئے۔

صفحہ ۲۰۸ سطر ۲ میں "God" کے بعد "دنا" رہ گیا ہے۔

صفحہ ۲۰۸ سطر ۱۳ و ۱۳ میں "Vons" کے بجائے "Vous" پڑھیئے۔

صفحہ ۲۰۵ کی آخری سطر میں "ہور" کے بجائے "ظہور" ہونا چاہیئے۔

**راماین مسدس** (مصنفہ جناب منشی رامجی لال صاحب کپور سنبھلی) اس راماین کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب و غریب انداز میں بیان کیا ہے مصنف کی جدت طراز ذہن رسا نے نازک نادر استعارات اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں جو روحانی و وجدانی لطافت سے مملو ہیں۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں لے رہا ہے راماین کے اندر ۹ تصویریں رنگین نہایت نفیس ہیں صفحات ۳۰۸ فی جلد نفیس قیمت مجلد باتصویر تین روپے ے بلا تصویر عگ بلا جلد و تصویر عار

**بیوہ** - (مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کی تازہ تصنیف) اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور ان ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں، اس کے ساتھ ہی اس مسئلے کے حل کرنے کی بھی کوشش کیگئی ہے کہ بیواؤں کیلئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحات ........ قیمت ...... عہ

**گھر گرستی** (مصنفہ مولوی سید بشیر حسن صاحب امروہوی مولوی فاضل) اس کتاب کے اندر قصہ اور مکالمہ کے پیرایہ میں عورتوں کو اچھی بیبیاں، اچھی مائیں، اور رفیقۂ حیات بننے کی تعلیم دی گئی ہے ہر عمر کی عورتوں کو دلچسپ قصوں اور دلنشین مثالوں کے ذریعہ سے جملہ امور خانہ داری اخلاق و معاشرت سکھائے گئے ہیں۔ یہ بے نظیر کتاب اس قابل ہے کہ لڑکیوں کو جہیز میں دیجائے، کوئی شریف بی بی اور کوئی شریف گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے ہز ہائینس نواب بیگم صاحبہ رام پور کی سرپرستی میں یہ کتاب تیار کی گئی ہے ........ قیمت ... عہ

**اختر ستان** مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پرتاثیر و نشتر ہے۔ قیمت عہ

## مجبور وفا

والدین اور اغیار کے ہاتھوں کیلاش اور کامنی کے بیجے جذبات دلی کا کچلا جاکر ایک دردناک صورت اختیار کرنے اور آخر میں ایک کی جان پر بنجانے کا یہ الم انگیز واقعہ پنڈت کشن پرشاد کول، ممبر انجمن خدام ہند لکھنؤ نے ایک دلدوز پیرایہ میں اس طرح لکھا ہے کہ انسان پڑھتے پڑھتے بیقرار ہو جاتا ہے چونکہ یہ ناول محض سوسائٹی کی اصلاح کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس لئے باوجو ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات کی ضخامت ہونے کے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ رکھی گئی ہے۔ آپ کا کتب خانہ اسکی ایک جلد سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔

**تاریخ ہند** (عہد اسلامی) غلام محمد لے شیخ نے ہندوستان کے عہد اسلامی کی یہ مختصر تاریخ طلبائے اسکول و کالج کے نفع رسانی کیلئے انگریزی زبان میں تحریر فرمائی ہے۔ ضخامت زائد از دو سو صفحات قیمت ایکروپیہ عہ

**قربانی** - یہ بھی پنڈت کشن پرشاد کول کا ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جس میں سوسائٹی کی اصلاح خصوصاً شادی بیوگان پر زور دیا ہے۔ قیمت ..... ۸ر

**بہار سخن** - بابو شیام سندر لال صاحب برق ایڈوکیٹ سیتاپور کا لاجواب و نادر تاریخی تذکرہ جسمیں نہایت تلاش و تجسس سے پانسو چھیاسٹھ ۵۶۶ ہندو شعرا ماضی و حال کے سوانح حیات و منتخب کلام درج ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے جس سے فہرست دیکھتے ہی فوراً شاعر کا حال معلوم ہو جاتا ہے پرائیویٹ کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کی چیز ہے ........ قیمت دو روپیہ ..... عگ

**دنیائے راز** - ابوالفضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز مع تصویر مصنف قیمت ............ عہ

**سب کتابیں ملنے کا پتہ مینیجر زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور**

# آپ کی تقدیر

آپ ایک کارڈ پر صرف کسی پھول کا نام اپنے نام اور پتہ کے ساتھ لکھ کر بھیج دیجئے۔ اور ہم آپ کو بذریعہ وی۔ پی پوسٹ ایک روپیہ چار آنہ میں (علاوہ محصولڈاک) آیندہ ایک سال کیلئے آپ کے متعلق مفصل حالات لکھ کر بھیجدینگے جس میں کاروبار کے اندر نفع ونقصان ترقی۔ تبادلہ۔ ملازمت میں تخفیف۔ بچوّں کی ولادت۔ شادی بیاہ۔ خوشی وغم اور جسمانی عوارض کے حالات ہوں گے۔ اور ستاروں کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کیلئے ہدایات بھی ہونگی۔ ہماری پیشگوئیوں کی تصدیق کیلئے آزمایش شرط ہے۔

ہر قسم کے پانچ سوالوں کے صحیح جوابات کے لئے علاوہ محصولڈاک سوا روپیہ۔ عہ

نوٹ:۔ جو شخص ہمارے بیان کو چیلنج کریگا ہم اُسے مبلغ سو روپیہ انعام دیں گے۔

پروفیسر جی شنکر۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷ لاہور

# ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سُرمہ

## مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کراپر صاحب بہادر سی، آر، ایس فیلو آف کیمسٹری لندن

جس کی بابتہ لندن۔ کلکتہ پنجاب، آگرہ میڈیکل کالج کے سندیافتہ ڈاکٹروں، نوابوں اور راجاؤں و معزز حکما صاحبان ڈپٹی کلکٹران و معزز یورپین انگریزوں نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقی روشنی کے واسطے مفید ہے اور سب سے بہتر زود اثر دوا ہے، ملک روس اور افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے حکیموں و ویدوں نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا کو چھوڑ کر اس سُرمہ کو استعمال کیا ہے۔

## ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں کامیابی

نگاہ ناپکر سُرمہ لگایئے دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقایص دور ہو جائینگے عینک کی ضرورت نہیں رہتی۔ دھند۔ ڈھلکا آنسو بہنا۔ سوزش آنکھوں کے سامنے اندھیرا پلکوں کے اندر کی سُرخی گرہانی دور ہو جاتی ہے۔ کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد ڈال لیجئے۔ پربال۔ سبل۔ جالا۔ پھولا۔ ابتدائی موتیابند، ناخونہ، آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ ذرا سا آنا بند ہو جاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے آنکھ کا تکان اور سُرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔

قیمت فی تولہ تین روپیہ (سے) محصولڈاک (۵) ملنے کا پتہ منیجر نگم کمپنی۔ نیا چوک۔ کانپور۔

# بالوں کا طلسم

"استری کا موہنی" اور "بالوں کا طلسم" ڈاکٹری قاعدہ کی رو سے بنے ہوئے **سپر فائن ہیر آئیل** اور **پدمنی ہیر واش** کے استعمال کر
بیسوں گنا بڑھ جاتا ہے۔ اول الذکر تیل ناریل وغیرہ کے نباتاتی مرکب تیل سائنٹفک حکمت سے شدہ کرکے بنتا ہے۔
اس سے کپڑے چکنے نہیں ہوتے تو بھی بال ملایم رہتے ہیں۔ اس کی خوشبو دیرپا ہے اس کے اندر خاص ترکیب سے
جو ادویات ملائی جاتی ہیں اُن کی تاثیر سے جلن۔ بفا وغیرہ بیماریاں رفع ہو کر بال ہر آفت سے محفوظ رہتے ہیں۔
**پدمنی ہیر واش**۔ بالوں کی جڑوں سے زہریلا مادہ اور میل صاف کرکے انھیں خوب نکھارتا اور چمکاتا ہے دونوں
کے سحر سے گنج رفع اور بال گرنے سے بند ہو جاتے ہیں۔ برسوں کے اترے ہوئے بال جمانے میں بیحد موثر اور استریوں اور
لڑکیوں کے بال کمر تک بڑھانے بدرنگ موٹے بال چمکانے اور دلفریب دراز ہنوس ایسے بنانے میں جادو صفت چھوٹی عمر میں
سفید بال رونما نہیں ہو سکتے۔ پدمنی تیل اور پدمنی پوڈر کی قیمت الگ الگ ہیں۔ ایک روپیہ فی بوتل بلا محصول۔
**بڑھاپے میں جوانی کے مزے**۔ گو زبان سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آسکتی۔ مگر جوانی کے نشہ میں کھوئی
ہوئی طاقتیں بحال ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ حیرت انگیز راجندر رزو ٹانک کام میں لائیں۔ یہ ساٹھا پاٹھا کا بہمہ و اعضاء
رئیسہ کو تحریک و جولانی بخشتی ہے۔

بچہ کی ولادت۔ محرقہ وغیرہ سے پیدا شدہ ناتوانی۔ سوداوی شکایات و ادھیڑ عمر کی جملہ تکالیف اور ہر قسم کے
درد ریح میں اکسیر اعظم ہے۔ دماغی مشاغل کے شوقینوں اور بیٹھکر کام کرنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔
سستی، پست ہمتی۔ دھڑکن۔ اور نظام اعصاب کی کمزوری کا بیخطا علاج۔ حافظہ اور ہاضمہ کو جولانی دیتی ہے۔
یہ خوشگوار اور مفرح قلب ہے۔ اس کے سحر سے بڈھے جوانی کی چستی اور توانائی دوبارہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کا اثر
دیرپا اور ہر موسم میں مفید ہے۔ قیمت فی بوتل ڈھائی روپیہ بلا محصول۔
**پدمنی پمپل کریم**۔ جوانی کی پھنسیوں۔ کیلوں۔ کالے بھورے داغوں کے لئے اکسیر۔ جھائیں جھپ ہر قسم کے
زہریلے پھوڑے پھنسی۔ زخم۔ گرمی والے۔ کھجلی اور پھوڑوں کے سر منہ اور بدن کی پھنسیوں کا حکمی علاج۔ شروع میں
لگانے سے داد چنبل جڑ نہ پکڑ سکیں گے۔ اگر چنبل یا کسی اور بیماری سے جلد بدنما اور کھردری ہو جائے تو اس سے
صاف اور خوشنما ہو جاتی ہے۔ مچھر اور پسوؤں کے کاٹے کا پختہ علاج اور جلد کی سطحی شکایات کے لئے ازحد مفید ہے
مغرب اس اکسیر سے ناآشنا ہے۔ قیمت فی بوتل ایک روپیہ علاوہ محصول۔
**راجندر ٹوتھ پاؤڈر**۔ منہ کی بدبو اور دانتوں میں پانی لگنے۔ مسوڑھوں سے خون بہنے اور ریح دندان
کے لئے اکسیر ہے۔ پایوریا کے لئے نافع۔ دانتوں کی پیلاہٹ اور سیاہی رفع کرکے انھیں چمکاتا ہے۔ اور
جملہ شکایات سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ اٹھارہ سال کا مجرب ہے۔ قیمت فی بوتل ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول ہے۔ یہ سب چیزیں رجسٹرڈ ہیں۔

المشتہر

**ٹھاکر جے آر رائے جنرلسٹ پدمنی ٹائیلٹری گوالمنڈی لاہور**

## کتابوں کے شوقین عزیز سے پڑھیں

آپ مختلف مقامات سے مختلف کتابیں طلب فرماتے ہیں تو آپ کو زائد محصول ڈاک و کرایہ ریل کا متحمل ہونا پڑتا ہے اگر تمام کتابوں کا آرڈر خواہ وہ کہیں شایع ہوئی ہوں ہمیں دیدیا کریں تو اخراجات میں کفایت کے علاوہ آپ کا قیمتی وقت بھی ضایع نہ ہو۔ نیز آپ ان مراعات سے بھی مستفید ہو سکیں گے جو ہم اپنے مستقل خریداروں سے روا رکھتے ہیں۔

**عجیب**۔ ہندوستان کے مشہور فلسفی ادیب قاضی عبد الغفار کی تازہ تصنیف ۔عجیب کلب کے عجیب ممبروں کے عجیب حالات ۔پھڑکتی ہوئی آپ بیتیاں۔
قیمت ایک روپیہ (عمر)

**لیلیٰ کے خطوط و روزنامچہ**۔ فطرت انسانی کے دو نقش۔ ایک فریاد ہے غم نصیب عورت کی۔ ایک داستان ہے عیش پرست "مرد" ظالم کی
قیمت ہر دو حصص تین روپیہ آٹھ آنہ (۸؎)

**ایوان تصویر**۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے حسین و جمیل گیتوں کا ترجمہ از ظفر قریشی دہلوی۔ ہندوستانی معاشرت کا خوبصورت مرقع۔ مشرقی تمدن کی دلفریب تصویر۔ قیمت صرف دو روپیہ عہ

**انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ**۔ از شیخ قاسم الدین۔ بی۔ اے۔ ہندوستانی محبان وطن کی آزادی کیلئے پہلی دیوانہ وار کوشش غیر ملکی حکومت کے نہتے فوجیوں پر بے پناہ مظالم۔ ایک انصاف پسند انگریز کا نعرۂ حق۔ ......... قیمت ایک روپیہ۔ عمر

کسی رسالے یا اشتہار کی کسی کتاب کے اشتہار دیکھ کر بلا توقف ہمیں خط لکھدیا کریں۔ تعمیل ارشاد فوراً ہوگی۔

**دار الادب پنجاب**
بارود خانہ سٹریٹ لاہور

## بہترین آم کے قلم

طلب فرمایئے۔ ہمارے فرم سے جو ۱۹۲۸ء سے قایم ہے۔ اور لکھنؤ کے مشہور خربوزہ کے بیج و ہر قسم کی سبزی ترکاری کے تخم روانہ ہوتے ہیں۔

### اس کے علاوہ

زردہ۔ قوام۔ گولی۔ عطر کی گاد۔ اور خوشبودار تمباکو۔ لکھنؤ کی مشہور چکنی ڈلی چکن کی ٹوپی کے پلے و فردیں۔ لحاف و رضائی بنے ہوئے اور ہر قسم کے کھانے و پینے کی تمباکو وغیرہ نہایت ارزاں فروخت ہوتی ہے۔

### تاجروں سے خاص رعایت

فہرست کارخانہ طلب کرنے پر مفت روانہ کیجاتی ہے۔ فرمایش کے ساتھ نصف قیمت پیشگی آنا چاہیئے ورنہ تعمیل سے معذوری ہے۔ اپنا نام والقاب و پتہ ڈاکخانہ و اسٹیشن صاف صاف تحریر کرنا چاہیئے۔

پتہ

**ہندوستانی کمپنی ملیح آباد لکھنؤ**

# کسان

## (اُس کے افلاس کے وجوہ اور اُن کا علاج)

(مصنفہٗ)

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی

مترجمہٗ جناب محمود علی خاں صاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر رفتہ رفتہ کس طرح اس کو خوشحالی سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت کتنی دردناک ہے کہ اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کا اصل سبب کیا ہے اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہے؟

ان سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے۔ کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے۔ کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہے۔ لہٰذا جو لوگ موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں اُنھیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ یقین ہے کہ اس موضوع پر اُردو میں اس سے بہتر کتاب اجتک پیش نہیں کی گئی ہے۔ کتابت۔ طباعت۔ کاغذ اعلیٰ۔ ضروری ہے کہ ملک کا ہر ہی خواہ اسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن دوبارہ پھر جائیں۔ کتاب پریس میں جا چکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گی۔

فوراً فرمائش بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو محصول ڈاک معاف

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں　　　　رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

# زمانہ

مرتبہ، دیا نراین نگم، بی۔ اے

جلد ۶۵ | نومبر ۱۹۳۵ء | نمبر ۵

## فہرست مضامین



زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

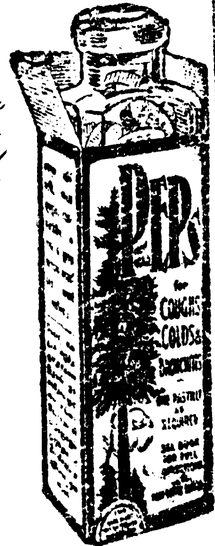
چندہ سالانہ ممالک غیر سے عہ ششماہی صہ۔ ہندستان کے لئے ششماہی تین روپیہ

قیمت فی پرچہ ۴

# اگر آپ کے
# حلق میں جلن اور آماس ہے
تو
## پیپس کی ٹکیاں استعمال کیجئے



حلق ہی ایسا مقام ہے
جہاں تمام متعدی امراض کے جراثیم سب سے پہلے اپنا گھر بنالیتے ہیں۔ اس لئے اگر آپکو حلق میں ذراسی بھی جلن، سوزش یا خشکی یا کھانا نگلنے میں خفیف سی بھی تکلیف ہو تو سانس کے ذریعہ فائدہ پہونچانیوالی پیپس کی ٹکیاں چوسئے، منہ میں گھلنے کے ساتھ ہی پیپس سے خوشگوار جراثیم کش دھواں نکلتا ہے جو سانس سے ملکر ان تمام جراثیم کو نیست و نابود کردیتا ہے جو حلق اور سانس لینے والی نلیوں میں پیدا ہوجاتے ہیں۔




پیپس کے استعمال سے عجیب غریب آرام ملتا ہے اسکا ذائقہ بہت خوشگوار ہے اور غراروں کے مقابلہ میں اس کا اثر بہت دیر تک رہتا ہے۔ ان کے بدولت درد رفع ہوجاتا ہے۔ آماس کم ہوجاتا ہے، کھانسی زکام، ٹھنڈ، برانکائٹس اچھا ہوجاتا ہے۔ سب انگریزی دوافروش اسے ایک روپیہ فی شیشی کے حساب سے بیچتے ہیں

ایجنٹس مسرز اسمتھ اسٹن اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ اسٹانی کلکتہ،

## سانس کے ذریعہ فائدہ کرنیوالی عجیب و غریب
## تریاق صفت ٹکیاں

# پیپس
PEPS

# زمانہ

جلد ۶۵ — نومبر ۱۹۳۵ء — نمبر ۵


# مشاعرے اور اُن کی اِصلاح


از سید ظہیر الدین احمد صاحب علوی، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی،


مشاعرہ کیا ہے اور اُس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب بلا تحقیق دینا دشوار ہے۔ تاہم جو کچھ مجھے تحقیق ہو سکا ہے سپرد قلم کرتا ہوں۔ یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ مشاعرے دنیا میں کب سے قائم ہیں، مگر مختلف ممالک میں مختلف اوقات پر خاص خاص مواقع پر ایسی شاعری ضرور ہوا کرتی تھی جس کو کھینچ تان کر مشاعرے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عرب میں ایسے مشاعرے جیسا کہ فی زمانہ ہندوستان میں رائج ہیں کبھی نہیں ہوئے۔ عرب کا شاعر جذبات سے متاثر ہوکر اپنے خیالات کی ترجمانی بالکل آزادانہ طور پر کرتا ہے اور مقابلے کی نظمیں صرف میلوں کے موقع پر کسی پبلک مقام پر یا حج کے زمانہ میں خانۂ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کردی جاتی تھیں۔ انھیں نظموں میں سے سات قصیدے جو سبعہ معلقہ" کے نام سے مشہور ہیں آج تک محفوظ ہیں، لیکن ان میں ردیف وقوافی کی وہ پابندیاں جو مشاعروں میں ہوتی ہیں نہیں پائی جاتیں۔ ہر شاعر اپنی منتخب کردہ بحر، ردیف وقافیہ میں قصیدے یا نظم کہتا تھا اور وہ مجمع عام میں سُنائی جاتیں یا کسی ایسی جگہ آویزاں کردی جاتیں جہاں اُنھیں ہر شخص دیکھ سکے۔

انگلستان میں بھی مشاعروں کا رواج کسی زمانے میں نہیں تھا۔ سترھویں صدی میں جو قہوہ خانوں کے کھلنے کا زمانہ کہا جاتا ہے وہاں کے شعرا اپنا تازہ کلام ان قہوہ خانوں میں بیٹھکر

یک دوسرے کو سنایا کرتے تھے۔ لیکن ان کے کلام میں ردیف اور قافیہ کی پابندی نہ کبھی تھی اور نہ اب تک ہے البتہ بعض نظموں میں ایک حد تک صرف قوافی کی پابندی پائی جاتی ہے۔

ایران میں البتہ اس قسم کی صحبتوں کا انعقاد شاعری کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوا لیکن یہ یقین کرنا کہ کس زمانے سے باقاعدہ مشاعرے شروع ہوئے مشکل ہے۔ علامہ شبلی مرحوم نے بھی اپنی کتاب "شعر العجم" میں اس مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی، اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ حافظ شیرازی کے زمانہ سے پہلے مشاعرے ایران میں قائم ہو چکے تھے، اور جن میں وہ تمام ردیف و قافیہ کی پابندیاں تھیں جو یہاں کے مشاعروں میں ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں شاہان ہنود کے دور میں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ "رامائن" اور "مہابھارت" کی مستقل کتابیں اس امر کی شاہد ہیں۔ سنسکرت میں دو کتابیں "راج ترنگنی" اور "بھوج پرابند" سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم اور راجہ بھوج کے عہد حکومت میں "کوی سمیلن" ( कवि सम्मेलन ) ہوا کرتے تھے جس کے روح رواں کالی داس۔ بھوانی اور ماگھ تھے۔ وکرماجیت کے زمانہ میں بڑے بڑے کوی دربار سے تعلق رکھتے تھے اور اکثر مقابلے کی نظمیں لکھکر دربار میں پیش کرتے اور انعام پاتے تھے۔

ہندی زبان میں مشاعروں کا رواج اکبر کے زمانہ سے پایا جاتا ہے، تلسی داس، عبد الرحیم خانخاناں اور ہتی رام جو اس دربار میں حاضر باش رہتے تھے اکثر ایک دوسرے کو "سمسیا" لکھکر بھیجتے اور سب کے سب اس پر طبع آزمائی کر کے دربار میں سنایا کرتے تھے۔ تلسی داس کی کبتا "رامائن" بھی بعض مقام پر سمسیا پورتی معلوم ہوتی ہے۔ پرتھوی راج کے دربار میں "چندر ورداۓ" اور شیواجی کے دربار میں "بھوشن" بڑے نامی کوی گذرے ہیں۔ اور اُسی زمانے سے کوی سمیلن کا رواج ہے۔ لیکن اور مشاعروں سے مختلف کیونکہ اسکی "سمسیا" بجاۓ ایک مکمل مصرع کے صرف ایک یا دو الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے اور اس لئے ہندی شاعری کو نسبتاً قید ردیف و قوافی سے آزادی حاصل ہے۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس قسم کی مجالس کا انعقاد ہوا کرتا اور مدح سلاطین میں قصائد پڑھے جاتے تھے۔ اور چونکہ اس کے صلہ میں کثیر انعامات، عطیات شعرا کو دربار سے عطا ہوتے تھے لہذا یہ رسم سالگرہ، تاجپوشی، شادی وغیرہ کے موقعوں پر سرگرمی کے ساتھ ادا کی جاتی تھی، لیکن ایسی مجالس کو بزم مشاعرہ سے تعبیر کرنا زیادتی ہے۔ کیونکہ یہ مجالس صرف قصیدہ خوانی تک محدود تھیں اور یہ قصائد بھی ایک ہی بحر اور ردیف و قوافی کی پابندیوں کے ساتھ نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ ہر شاعر اپنا قصیدہ اپنی مجوزہ بحر و ردیف و قوافی میں پیش کرتا۔ موجودہ طرز کے مشاعروں کی ابتدا کا پتہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ

سے چلتا ہے۔ اُن کے زمانے میں کسی اُستاد کا ایک مصرعہ بطور طرح تجویز کر دیا جاتا تھا اور اُس پر طبع آزمائی ہوا کرتی تھی، خصوصًا جہانگیر کے زمانے میں اس قسم کے مشاعرے اکثر ہوئے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ مشاعروں نے بھی ترقی کی؛ اور رفتہ رفتہ یہ بزم سلاطین اور امراء کے دائرے سے نکل کر خواص وعوام تک پہونچ گئی اور اُردو زبان میں بھی مشاعرے ہونے لگے۔ چنانچہ اُردوئے معلیٰ دہلی کے مشاعروں کا تذکرہ "آبحیات" میں واضح طور سے درج ہے۔ اور مصحفی۔ انشا۔ انیس۔ دبیر۔ سودا میر۔ ذوق اور غالب نے ان مشاعروں میں اپنا زور طبیعت دکھانے کے ساتھ ساتھ مذاق شاعری کی کافی داد دی۔ اُس زمانے کے مشاعرے واقعی مشاعرے ہوتے تھے کیونکہ ادبی عنصر کے سوا اور کسی سے کچھ تعلق نہ رہتا تھا۔ اور اُس زمانے کے شاعرانہ مقابلے قابلیت، ادبیت، ترقی زبان اور انسان گری کا حکم رکھتے تھے۔ لیکن اب ہندوستان میں اور علی الخصوص ممالک متحدہ میں اکثر مشاعرے کسی رسم مثلاً شادی، ختنہ، جنیؤ، عقیقہ، الوداعی پارٹی وغیرہ سے منسلک کر دیئے جاتے ہیں جس سے زیادہ تفنن طبع مقصود ہوتا ہے، اور اس بنا پر زمانۂ حال کے مشاعرے اپنی ادبی حیثیت قریب قریب کھو بیٹھے ہیں جو یک گونہ تنزلی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اب غزلخوانی میں ترنم سے بھی کام لیا جاتا ہے اور فن موسیقی کے جملہ مدارج اُتار، چڑھاؤ، تال سُر ختم کر دیے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک نہایت معمولی اور پھیکی غزل محض ترنم میں الاپ کے ساتھ گائے جانے کی وجہ سے چمک جاتی ہے، اور ایک عمدہ غزل جو سیدھی سادی طور پر پڑھی گئی داد سے محروم رہ جاتی ہے۔ بلکہ ایک ہی دو شعر پڑھنے کے بعد سامعین کی طرف سے "مقطع فرمائیے" کی آواز بلند ہونے لگتی ہے، اور بعض اوقات یہ بات دلشکنی اور بدمزگی کا باعث ہو جاتی ہے۔ میری رائے ناقص میں موجودہ زمانہ میں مشاعرے ترقی نہیں کر رہے ہیں، اور جو نمائشی ترقی ہے بھی وہ ترقی معکوس ہے۔ جس سے اُردو ادب کو کوئی نفع نہیں۔ بلکہ اُردو مشاعرے اکثر اوقات ناخوشگوار تعلقات اور تلخ مراسم کا باعث ہو جاتے ہیں۔ خصوصًا پڑھنے میں تقدیم و تاخیر، داد دینا، خاطرداری وغیرہ ایسے مراحل ہیں جن میں اکثر اوقات نہایت بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور مشاعرہ بجائے ادبی مجلس کے اچھا خاصہ رزم گاہ بن جاتا ہے ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے چند اصلاحات میرے ذہن میں آتی ہیں جن کو پیش کرتا ہوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اگر وہ مقبول ہوئیں اور اُن پر عمل کیا گیا تو یقینًا مشاعرے پھر اپنی اصلی وقعت حاصل کر لیں گے اور اُردو ادب کے لئے مفید ہونگے۔

(۱) مشاعرے کسی تقریب کے ساتھ وابستہ نہ کئے جائیں۔

(۲) مشاعروں میں شعرا کو ردیف و قافیہ کی پابندیوں میں نہ جکڑا جائے، اگر یکسانیت کا خیال ہو تو صرف ایک بحر تجویز کردی جائے، اور صرف ردیف یا صرف قافیہ کی پابندی لازم کردی جائے، کیونکہ ان قیود کے باعث غزل گوئی کا میدان اس قدر تنگ ہوجاتا ہے کہ شعرا کو اکثر اپنی امنگ قافیہ کے نہ ملنے یا ردیف کی کھپت نہ ہونے کے باعث روکنی پڑتی ہے جو ایک صریح ظلم ہے۔

(۳) شعرا کو اس امر کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ فرسودہ مضامین اور ضرورت سے زیادہ پامال خیالات سے حتی الامکان گریز کریں، ورنہ بجز "لکیر کے فقیر" بنے رہنے کے کلام میں جدّت نہ آئیگی اور ترقی سے محروم رہیگا، کیونکہ اساتذۂ پیشیں نے ہمارے لئے غزلگوئی کا میدان بیحد تنگ کردیا ہے۔

(۴) اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ شعرا جنھیں فن شعر گوئی کے ساتھ ساتھ زود گوئی بھی حاصل ہے یا جو منصب استادی کے متمنی ہیں اکثر دو دوسو اشعار لکھکر گیارہ گیارہ شعر کی غزلیں اپنے نمایشی شاگردوں کو تقسیم کردیتے ہیں، اور وہ شاگرد اُن اشعار کو درست طریقہ پر پڑھ بھی نہیں سکتے، یہ ایک ایسا نامناسب طریقہ ہے جو شاعر کی شخصیت پر بُرا اثر ڈالتا ہے اور مشاعرے میں مفت طوالت ہوجاتی ہے، نیز اپنے نمایشی تلامذہ و احباب کی ایک فوج ساتھ لیجانے سے میزبان کو خواہ مخواہ دقّت پیش آتی ہے۔

(۵) تحسین و آفریں کا ایسا مسئلہ ہے جو فی زمانہ قابل شکایت ہے اور بعض اوقات "تحسین ناشناس" یا "سکوت سخن شناس" نہایت گراں گزرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر داد کا خواہاں ہوتا ہے اور اسی لئے دور و دراز کے سفر کی صعوبت اختیار کرکے مشاعرہ میں شرکت کرتا ہے اور اس لئے قابل داد اشعار پر ہٹ دھرمی سے سکوت اختیار کرنا ظلم ہے۔ لیکن ہر شعر پر داد کا متمنی ہونا خواہ وہ شعر اس قابل نہ ہو بڑی زیادتی ہے، اور غالباً اسی جذبہ کے ماتحت وہ شعرا یا منصب استادی کے متمنی شعرا جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے اپنے نمایشی تلامذہ و احباب کی فوج لیکر مشاعرے میں آتے ہیں کہ اگر مشاعرے میں ہر طرف خاموشی بھی رہی تو کم از کم اُن کا جتھا تو واہ وا کے شور اور سبحان اللہ کے نعروں سے باز نہ رہیگا لیکن یہ حقیقی داد نہیں ہے، اور نہ ایسی داد سے شاعر کی شان میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، یہ طرز عمل قطعی ترک کردینا چاہئے۔

(۶) مشاعروں میں سب سے اہم مسئلہ ترتیب شعرا کا ہے اور یہ بھی بیشتر اوقات بدمزگی اور ناخوشگوار تعلقات کا باعث ہوجاتا ہے۔ مقامی طور پر تو ترتیب درست ہو بھی جاتی ہے لیکن شعرا بیرونجات میں تقدیم و تاخیر کا مسئلہ ذرا مشکل ہوتا ہے۔ کوئی میزبان غیب داں نہیں ہوتا، اس لئے اگر کہیں عدم واقفیت سے نامناسب ترتیب عمل میں آجائے تو اس پر برہمی فضول ہے۔ ہر شاعر اپنے کلام کے اعتبار سے ایک پایہ رکھتا ہے جو تقدیم و تاخیر سے کم و بیش نہیں ہوسکتا۔ نیز یہ کہ "مہمان را با فضولی چہ کار" کے مسئلہ پر عمل کرتے ہوئے

میزبان یا بزم مشاعرہ کی کمیٹی انتظامیہ کے قائم کردہ ترتیب کو بخوشی وخاطر منظور کرنا چاہیئے۔ ایک اور تجویز بھی اس مسئلہ کو حل کرنیکی یہ ہوسکتی ہو کہ کوئی خاص ترتیب قائم ہی نہ کی جائے بلکہ بلالحاظ کہنہ مشقی یا نو مشقی شعرا پڑھنے کے لئے بُلا لئے جائیں۔ اس سے دو فائدے ہونگے۔ ایک تو یہ کہ تقدیم و تاخیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ سامعین کو بھی کہنہ مشق شعرا اور اساتذہ کا کلام سننے میں تمام رات کا انتظار جو اکثر گراں گذرتا ہے' نہ کرنا پڑیگا۔ اور مشاعرہ میں شروع سے آخر تک یکساں دلچسپی قائم رہیگی۔

(۷) مشاعروں میں اکثر نشست کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا، اگر منتظمین کرنا بھی چاہتے ہیں تو سامعین اُن کی ایک بھی نہیں چلنے دیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب پڑھنے کے لئے شاعر کا نام پکارا جاتا ہے تو شاعر صاحب صف پایئں سے اُٹھے اور کشمکش ہونے کے باعث سامعین کو روندتے پھلانگتے، پیروں سے ٹھوکریں مارتے ایک عرصہ میں جناب صدر کے قریب جہاں بیٹھکر غزلخواں ہوناہے پہونچتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد پھر وہی مسافت اسی طرح طے کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے مشاعروں میں شعرا اور سامعین کے لئے الگ الگ جگہ مخصوص ہونا چاہیئے۔

(۸) مشاعرہ کے اوقات بھی قابل غور ہیں، نہ معلوم کیوں شعرا کو عموماً وقت کا کوئی لحاظ نہیں رہتا جس کی وجہ سے ہمیشہ مشاعرہ اپنے وقت معینہ سے دو تین گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے، اور مقامی شعرا کا ایسا تانتا بندھتا ہے کہ شب کے نصف حصہ تک انھیں سے چھٹکارا نہیں ملتا، اور جب شعرائے بیرونجات کی باری آتی ہے تو آدھا مجمع چھنٹ چکتا ہے اور اس وقت نیند کے غلبہ جمائیوں کی آمد کی وجہ سے ایسی بے کیفی ہوجاتی ہے کہ کچھ سننے سنانے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن "قہر درویش برجان درویش" مجبوراً بیٹھنا پڑتا ہے یہاں تک کہ صبح ہوجاتی ہے۔ آپ خیال فرمایئے کہ آٹھ بجے شب سے صبح تک غزلخوانی کا سلسلہ لامتناہی کتنا ہی پُرکیف کیوں نہ ہو پھر بھی اس قدر طوالت کی وجہ سے بے کیف ہوجاتا ہے اور بجز برداشتہ خاطری اور عدم توجہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا اگر ایک ہی نشست کے بجائے مشاعرے چھوٹی چھوٹی چند نشستوں پر منقسم ہوجایئں تو طبیعت پر گراں نہ ہوں۔ بزم کو دلچسپ بنانے کا ایک اور طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک روز قبل مقامی شعرا کی صحبت منعقد کر لیجایا کرے اور اُن کی چیدہ چیدہ غزلیات دوسرے روز کے پڑھنے کے لئے انتخاب کر لی جایا کریں اور ان غزلیات کے بعد ہی شعراء بیرونجات کی غزلخوانی کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

(۹) مشاعرے کا مقصد صرف چند گھنٹوں کی صحبت، غزلخوانی اور واہ وا ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہر مشاعرہ کی غزلیات گلدستہ کی شکل میں یا اخبارات میں ضرور شائع ہونا چاہیئے، ورنہ اکثر یہ جواہر پارے ضائع

ہوجاتے ہیں حقیقی معنوں میں مشاعرے صرف ایسی حالت میں کوئی ادبی خدمت انجام دے سکتے ہیں جب ان کا انتخاب کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ اور یہ انتخاب اگر بقید قوافی ہو تو اور بھی بہتر ہے کیونکہ ایسی صورت میں ناظرین کو تقابل کا اچھا موقع ملیگا اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ ایک ہی قافیہ کتنے طور پر باندھا جا سکتا ہے۔ یہ گلدستہ صرف ایک غزلیات کا مجموعہ ہی نہ ہوگا بلکہ شائقین شاعری اور مبتدیوں کے لئے ایک "شاہکار" ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ شعرا اپنی غزلیات مشاعرہ میں پڑھنے کے بعد فوراً ہی صدر کے حوالے کردیا کریں

ان اصلاحات کے بعد یقیناً مشاعرے پھر اپنی اصلی عظمت حاصل کرلیں گے اور حقیقی معنوں میں مفید ادب ہوجائیں گے۔

# جذباتِ بیتاب

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے، ایل ایل۔بی)

دل میں کیفیتِ شباب نہیں — یعنی ساغر میں اب شراب نہیں
سچ ہے یکتا ہے لاجواب ہے تو — دو جہاں میں ترا جواب نہیں
بخشئے میرے گناہ بے گنتی — تیری رحمت کا کچھ حساب نہیں
کردیا یاس نے سکوں پیدا — اب وہ اگلا سا اضطراب نہیں
عقل پر پڑگیا ہے پردہ سا — ورنہ حائل کوئی حجاب نہیں
کچھ تو باعث ہے خودنمائی کا — بےسبب حسن بےنقاب نہیں
یہ نمائش ہے اِک فریبِ نظر — بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
فکرِ کارِ ثواب سے توبہ — اِس سے بڑھکر کوئی عذاب نہیں
ہے کسی کے شکستِ دل کی صدا — نیشِ زن نالۂ رباب نہیں
چار دن اور رنج پیری ہے — تیری پیری غمِ شباب نہیں
محویت ضبطِ غم میں رہتی ہے — بیخودی حاصلِ شراب نہیں
موت بیتاب اس کی بہتر ہے — زندگی جس کی کامیاب نہیں

# جذباتِ جوش

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

افسوس کوئی واقفِ منزل نہ ہوا — ناقص ہی رہا ہمیشہ، کامل نہ ہوا
نادان پیدا ہوا تھا نادان ہی مرا — انساں کو کبھی بلوغ حاصل نہ ہوا

---

سرشار ہوں، سرشار ہے دنیا مرے آگے — کونین ہے اک لرزشِ صہبا مرے آگے
پیمانے پہ جس وقت جھکاتا ہوں صراحی — جھکتا ہے سرِ عالمِ بالا مرے آگے

---

جا رہا ہوں حسن سے پھر فیض اُٹھانے کیلئے — زندگی کو خوابِ غفلت سے جگانے کیلئے
جس کا ہر تنکا ہو خود اپنی جگہ اک صاعقہ — برق کو زحمت نہ دو اس آشیانے کیلئے
ہونٹ جب کانپے تو آنکھیں ڈبڈبا آئیں مری — داستاں کا آخری ٹکڑا سُنانے کیلئے
لیجئے بیٹھے بٹھلائے پھر اُمیدیں جاگ اُٹھیں — آپ سے کس نے کہا تھا مُسکرانے کیلئے

---

وہ صبر دے کہ نہ دے جس نے بے قرار کیا — بس اب تمھیں پہ چلو ہم نے انحصار کیا
مآل ہم نے جو دیکھا سکونِ جنبش کا — تو کچھ سمجھ کے تڑپنا ہی اختیار کیا
مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیئے — کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا
ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا — جب اُس نے وعدہ کیا ہم نے اعتبار کیا

---

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر — سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو کہ دل ہو آئینہ — ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

---

بیگانۂ ابتدا نہیں ہوں شاید — ناواقفِ انتہا نہیں ہوں شاید
ہو طولِ حیات کی تمنا مجھکو — اتنا تو میں بے حیا نہیں ہوں شاید

# مشرقی و مغربی تصوّف اور سنت مت[1]

(۲)

(از پروفیسر سنت پرشاد مہوش ایم۔اے)

بائیبل میں بھی ہم کو روحانی ساز و آواز کی شہادت ملتی ہے۔ انکشافات یوحنا کے باب ۴ میں مرقوم ہے:۔

"After these things I saw and behold a door opened in heaven and the first voice which I heard, a voice as of a trumpet speaking with me, one saying come up, hither.....

آواز جرس کے متعلق ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، کچھ حوالہ جات ذیل میں اور پیش کئے جاتے ہیں

از دیوان شمس تبریز:۔

چوں طبل رحیل آمد آواز جرس ہا ما رخت تماشات بر افلاک کشیدیم

کبیر:۔ آنکھ کان منہ بند کراؤ، اناہد جھنگا شبد سنائی۔ دونوں تل اک تار ملائی، تب دیکھو گلزارا ہے، چندر سور کے دھر لائی

سکھمن سیتی دھیان لگاؤ، گھنٹہ سنکھ سنو دھن سوئی، سہس کنول دل جگ مگ ہوئی

کبیر۔ ترجمہ از ٹیگور:۔

There adoration never ceases, there the Lord of the Universe Sitteth on his throne, There the sound of the unseen bells are heard.

شغل آواز میں کامیابی حاصل کر کے معراج روحانی کے ذریعہ بالآخر واصل بہ حق ہو جانا تصوّف اور سنت مت کے عقائد کے بموجب بلا مرد مرشد ناممکن ہے، مولانا روم فرماتے ہیں:۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست بس پر آفت و خوف و خطر

گر نباشد سایۂ پیر اے فضول پس ترا سرگشتہ دارد بانگِ غول

کبیر:۔ وستو کہیں ڈھونڈھے کہیں کیسے آوے ہاتھ کہیں کبیر تب پایئے جب بھیدی لیجئے ساتھ

رادھا سوامی مذہب:۔ پرتم سیڑھی ہے گورو بھگتی بن گورو بھگتی کاج نہ رتی

[1] اس مضمون کا پہلا حصہ زمانہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

سندھ کے مشہور صوفی نقیر شاہ عبداللطیف نے ایک جگہ لکھا ہے:۔ بِلَا شَیْخٍ مَن یَّمْشِیْ فِی الطَّرِیْق
لِمَنْ یَّمْشِیْ فِی الْبَحْرِ بِلَا سفینۃ۔

از دیوان شمس تبریز:۔

بے دولت مخدومی شمس الحق تبریز نے ماہ تواں دید و نے بحر تواں شد

"مرشد یا ست گورو سے مراد کسی ایسے شخص سے نہیں جو روحانی قوتوں و منزلوں کے راز سے محض علمی واقفیت رکھتا ہو، بلکہ اُس کامل پُرش سے ہے جس نے بذریعہ عمل اپنی روحانی قوتوں کو کلیتہً بیدار کر کے سچے مالک سے وصل حاصل کیا ہو یا جس کو جنم سے پرم گتی حاصل ہے"۔ اقتباس از بیھار تھو پرکاش متعلقہ رادھاسوامی مذہب

سنت مت اور تصوف کے عقائد کے بموجب گذشتہ پیغمبروں اور اوتاروں سے مدد حاصل کرنا ناممکن ہے، اس کے لئے زندہ مرشد کی ضرورت ہے، مولانا روم کا کلام ملاحظہ ہو:۔

از تبریز شمس دیں آب حیات میدہد تا زدماغ جان و دل باز دہند ایں سبس
آب حیات از سلف خود نرسد بہ ہر خلف زیں سبب است مختفی آب حیات در غلس

مرشد پرستی اِن عقائد کے بموجب خدا پرستی ہے، کیونکہ وہ مرد خدا جو واصل بحق ہے اُس میں اور خدا میں صرف اسی قدر فرق متصور ہو سکتا ہے جیسا سمندر اور اس سمندر کے Backwater میں ہوتا ہے Backwater سمندر ہی کا Projection ہے اور دونوں کا جوہر ایک اور دونوں میں براہ راست تعلق ہے۔ مولانا روم:۔

مردان خدا خدا نہ باشند لیکن ز خدا جدا نہ باشند

اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:۔

"رادھا سوامی مت میں ستگورو پدوی اس مہان آتما کو دی جاتی ہے جس کا انتر[1] میں سچے کل مالک کے ساتھ براہ راست تعلق ہو اور جس کے اندر مثل اُن دریاؤں کے جو ان دریاؤں سے ملے ہوتے ہیں جو کہ بھاٹا آنے پر سمندر کا پانی آتا جاتا ہے سچے کل مالک کی روحانی دھار مسلسل آتی جاتی ہو"

مولانا روم اپنے مرشد شمس تبریز کی شان میں فرماتے ہیں:۔

شمس تبریزی کہ ہست اصل وجود من ندیدم در جہاں ہمتائے او
شمس تبریزی توئی مقصود کل اے شدہ ترک فلک ہندوئے تو
شمس تبریزی کہ نور مطلق است آفتاب است و ز انوار خداست

---

[1] فرق

اے خواجۂ تبریزی در آئینۂ رویت　　　　گر غیر خدا بینم باشم تبر از کافر

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مرشد وہ ہے جس نے واصل بحق ہونے کا درجہ اپنی روحانی قوتوں کو بیدار کر کے حاصل کیا ہو یا جس کو پیدائش سے یہ درجہ حاصل ہو یعنی وہ اس عالم فانی میں برضائے ایزدی فیض عام کی غرض سے ظہور پذیر ہوا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس تبریز انھیں ہستیوں میں تھے جن کو یہ درجہ پیدائش سے حاصل تھا اور جو اس عالمِ فانی میں فیض عام کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ کلام ذیل ملاحظہ ہو، از شمس تبریز

من شمس تبریزی نیم من نور پاکم اے پسر　　　　زنہار اگر بینی مرا با کس مگو من دیدہ ام

راقم الحروف کا خیال ہے کہ دیوان شمس تبریز کا کلام تمام مولانا روم ہی کا نہیں، اس میں کچھ کلام شمس تبریز کا بھی ہے۔ طرز خطاب صاف پتہ دیتا ہے کہ شعر مندرجۂ بالا شمس تبریز کا ہے نہ کہ مولانا روم کا:

صوفیوں کو اس بنا پر کہ وہ مرشد کو خدا کے برابر سمجھتے ہیں کافر ٹھہرایا گیا ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ خدا انسانی جامے میں کیونکر محدود ہو سکتا ہے اور کوئی ہستی خدا کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے مگر تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث بھی تصوف کے ان عقائد کی موید ہے۔

أَنَا احمد بلا میم مَن رانی فقد رای الحق

(ترجمہ) میں احمد بلا میم ہوں (یعنی احد بمعنی خدا) جس نے مجھکو دیکھا خدا کو دیکھا

أَنَا عَربٌ بلا عینٍ　　　　(ترجمہ) میں عرب ہو بلا "ع" کے یعنی رب بمعنی خدا

لا فرق بینی وبَین ربّی　　　　(ترجمہ) مجھ میں اور میرے خدا میں کوئی فرق نہیں

بائبل میں حضرت مسیح نے کہا ہے" میں اور میرا باپ ایک ہیں جس نے مجھے دیکھا باپ کو دیکھا راہِ حق اور زندگی میں ہوں، کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا، میرا یقین کرو کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے"۔ مضمون کے پہلے حصہ میں برنرڈ آف کلیر اکس کا نظریہ بیان ہو چکا ہے[1] ملاحظہ ہو کبیر صاحب فرماتے ہیں:۔

سادھ ملے صاحب ملے انتر رہی نہ ریکھ　　　　منسا باسا کرمنا سادھو صاحب ایک

منصور کا قول ہے:۔

أَنَا مَن اَھوَیٰ وَمَن اَھویٰ اَنَا　　　　نحن دو کان ملّلنا بَدَنا
فاذا ابصرتنی ابصرته　　　　واذا ابصرته ابصرتنا

[1] برنرڈ آف کلیر واکس کہتا ہے کہ انسان خدا سے ہم آہنگ ہو کر خدا ہی ہو جاتا ہے۔

(ترجمہ: میں وہ ہوں جس کو کہ میں محبت کرتا ہوں، اور وہ جس کو میں محبت کرتا ہوں وہ میں ہوں
ہم دو روحیں ہیں جو ایک قالب میں رہتی ہیں۔ جب تو مجھے دیکھتا ہے تو تو اس کو دیکھتا ہے
اور جب تو اُس کو دیکھتا ہے تو تو دونوں کو دیکھتا ہے۔)

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

چوں خدا اندر نیاید در عیاں — نائب حق اندر ایں پیغمبراں
نے غلط گفتم کہ نائب با منوب — گر دو پنداری قبیح آید نہ خوب
نے دو باشد تا توئی صورت پرست — پیش او یک گشت کز صورت برست
چوں بصورت بنگری چشمت دو است — تو بنورش در نگر کاں یکتو است
لاجرم چوں بر یکے افتد بصر — آں یکے بینی دو ناید در نظر
نور ہر دو چشم نتواں فرق کرد — چونکہ بر نورش نظر انداخت مرد

اب ہم عشق کی اہمیت کا جو سنت مت اور تصوف میں ہے ذکر واجب سمجھتے ہیں، ہم ذکر کر آئے ہیں کہ انسان کا اصل و اولین گناہ اس کی خودی تھی اور اُسی کے زیر اثر اُسے عالم مادی میں آنا پڑا۔ از دیوان شمس تبریز:۔

نیست شو نیست از خودی کہ ترا — بتّر از ہستیت جنایت نیست

خودی سے نجات حاصل کرنے کے لئے تکمیل عشق لابدی ہے۔ Impersonal God غیر متشخص خدا سے عشق پیدا کرنا ناممکن ہے، جب تک چشم باطن سے اس کا دیدار حاصل نہ ہو جائے۔ دیدار حاصل کرنے کیلئے تکمیل عشق ضروری ہے، مگر مرشد کی پوزیشن جیسی کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے لحاظ سے مرشد برحق سے عشق کرنا خدا سے عشق کرنا ہے، اور مرشد پرستی حق پرستی ہے جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں:۔

چونکہ کردی ذات مرشد را قبول — ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

پس سنت مت اور اہل تصوف کے یہاں مرشد سے عشق بلا شرکت غیرے کرنے کی ہدایت ہے اور عشق مرشد اور عشق الٰہی میں کوئی فرق نہیں مانا جاتا۔ بلا تکمیل عشق وصل الٰہی ناممکن ہے۔

منصور: گر عشق ازل بدرقۂ راہ بنودے — جانم ز حریم حرم آگاہ نبودے
بزن آتش لے عشق در ما و من — کہ ما جملہ لائیم و الّا توئی

خواجہ معین الدین چشتی:۔

بگیر مصقلۂ عشق وز زنگ تن مزدای　　بہ بیں در آئینۂ جاں جمال جاناں را

دل چو آئینہ حق آمد و صیقل غمِ عشق　　اے خوش آں دل کہ مے عشق غبارش نہ درد

**بو علی قلندر:۔**

نفی گرداں از دلِ خود ماسوا　　تا نگنجد در دلت غیر از خدا

رنگِ دل از صیقلِ لا پاک کن　　سینہ با تیغِ محبت چاک کن

عشق کے متعلق ایک رمز اور قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ سنت مت اور تصوف کا عقیدہ ہے کہ انسان کی طاقت نہیں کہ وہ مرشد برحق یا خدا سے عشق کر سکے۔ عشق ایک عطیہ ہے جو مرشد برحق کی جانب سے مستحق سالکین کو عطا ہوتا ہے:۔

منصور ز جانبازیِ خود شوق نکردے　　گر جذبِ نہانیش ز درگاہ نبودے

مرشد برحق ہی اپنا عشق اور اپنی پہچان سالک کو بخشتے ہیں:۔ مولانا روم:

سلہ عاشقاں را جستجو از خویش نیست　　در جہاں جوئندہ جز او بیش نیست

---

تا عکسِ آں طلب بنود کے طلب کنم　　پس جست و جوئے ماہمہ از جستجوئے تو

---

جستجوئے در دلم انداختی　　تا ز جست و جو روم در جوئے تو

بو علی قلندر: گر نہ گردے طالباں را دستگیر　　طالباں ہرگز نہ گیرند دستِ پیر

چونکہ عشق کی تکمیل اپنے قابو میں نہیں اس لئے سالک اس عطیہ کے لئے دست بدعا ہوتا ہے:۔

رادھا سوامی مت:۔ پریم دات موہتی دیجئے　　میرے ستگور داتا ہو

از دیوان شمس تبریز:۔ من نجستم تا مرا انگیختی　　تا چہ گویم و زخم چوگانِ تو

ورنہ ایں خاک از کجا عشق از کجا　　گر نبودے جذبۂ از جانِ تو

مثنوی مولانا روم میں حضرت داؤد کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے فرمایا:۔

من چو خورشیدم درون نور غرق　　من ندانم کرد خویش از نور فرق

رفتنم سوے نماز و آں خلا　　بہر تعلیم ست رہ مر خلق را

مثنوی میں ایک جگہ اور فرمایا ہے:۔

---

سلہ مرشد کی پوزیشن مبنیتر واضح کی جا چکی ہے چند اقتباسات اور ملاحظہ ہوں۔

اولیا اطفالِ حق اند اے پسر    غائبی و حاضری بس باخبر
پشت دار و جملہ عصمتہائے من    گوئیا ہستند خود اجزائے من

مثنوی کے دفتر ششم میں ایک مقام پر لکھا ہے:-

خواجہ گفت اے یارِ مرد بانمک    آنچہ می گفتی شنیدم یک بیک
لیک با سنخ داد نم فرماں نبود    بے اشارت لب نیارستم کشود
ما چو واقف گشتہ ایم از چوں و چند    مُہر بر لبہائے ما بنہادہ اند
تا نگردد راز ہائے غیب فاش    تا نگردد منہدم نظم معاش
غرق دریائیم گرچہ قطرہ ایم    جلگی شمسیم گرچہ ذرہ ایم

مثنوی مولانا روم کے دفتر اول میں مذکور ہے:-

چوں شدی من کان للہ از ولہ    حق ترا باشد کہ کان اللہ لہ
گہ توئی گویم ترا گاہے منم    ہرچہ گویم آفتاب روشنم
ہر کجا تابم ز مشکات دمے    حل شد آنجا مشکلات عالمے
ہر کجا تاریکی آمد ناسزا    از فروغ ما شود شمس الضحےٰ
آب خواہ از جو بجو خواہ از سبو    کایں سبو را ہم مدد باشد زجو
نور خواہ از مہ طلب خواہی زخور    نورِ مہ از آفتاب است اے پسر

ہم مرشد کی اہمیت بیان کر چکے ہیں، اب یہ دکھلانا باقی ہے کہ سالک کو مرشد برحق سے کس قسم کی امداد حاصل ہوتی ہے۔ رادھاسوامی مذہب کی ایک کتاب مقدس کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ایک رسم جو کہ مرشد برحق کی آنکھوں کی طرف بغور دیکھنا ہے جبکہ عشق الٰہی یعنی پریم اور بھگتی کے نغمے یا وہ نغمے جن میں روحانی تجربات یا طبقات بالا میں معراج روح کا ذکر ہوتا ہے گائے جاتے ہیں رسم آرتی کہلاتی ہے اور روح سالک کے معراج اور یکسوئی کے لئے نہایت مؤثر تصور کیجاتی ہے۔"

(ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱۷ ڈسکورسیز آن رادھاسوامی فیتھ)

مثنوی مولانا روم میں دفتر اول میں ایک باب بہ سرخی "نشاندن بادشاہاں صوفیاں را پیش روے خود تا چشم شاں روشن شود۔" درج ہے۔ اہل تصوف کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ مرشد برحق کی نورانی آنکھوں کی مدد سے شغل روحانی کیا جائے۔ تو اپنے اندر روحانیت پیدا کیجا سکتی ہے، اور چشم باطن روشن کیجا سکتی ہے۔ تلسی داس[1] جو ایک فقیر گزرے ہیں فرماتے ہیں:-

[1] رامائن کے مشہور مصنف نہیں بلکہ ایک اور درویش کامل۔

"تینن نینوں کو روڈ گر پیا کی جھانکو رے میرے پیارے جھانکو"

کبیر صاحب فرماتے ہیں:- "مرشد نینوں بیچ بنی ہے"

رادھا سوامی مذہب کی ایک کتاب مقدس میں درج ہے:-

مرشد کے بیچ آنکھ سے ہے راستہ چلا اس آنکھ میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

مولانا روم فرماتے ہیں:-

شمس تبریزت کشاید راہ چشم چوں بہ بندی ایں دہان وآں دہاں

اس سلسلہ میں اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:-

"باہری نشان کامل پرشوں کے خاصکر مستک پر اور آنکھوں میں نظر آئی دیتے ہیں اور ان کا درشن کرنے پر بھگت جنوں کے اندر سرت کا سمٹاؤ اور معراج یعنی چڑھائی نمایاں طور سے ہوتی ہے۔"

(از امرت بچن دفعہ ۳۵۔ صفحہ ۵۰)

مولانا روم بھی یہی فرماتے ہیں:-

فقر را از چشم وز سیمائے او دید ہر چشمے کہ دارد نور ہو

از دیوان شمس تبریز: سینۂ کز زخم تیرش خستہ شد در جبینش صد نشانست اے پسر

مدد مرشد کے سلسلے میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ سنت مت اور تصوف کے عقائد کے بموجب مرشد برحق اپنے سالکین کو اپنی روحانی شکل کا دیدار باطن میں دکھلاکر روحانی معراج میں مدد دیتے ہیں۔

اب یہاں پر سماع کا بھی کچھ ذکر ضروری ہے۔ صوفیوں کا دستور ہے کہ مرشد برحق کے حضور میں بیٹھکر وجد انگیز مناجات اور عارفانہ کلام اپنے پیر کا پڑھتے تھے اور اسی صحبت میں پیر مرشد سالکین کو مذہبی ہدایتوں اور رموز سے مستفید فرماتے ہیں۔ ایسی صحبت کو صوفیوں کی اصطلاح میں مجلس سماع کہتے ہیں۔ سنت مت میں ایسی صحبت کو ست سنگ کہتے ہیں۔ اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:-

"ستگورو کی صدارت میں جس ریت سے اپاسنا یعنی ست سنگ کیا جاتا ہے...... سب سے اول منگلا چرن کا پاٹھ ہوتا ہے........ سب سے آخر میں اسی طور پر ایک بنتی کا پاٹھ کیا جاتا ہے۔ ....بیچ کے وقت منگلا چرن اور بنتی کے درمیان سنتوں کی بانی کا جو نظم و نثر دونوں میں ہے نیم سے پاٹھ ہوتا ہے......" (از امرت بچن)

مندرجہ بالا کارروائی کو باہری لوگ ست سنگ کہتے ہیں۔ مو انتری ست سنگ یا سماع باطنی

کی کیفیت مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہو جائیگی:۔

"انترمیں چیتنیہ دھار کا سنگ انتری ست سنگ کہلاتا ہے جس میں انتری شبدوں کو سننا ہوتا ہے یا انترمیں چیتنیہ ناموں کا اچارن کرنا ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ ستگورو کو اپنے ششیوں کے چیتن گھاٹوں میں رسائی حاصل رہتی ہے اس لئے ان کے بلا مانگے یا پریم اور شردھا سے ستگورو سروپ کا تصور کرنے پر ان کی دیا و مہر کی من میں یاد کرنے پر اگر ان کے دیدار (درشن) ہوں تو یہی انتری ست سنگ کہلاتا ہے"۔ (امرت بچن دفعہ ۱۵ صفحہ ۸۰)

سماع باطنی کی کیفیت دیوان شمس تبریز میں یوں مذکور ہے:۔

سماع چیست زپنہانیانِ دل پیغام — دلِ غریب بیابد زنامِ شاں آرام
سحر رسد زندا ے خروسِ روحانی — طبل رسد زحشام کشیدۂ بہرام
عصیرِ جان بخم چشم تیرمی انداخت — جو وقت خنیدبر آورد کف چو بحر عمام
حلاوتے عجبے در بدن پدید آمد — کہ از نے ولبِ مطرب شکر رسید بہ کام
زہر طرف بجہد بے قرار یعقوبے — کہ بوئے پیرہن یوسفے بیافت مشام
جمالِ صورتِ غیبی ز وصف بیرون ست — ہزار دیدۂ روشن بوام خواہ بوام

روحانی تجربہ کا اثر سالک کے جسم و دماغ پر بھی ہوتا ہے اور یہ رادھا سوامی مذہب کے کتب مقدس میں بھی جیساکہ دیوان شمس تبریز کی غزل مندرجۂ بالا میں مرقوم ہے

حلاوتے عجبے در بدن پدید آمد — کہ از نے و لبِ مطرب شکر رسید بکام

مذکور ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے کہ سنت مت اور تصوف کے عقائد کے بموجب موت کے وقت مرشد برحق اپنی روحانی شکل کا دیدار دکھا کر سالک کی مدد کرتے ہیں۔ دیوان شمس تبریز کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

عاشقانے کہ باخبر میرند — پیش معشوق چوں شکر میرند
چونکہ در عاشقی حشر کردند — نہ چوں ایں مردم حشر میرند
از فرشتہ گذشتہ اند بہ لطف — دور از ایشاں کہ چوں بشر میرند
توگماں می بری کہ شیراں نیز — چوں سگاں از بروں در میرند

---

۱ باطن۔ ۲ ساتھ۔ ۳ باطنی۔ ۴ مریدوں۔ ۵ روحانی مقامات۔

بررود شاہ سشاں با استقبال چونکہ عشاق در سفر میرند
تا و شاں در کنار لطف کشد زچنیں خوار و مختصر میرند

شعر نمبر ۵ کو مد نظر رکھتے ہوئے رادھا سوامی مذہب کی کتاب solace کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:۔

"At the time of death the Satguru always appears and takes them (devotees) up in His lap"

پہلے تین اشعار کا مفہوم اقتباسات ذیل کی روشنی میں سمجھئے۔ اقتباسات از امرت بچن :۔

"ان سادھنوں[1] کی کمائی[2] کے دوران میں وہ سب سرت[3] کے کھنچاؤ کی حالتیں جو مرتیو[4] سے پہلے اور مرتیو ہونے پر جیو پر آتی ہیں، ہوش و حواس قائم رہتے ہوئے درجہ بدرجہ ابھیاسی[5] پر گذرتی ہیں۔۔۔۔۔"

"۔۔۔۔۔ مرتیو کے درجہ تک کھنچاؤ ہو جانے پر ابھیاسی بالکل باہوش رہتا ہے۔ اس حالت میں یعنی موت کے مقام تک کھینچنے پر اور اس کے آگے چڑھنے پر ابھیاسی کا اپنے جسم سے تعلق کم و بیش اسی طور کا رہتا ہے جیسا کہ بھوت پریت کا اپنے معمول کے[6] شریر کے ساتھ رہتا ہے۔"

از دیوان شمس تبریز

جاں زبدن بروں شود باز در آید اندروں آئے بروں ز خانہ دباز در آکہ ہمچنیں

اسی سلسلے میں ان اعتقادات کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا جو موت اور تناسخ سے متعلق ہیں۔ رادھا سوامی مذہب کے اعتقاد کے بموجب انسان کی روح کا چھٹکارا جسم سے بڑی کشمکش اور زحمت سے ہوتا ہے۔ اس کشمکش کی حالت میں روح کا سامنا فرشتۂ موت (جم) سے رہتا ہے۔ جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد دھرم رائے (فرشتۂ عدل و انصاف) روح کو جوتی (روشنی کے دیوتا) کے روبرو پیش کرتا ہے۔

"برہمانڈ میں داخل ہونے پر سرت کو دور سے جیوتی کا درشن پراپت ہوتا ہے اور اگر اس کے سنگ[7] پنڈ دیش کے موہ کے بیج موجود ہیں تو وہ زیادہ عرصہ تک وہاں ٹھہرنے نہیں پاتی۔ جیوتی کے چیتنیہ[8] پرکاشس کی معرفت سنسکاری باسناؤں کے بیج فوراً زندہ ہو کر اپنا اظہار کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ رچنا کے انتظام کی رو سے یہ بیج برہمانڈ دیش میں رہنے کے لائق نہیں ہیں اس لئے ان کے زور پکڑتے ہی سرت[3] بڑے بیگ کے ساتھ نیچے کی جانب ڈھکیل دی جاتی ہے۔ ڈھکیلے جانے پر سرت اپنی سنسکاری باسنائیں اور خواہشیں لئے ہوئے من کے سمیت برہمانڈ کے پنڈ سے

---

[1] شغلوں۔ [2] عمل۔ [3] روح۔ [4] موت۔ [5] شاغل۔ [6] ساتھ [7] روحانی [8] روح۔

مین جو ہماری میدان ہے آگرتی ہے"۔ (از امرت بچن)

بعدازاں روح کو اپنے قوی ترین دنیوی خواہش کے مطابق دنیا میں پھر پیدا ہونا پڑتا ہے۔ جیوتی کے سامنے دنیوی خواہشات کی کثافت ظہور پذیر ہوجانے کے باعث روح زیادہ ٹھہر نہیں سکتی اور رادھا سوامی مذہب کے اعتقادات کے بموجب دست بدعا ہوتی ہے کہ سامنے سے دُور نہ کیجائے اور راندۂ درگاہ نہ ہو اور لطفِ دیدار سے محروم نہ کیجائے۔

مندرجہ بالا باتوں کی تائید کلام ذیل میں بھی ملتی ہے:۔

از دیوان شمس تبریز

همچو موسیٰ درمیانِ آتشِ شوقِ لقا
سوے طور از دشت رفتم مرحبا اے مرحبا

دیدم آنجا بادشاہے خسروے جاں پرورے
دلربائے ہا نزلے کانِ لطف و خوش لقا

شہر و دشت و کوہ و دریا از فروغ روے او
چوں بہشتِ جاودانی گشتہ از نور و ضیا

در فنا چوں بنگرید آں شاہِ شاہاں یک نظر
پائے ہمت را فنا بنہادہ بر فرقِ بقا

جمع گشتہ سایۂ الطاف با خورشیدِ عدل
جمعِ اضداد از نفاذِ امرِ او گشتہ روا

تا بدیدم من صفاے آں جہانِ جانِ صفت
ذرہ ہا شد در ہوائش در حیات و در نما

گفتم اے من تو بہ کردم تو بہ من رو مکن
گفت بس است پیشت می نہ بینی ہیں درا

# دل سے خطاب

(از جناب محمود اسرائیلی)

نہ کچھ فکرِ جزا تجھ کو، نہ کچھ خوفِ سزا تجھکو
یہ آخر کیا ہوا ہے اے دلِ بے مدعا تجھکو

تجھے خود اپنی ہستی پر بھی شک ہوتا ہے رہ رہ کر
نہ اقرارِ بقا تجھکو، نہ انکارِ فنا تجھکو

کہاں تک سوج غم بھرتا رہے گا سازِ ہستی میں
ملے گا گریۂ بے سود سے دنیا میں کیا تجھکو

تجھے ہر دردِ پنہاں کی نئی تاویل ملتی ہے
نظر آتی ہے ہر عشرت میں مضمر ابتلا تجھکو

نظامِ دہر میں تیری بھی فطرت کوئی فطرت ہے
نہ دولت کی خوشی تجھ کو نہ عسرت کا گلا تجھکو

تری فیاضیاں اللہ اللہ اس غریبی پر
کسی کو بخش دے عالم جو قدرت دے خدا تجھکو

تری خاطر خمیرِ فطرتِ انساں نہ بدلے گا
کہاں سے لاکے دے کوئی رفیقِ بے ریا تجھکو

خدا معلوم تو کرتا ہے کس عالم کا نظارہ
نظر آتی ہے ہر ذرہ میں تصویرِ وفا تجھکو

بدل دے اپنی فطرت کہ آئینِ کہن بدلا
زمیں بدلی فلک بدلا زمانے کا چلن بدلا

# عالمِ اضطراب

(از حضرت نکہت شاہجہاں پوری بی۔ اے (آنرز))

سمندر کی موجیں تڑپتی ہیں کیوں؟ — یہ رہ رہ کے سر کو پٹکتی ہیں کیوں؟
یہ نشتر سی دلمیں کھٹکتی ہیں کیوں؟ — غضب! بجلیاں یہ چمکتی ہیں کیوں
محبت کے جلوے وہ دکھلا رہے ہیں
تڑپتا ہے کوئی وہ تڑپا رہے ہیں

زمیں کی فضاؤں میں نا استواری — فلک پر سے رہ رہ کے یوں اشکباری
ہواؤں میں بھی سر بسر بے قراری — سکوں میں ہے نوری نہ ہے کوئی ناری
محبت کے جلوے وہ دکھلا رہے ہیں
تڑپتا ہے کوئی وہ تڑپا رہے ہیں

کبھی عالمِ سازِ بزمِ جہاں ہے — کبھی سوزِ دل اس پہ آتش فشاں ہے
کبھی باغِ عشرت کی یہ داستاں ہے — کبھی درد و غم اس پہ ماتم کناں ہے
محبت کے جلوے وہ دکھلا رہے ہیں
تڑپتا ہے کوئی وہ تڑپا رہے ہیں

وہ اُڑتا ہوا دیکھو پروانہ آیا — یہ کس نے بھلا اُس کے دل کو لبھایا
محبت کے جذبہ نے اس کو مٹایا — نہ اِس شمعِ سوزاں نے اس کو جلایا
محبت کے جلوے وہ دکھلا رہے ہیں
تڑپتا ہے کوئی وہ تڑپا رہے ہیں

نہیں عشقِ گل اور بُلبُل فسانہ — شرابِ محبت ہے اور اک زمانہ
سرِ عشق ہے اور اِک آستانہ — ذرا شوقِ دل پھر وہی اِک ترانہ
محبت کے جلوے وہ دکھلا رہے ہیں
تڑپتا ہے کوئی وہ تڑپا رہے ہیں

نہ فرہاد و شیریں کا اب امتحاں ہے نہ لیلیٰ و مجنوں کی وہ داستاں ہے
نہ برقِ تجلّی کا اب وہ سماں ہے مگر طورِ دل پھر بھی آتش فشاں ہے
محبت کے جلوے وہ دکھلا رہے ہیں
تڑپتا ہے کوئی وہ تڑپا رہے ہیں

# ماتمِ عزیز

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی ۔ بی ۔ اے)

رموزِ حسن و محبت کا آشنا تھا عزیز وفا کو ناز تھا جس پر وہ باوفا تھا عزیز
سرشت جس کی صفا تھی وہ باصفا تھا عزیز غیور و سالک منزلِ رضا تھا عزیز
عزیزِ کشورِ معنی تھا، فن میں یکتا تھا
"لسانِ ہند" کا اُس کو خطاب پھبتا تھا

خیال و نطق کی باہم وہ کارفرمائی ادا کی ندرتیں اور ندرتوں کی گہرائی
وہ چست بندشیں، اسلوب کی وہ رعنائی کمال آپ محاکات کا تھا شیدائی
ہزار حیف چمن سازِ رنگ و بُو نہ رہا
عزیزِ نکتہ سرا فخرِ لکھنؤ نہ رہا

انوکھے طرز کی وہ نغمہ خوانیاں نہ رہیں چمن کی زیب تھیں جو گل فشانیاں نہ رہیں
وہ حسن و عشق کی رنگیں کہانیاں نہ رہیں خطا معاف وہ شیوہ بیانیاں نہ رہیں
مناسبت تھی عجب طبع کو سخن کے ساتھ
کہیں جو سادگی بھی تھی تو بانکپن کے ساتھ

کھلے وہ نازک و دلکش شگوفے، گل بوٹے ستارے جن کے نظارے کو چرخ سے ٹوٹے
نگاہِ اہلِ ہنر نے ہیں وہ مزے لوٹے محال ہے کہ یہ حسن کا جھگڑا ایسے سے چھوٹے
وہ باغباں جو نہیں "گلکدہ"[1] تو باقی ہے
اثر سے پوچھو کہ وہ دل زدہ تو باقی ہے

(الناظر)

[1] گلکدہ، مرحوم کا دیوان

# اُردو۔ہندی ہندُستانی

از پنڈت منوہر لال زتشی۔ایم۔اے۔آئی۔ای۔ایس (پنشنر)

میرے مہربان منشی دیا نرائن نگم صاحب فرماتے ہیں کہ میں اُردو۔ہندی۔ہندستانی کے مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کروں۔ ملک کی فضا کو دیکھکر اور جس طرح قوم میں آجکل تفرقہ اور تعصب کا بازار گرم ہے اس کو خیال کر کے جی تو یہ چاہتا تھا کہ کچھ بھی نہ لکھوں، اور جناب نگم کی خدمت میں مرزا کی زبان سے یہ عرض کر دوں کہ:۔

غالب سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری ۔ بہ دیارے کہ نہ دانند نظیری ز قتیل

مگر خیال ہوا کہ میرے پُرانے مہربان مجھ سے آزردہ نہ ہو جائیں اس واسطے جو کچھ بھلی بُری صحیح یا غلط میری رائے ہے وہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ اس زبان اور ادب کے مسئلہ کو زبان اور ادب کے نقطۂ نگاہ سے جانچنا چاہیئے، بدقسمتی سے اس کی تہ میں مذہبی تعصب اور سیاسی جھگڑے کام کرتے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے اس گتھی کے سُلجھنے میں بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں۔ جو زبان ہم بولتے ہیں اور جو عبارت کہ ہم لکھتے ہیں وہ کسی غیر زبان کی لونڈی نہیں ہے۔ یہ بات ضروری ہے کہ ہم اس خیال کو دل سے نکالدیں کہ عربی فارسی اعلیٰ زبانیں ہیں اور اُردو ان کی بھکارن ہے، جو کچھ وہ ہاتھ اُٹھا کر دیدیں اسی پر اُس کا گذارہ ہے۔ ہماری زبان اب ایک مستقل زبان ہے اور اُس کے سنوارنے کے واسطے ہمیں اُسی طرح کوشش کرنی چاہیئے جس طرح انگریز انگریزی کے واسطے اور ایرانی فارسی کے واسطے کرتے ہیں۔ یہ بات جبھی ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی زبان بولنے والے اپنے تئیں ہندوستانی اور ہندوستان کو اپنا وطن سمجھیں، اور وطن سمجھکر اس سے محبت کریں۔ اگر ایران کے مسلمان کیانی اور ساسانی سلاطین کے جاہ و حشم پر فخر کر سکتے ہیں، اگر اس زمانہ کے اطالوی باوجود عیسائی ہونے کے غیر عیسائی سلطنت روما کو اپنا سمجھکر اس کے کارناموں پر ناز کر سکتے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، ہندوستان

کی خوبیوں پر فخر نہ کریں، اور چندر گپت اور اشوک، گوتم بدھ اور سری کرشن کو اپنا سمجھکر کلمۂ خیر سے یاد نہ کریں۔ جس دن یہ بات سمجھ میں آجائے گی اُسی دن ہم ہندوستانی زبان کو بھی اپنا سمجھیں گے اور عربی۔ ترکی یا انگریزی کی زبان دانی کو اپنے ادیبوں کا معیار نہ قرار دینگے

ہر زندہ زبان کا تعلق دنیا کے مختلف ملکوں سے اور جو زبانیں ان ملکوں میں بولی جاتی ہیں اُن سے ہوتا ہے، اور اُس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ نئے خیالات کے ساتھ ساتھ ان خیالات کے ظاہر کرنے کے واسطے نئی لفظیں اور نئی ترکیبیں مہیا کرے۔ ہماری زبان میں بھی بہت سی لفظیں ایشیا اور یورپ کی زبانوں سے آکر رائج ہوگئی ہیں، ان کو نکالنے کی فکر کرنا بے عقلی ہے۔ اگر اڈیٹر کا لفظ ہماری زبان میں رائج ہے تو کسی غیر ملک کے اخبار میں "مدیر" کا لفظ دیکھکر اس کو اڈیٹر کی جگہ رواج دینے کی کوشش کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح "عرضی" کی جگہ "پرارتھنا پتر" لکھنا سراسر زبردستی ہے۔ اڈیٹر اور عرضی ہماری زبان کے ٹکسالی لفظ ہیں، ان کو جعلی قرار دیکر پھینک دینا بے عقلی ہے۔

اسی طرح جو غیر زبانوں کی لفظ کسی تبدیلی کے ساتھ ہماری زبان میں رائج ہوگئی ہیں اُن کو اسی تبدیلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے، ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ ان کا اصلی تلفظ یا اصلی املا اپنی زبان میں کیا تھا یا کیا ہے، خواجہ آتش نے جب یہ شعر کہا تھا

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے ۔۔۔ میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

تو اعتراض ہوا تھا کہ بیگم ترکی لفظ ہے، اور ترکی زبان میں گاف پر پیش بولتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ ہم ترکی نہیں بولتے جب ترکی بولیں گے تو بیگم کہیں گے۔ خواجہ صاحب کا ایک اور شعر ہے:۔

پیشگی دل کو چرو لے۔ وہ اسے تحصیلے ۔۔۔ ساری سرکاروں سے ہے عشق کی سرکار جدا

لوگوں نے کہا "پیشگی" فارسی ترکیب ہے مگر فارسی والوں کے استعمال میں نہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا "یہ ہمارا محاورہ ہے۔ یہی جواب اُس شخص کو دیا جائیگا جو لالٹین کو لینٹرن یا ہوٹل کو ہوٹیل کہوانا چاہے۔ آجکل ہماری زبان کے بولنے والوں اور لکھنے والوں کے ایک گروہ میں یہ بیماری پھیل گئی ہے کہ رائج اور منجھی ہوئی لفظوں کو بدلکر اُن کو اُسی تلفظ اور اُس املا کی طرف واپس لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے جو عربی۔ ترکی یا انگریزی میں رائج ہے۔ اس سے زبان کی درستی نہیں ہوتی بلکہ زبان خراب ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں سیکڑوں لفظ بھاشا کے ایسے ہیں جو ہماری زبان میں رائج تھے لیکن جن کو آج کل کے ادیبوں نے خصوصاً اخبار والوں نے ترک کر دیا ہے۔ میر انیس، اور خواجہ حالی کا کلام دیکھیئے تو میرے

بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔ برج بھاشا سے اور کھڑی بولی سے ہماری زبان کا تعلق ظاہر ہے۔ ان زبانوں کے سہل اور میٹھے الفاظ اگر ہم اپنے خیالات کے اظہار کے واسطے استعمال کریں تو یہ ہماری زبان کے لئے مفید ہوگا۔ ایسے لفظ بھی ہیں جو ایک زمانہ میں رائج تھے مگر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی علمیت کے زعم میں ان کو ترک کر دیا۔ مولانا شبلی "اُجاگر" کا لفظ بولتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے۔ یہ لفظ اس قابل ہے کہ اس کو رواج دیا جائے۔ دیکھئے میرے مکرم سید مسعود حسن رضوی صاحب صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی نے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا کیسا اچھا ترجمہ کیا ہے "نہ چلنے کو پاؤں نہ بیٹھنے کو ٹھاؤں"۔ ممکن ہے سولوبیت کے دلدادہ ان ہندی الفاظ کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں، مگر اصل یہ ہے کہ ہماری زبان کی آئندہ ترقی کا یہ بھی ایک نہایت مفید ذریعہ ہے، اور زبان کے جو سچے خیر خواہ ہیں ان کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے، اور برج بھاشا اور کھڑی بولی کے خزانوں سے جو سامنے موجود ہیں پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

مجھ کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ یورپ کی نئی نئی ایجادوں کے ساتھ جو فرنگی الفاظ ہماری زبان میں آ رہے ہیں اُن سے بھاگنا خلاف مصلحت ہے، اور اُن کی جگہ ان سے زیادہ ثقیل اور غیر مانوس عربی یا سنسکرت الفاظ ٹھونسنا زبان کے حق میں اچھا نہیں "تھرما میٹر" کو "مقیاس الحرارت" سے زیادہ لوگ سمجھتے ہیں اور زیادہ سہولت سے اُس کو ادا کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ میں عربی کا بڑا زور ہے اور وہاں کی کتابوں میں اُردو کو معرب کیا جا رہا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو یہ کوشش قابلِ تحسین نہیں۔ اس سے بچنا چاہیئے۔

ہاں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ انسان کی طرح زبان کا بھی مزاج ہوتا ہے، ذوقِ سلیم اُس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے خلاف عمل نہیں کرتا Standing Congress Committee کا ترجمہ کھڑی کانگریس کمیٹی کرنا یا Dead Letter office کو "مری چٹھی" کا دفتر کہنا زبان کی گردن کو کُند چھری سے ریتنا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو بجنسہٖ غیر زبان سے لے لئے جاتے ہیں جیسے کوٹ بعض ایسے ہیں جن میں جزوی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جیسے پتلون۔ جو لوگ زباں دانی کا دعویٰ کرتے ہیں اور زبان کی ترقی اور اصلاح کے واسطے کوشاں ہیں اُن کو اس بات کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے، زبان کو وسعت ضرور دی جائے، اختراع کا دروازہ ضرور کھلا رہے، نئی لفظیں ضرور قبول کی جائیں مگر جو کچھ ہو ذوقِ سلیم کے ماتحت ہو۔ کج فہمی، ضد اور فریق بندی کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہیئے۔

# نغمۂ نَے

(از محمد عبدالجبار صاحب اختر صدیقی ۔ لکھنؤ)

تھا فلک پر ماہِ تاباں تھی زمیں پر چاندنی ۔۔۔ تھی بچھی سطحِ زمیں پر اک سراسر چاندنی
زیبِ آغوشِ وفا جس طرح نازِ حسن ہو ۔۔۔ یا صدائے عشق میں پوشیدہ سازِ حسن ہو
اس طرح رعنائیوں کو لے کر آیا نورِ ماہ ۔۔۔ سامنے تھے کُل مناظر، وا تھی آغوشِ نگاہ
پائی آنکھوں نے طراوت خُنکیِ مہتاب سے ۔۔۔ مِل گئے تارِ نظر جا کر کنارِ آب سے
وہ مصفا آبِ دریا درمیانِ سبزہ زار ۔۔۔ اور وہ ہلکی ہلکی لہریں عکسِ مہ سے تابدار
جھومتا حدِ نظر تک سبزۂ مخمور تھا ۔۔۔ اور زمیں سے آسماں تک اک سراسر نور تھا
دشت کے پھولوں کی خوشبو لیکر آتی تھی صبا ۔۔۔ نغمۂ نَے ساتھ لا لا کر سُناتی تھی صبا
مرغزاروں اور سطحِ آب پر ہوتا ہوا ۔۔۔ اور سکوں میں کیف کی اک لہر دوڑاتا ہوا
اِک نویدِ جانفزا لیکر کبھی آتا تھا وہ ۔۔۔ جذب ہو کر گاہ خاموشی میں کھو جاتا تھا وہ
زندگی کا ساز تھا، فطرت کا ہم آواز تھا ۔۔۔ اِرتقاءِ روح کا گویا پرِ پرواز تھا

کیفیت ایسی ہوئی طاری کہ بیخود ہو گیا
پھر جو ہوش آیا تو اے اختر وہ نغمہ کھو گیا

## رُباعی

بیداری کے ساتھ ساتھ خواب آتا ہے ۔۔۔ خاموش لبوں سے اک جواب آتا ہے
دنیا نے جسے بہ جبر چھینا تھا کبھی ۔۔۔ محشر میں پلٹ کے وہ شباب آتا ہے

اختر

## رُباعی

سجدے میں کسی ماہِ لقا کا جُھکنا ۔۔۔ کیا قہر ہے اِک جانِ حیا کا جُھکنا
تیرا مرے قدموں پہ جبیں رکھدینا ۔۔۔ بندے کے قدم پر ہے خدا کا جُھکنا

جوش ملیح آبادی

# بنی اسرائیل کے زوال و تباہی کی داستان

(از منشی محمد امیر احمد صاحب علوی بی۔اے۔ ڈپٹی کلکٹر پنشنر صوبۂ متحدہ)

دنیا قوموں کا مسافر خانہ ہے، ایک جاتی ہے دوسری آتی ہے، کوئی بنتی ہے کوئی بگڑتی ہے، کوئی جانشینوں کے لئے نقشِ قدم چھوڑتی ہے اور کوئی بے نام و نشان مٹ جاتی ہے، لیکن اس کاروان سرا کی دلچسپیوں اور فتنہ سامانیوں میں فرق نہیں آتا۔

ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے مجلس کی

گروہ گروہ، جوق جوق، جادہ پیماؤں کے انبوہ، اس سرائے فانی میں شب باش ہوئے، بربریت و مدنیت کی ہوا کھائی، عروج و زوال کے تماشے دیکھے، اور ایک معیّنہ مدّت کے بعد ایسے گمنام ہوئے کہ ان میں سے بیشتر کا حال کچھ معلوم نہیں۔

حیاتِ جاوید صرف اُن اقوام کو نصیب ہوتی ہے جو اس دار ناپائدار میں دیرپا یادگاریں قائم کریں۔ تہذیب و تمدن کی جدید شاہراہیں دریافت کریں، جہانگیری و کشور کشائی کا چار دانگ عالم میں غلغلہ بلند کریں، یا ایسے خیالات کی تشہیر و تدوین کریں جو انسانی زندگی میں مہتم بالشان تغیرات کا باعث ہوں بلکہ جس قدر زیادہ اخلاقی اور روحانی فوائد کسی قوم سے اس کے ہمعصروں کو پہونچتے ہیں اتنی ہی زیادہ بسط و تفصیل سے اُس کی تاریخ بیان ہوتی ہے۔

جنوب مشرقی یوروپ کے ایک مختصر قطعے نے منطق و فلسفہ کے اسرار سے خلق کو روشناس کیا، صناعی، نازک خیالی اور شاعری میں یدِ طولیٰ حاصل کیا، اُس کی یاد ہنوز باقی اور خطہ یونان کی عظمت دانشورانِ عالم کے قلوب پر نقش ہے۔ رومتہ الکبریٰ نے انضباط قوانین، اسلوب بیان، آئین جہانداری اور خطابت کا درس عالم کو دیا، اُس کی شوکت و اقتدار کے سامنے تمام شائستہ دنیا کا سر تسلیم ہنوز خم ہے۔

مصر نے تہذیب و تمدن میں درجۂ کمال پایا، اور عجیب و غریب مستحکم اہرام بنا کر فنِ تعمیر کے راز عالم آشکارا کئے۔ آج ہزاروں برس کے بعد بھی فراعنہ فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

بھگوت گیتا کا راگ۔ اجنٹا اور ایلورا کے غار ہندوستان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کیلئے کافی ہیں۔

جمشید۔ کیخسرو۔ سنحاریب و بخت و نصر۔ ارجن و بھیم۔ ہنیبال و چنگیز۔ تیمور اور نپولین جس جس

ملک نے پیدا کئے اُس کی تاریخ بنی آدم کے قلوب سے محو نہیں ہو سکتی۔

لیکن ہم جس قوم کی دردناک داستان بیان کرنا چاہتے ہیں، اُس نے یونان۔ روما۔ مصر یا ہندوستان کی طرح مستقل یادگاریں نہیں چھوڑیں۔ اُس نے کوئی تیمور یا ہنیبال پیدا نہیں کیا۔ کوئی پتھر اور چونے کی عمارت اُس پہ فاتحہ خوانی کو باقی نہیں، اُس کا رقبۂ حکومت کبھی وسیع نہ تھا، دنیا کی ملکی اور تمدنی تاریخ پر اُس کا مستقل اثر کبھی نہ ہوا، اُس نے سائینس میں کوئی ترقی نہیں کی علوم وفنون۔ نقوش و بیز نجات میں اختراعات نہیں کیں، تجارت وزراعت میں ایجادات سے دنیا کو بہرہ مند نہیں کیا۔ شجاعت ومردانگی میں بھی شہرت نہیں پائی۔ وہ سرزمین شام کے ایک مختصر صوبہ میں آباد تھی اور اُسکی مردم شماری کبھی سات نقطوں سے آگے نہیں بڑھی لیکن اُسکا نام نیک ہنوز زندہ ہے، اُس کی تاریخ محفوظ ومنقوش ہے اور اُس کے سوانح حیات میں ایک خاص دلکشی ہے جو تمام دیگر اقوام وملل کی تواریخ سے مختلف ہے ؎

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
پروا نہیں گر ساری خدائی ہو مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

اِس قوم کے برگزیدہ افراد نے حیاتِ انسانی کے ایک رخ کو منزل کمال تک پہونچایا یعنی اخلاقیات روحانیات اور الٰہیات کا ایسا دلکش ترانہ سنایا کہ یونان کا فلسفہ فراموش ہوجائے۔ روما کے قوانین ناپید ہو جائیں، لیکن وہ کالنقش فی الحجر ہمیشہ پاک دلوں پر کندہ رہیگا، ان کا سکھایا ہوا علم الٰہیات دنیا کے تین[1] شائستہ مذاہب کا سرچشمہ ہے۔ مشرقی ومغربی متمدن ووحشی، عالم وجاہل شاہ وگدا اس کے خوانِ فضل وکمال سے یکساں ذلّہ ربا ہیں اور فی الحقیقت وہ اولاد آدم کے لئے ہر صنعت وحرفت۔ سائینس وقانون۔ فلسفہ اور منطق سے زیادہ نفع بخش ہے۔

آج دنیا میں ابراہیم واسماعیل۔ اسحاق ویعقوب۔ یوسف وموسیٰ کو جو شہرت عام حاصل ہے وہ مہمان سرائے عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح یا زبردست سے زبردست شاہنشاہ کو نصیب نہ ہوئی۔

طالع میں نہیں یہ شب کسی کے — اختر سو بار سو کے جاگے

یورپ۔ مغربی ایشیا۔ شمالی افریقہ۔ امریکا اور ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ان بزرگوں کا نام ہے، اور ان کے حالات کمالات۔ فضائل واخلاق اس قدر مشہور ہیں کہ ان نفوس قدسیہ

---

[1] یعنی ایک کروڑ تک نہیں پہونچی

[2] یعنی یہود۔ مسیحی اور مسلمان

کا اسم مبارک کان میں پڑتے ہی اُن کے کارناموں کی تفصیل خود بخود تازہ ہوجاتی ہے اور سوانح زندگی کے دلکش مناظر عالمِ خیال میں آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

اِن صدر نشینانِ فضیلت نے گرامی قدر اخلاف چھوڑے جن کو عزت وعافیت نے نذریں گذرانیں۔ دولت وفراغت نے موتیوں کے ہار پہنائے۔ شجاعت و اُولوالعزمی نے سونے کے پھول نچھاور کئے اور سلطنت، واقبال نے حیاتِ جاوید کی مجلس میں تعظیم وتکریم سے رونق افروز کیا۔

مگر دنیا کا دستورالعمل تبدیل نہیں ہوتا، دورنگی سرائے کے قواعد وضوابط میں ترمیم نہیں ہوتی۔ ہر جزر کے ساتھ مد، عُسر کے ساتھ یُسر لازم ہے، اور ہر عروج کے بعد ہبوط۔ کمال کے بعد زوال، عزت کے بعد ذلت سے چارہ نہیں۔ یعقوب واسحاق کی اولاد اس قاعدۂ کلّیہ سے کیوں مستثنےٰ ہوتی؟ ان کو بھی طلسم اجرام واجسام کے کل منازل کی سیر کرائی گئی اور نشیب وفراز کے عبرت خیز تماشے دکھائے گئے۔ کبھی وہ عظمت وشوکت تھی کہ اُن کے عبادت خانے کی تعمیر کیلئے اقصائے عالم سے گراں ترین اجناس کا خراج وصول کیا گیا۔ زمین نے لعل ویاقوت اُگلے اور سمندر نے موتیوں کا مینہ برسایا، اور کبھی وہ ذلت ومسکنت تھی کہ گھربار، مال ومتاع لُٹا۔ آنکھوں کے سامنے مقدس معبد میں آگ لگائی گئی اور ایک حاکم جابر نے جلاوطنی کا فرمان صادر کیا۔

ایک دن وہ عزت افزائی تھی کہ طیور ووحوش، چرند وپرند ان کے لئے مسخر کئے گئے، بحیرۂ احمر شق ہوا۔ کہ یہ بخیریت دشمنوں کے ملک سے نکل جائیں۔ پتھر نے کلیجہ چاک کیا کہ اُن کو رفع تشنگی کیلئے پانی میسر آئے۔ آسمان سے من وسلویٰ اُترا کہ اُن کو بے زحمت غذا نصیب ہو۔ اور ایک روز وہ فضیحت ورسوائی ہوئی کہ غیرتمند عورتوں کی لاشوں سے کنوئیں پٹ گئے، معصوم بچوں اور معذور بوڑھوں کے خون سے ندیاں بہہ گئیں اور وہ جفا پیشہ دشمنوں کی غلامی میں گرفتار سب کچھ دیکھتے تھے مگر آہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے    آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

اِس عروج وزوال، عزت وذلت، شفقت وعتاب کی مبسوط تاریخ "عہد نامۂ عتیق" ہے جس کی ابتدائی پانچ کتابیں (۱) پیدائش (۲) خروج (۳) احبار (۴) اعداد، اور (۵) استثناء توریت کہلاتی ہیں۔ اور حضرت موسیٰ کی طرف منسوب ہیں۔ چھٹی کتاب حضرت موسیٰ کے خلیفہ یوشع بن نون کے فتوحات کی داستان ہے۔ ساتویں "قضاۃ" اور نویں اور دسویں سموئیل بنی اسرائیل کے اشاعت

تہذیب وتمدن کا شاہنامہ ہیں۔ گیارھویں اور بارھویں میں "سلاطین" کا احوال ہے اور تیرھویں اور چودھویں کا نام ہی "تواریخ" ہے۔ پندرھویں نمبر پر "عزرا" اور ستائیسویں پر دانیال کی تالیفات فرزندان یعقوب کے عہد مصیبت کی یادگار ہیں۔ (۲۳) اشعیا (۲۴) ارمیا اور (۲۶) حزقیل یہودیوں کی بداعمالی کی تفصیلات سے لبریز ہیں۔ بقیہ کتابیں انبیاء بنی اسرائیل کے وہ صحائف ہیں جنکو بائبل کے جمع کرنے والوں نے قابل استناد سمجھا اور کتاب مقدس میں شامل رکھا۔ بابل کی اسیری تک یہود کی قومی زبان عبرانی تھی۔ عہدنامۂ عتیق کے کل صحیفے اسی زبان میں لکھے گئے۔ صرف عزرا ارمیا اور دانیال کے چند اجزا کلدانی میں تھے۔

بابل سے رہائی کے بعد صحف مقدس کا ارامی (شامی) میں ترجمہ ہوا، اور اس کے بعد یونانی زبان کو یہ عزت حاصل ہوئی۔ اب دنیا میں عبرانی کی کوئی کتاب نویں صدی عیسوی سے پہلے کی تحریر شدہ موجود نہیں۔ البتہ یونانی زبان میں کتاب مقدس کے تین مکمل نسخے چوتھی صدی عیسوی کے مرقومہ محفوظ ہیں۔

یہود کو فلسفۂ تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، واقعات کی یادداشتیں لکڑی کے تختوں اور خشک کھالوں پر نقش کرکے شاہی کتب خانوں میں رکھی جاتی تھیں جو اسیری اور تباہی میں غارت ہوئیں۔ کوئی سنگین کتبہ اسرائیلی بادشاہوں کا نصب کیا ہوا ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔ عبرانیوں کا احوال اُن کے ہمعصر بابلیوں اور مصریوں کی تواریخ میں بھی نہیں ملتا۔

انبیاء اور کاملین کے حاشیہ نشین بزرگوں کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے، اور قوم یہود کی بابت جو کچھ واقفیت ہم کو حاصل ہو سکتی ہے وہ انھیں تالیفات کی رہین منت ہے۔ لیکن یہ کتابیں تحریفات سے خالی نہیں۔

یونانی۔ لاطینی اور دیگر تراجم کے درمیان فرنگی محققوں کے قول کے مطابق تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار اختلافات ہیں۔ اور ان اسباب کی بنا پر یوروپ کے بعض مؤرخ عبرانیوں کی تمام قدیم روایات کو مشتبہ سمجھتے اور خروج مصر سے پہلے کی کُل حکایات کو افسانہ قرار دیتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے نامور مؤرخ جوزیفس نے لکھا ہے کہ آرٹیشر کے بعد (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح سے) کتاب مقدس کے قدیم صحیفوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ مسلم ہے کہ سنہ عیسوی کے آغاز سے بہت پہلے ان صحیفوں کے یونانی ترجمے مصر میں شائع ہو چکے تھے، اور معترضین کو یہ تسلیم ہے کہ تراجم کے اختلافات

---

۱؎ عہدنامۂ عتیق میں کل ۳۵ کتابیں شامل ہیں۔

سے تفصیلات میں فرق آ گیا ہے مگر نفس واقعات میں کوئی تغیر نہیں ہوا، لہذا کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ عہد نامۂ قدیم کی قدر و منزلت یونانی اور مصری تواریخ سے کم کی جائے۔ دوسری قوموں کی خاندانی روایات جس قدر معتبر ہو سکتی ہیں کم از کم اتنا ہی اعتماد عہد نامۂ قدیم پر ضرور ہونا چاہیئے۔

ہیرو ڈوٹس کے قصے، ایلیڈ کے افسانے یوروپ والے سند میں پیش کرتے ہیں۔ شاہنامہ کی کہانیاں پارسی مانتے ہیں۔ مہابھارت کی حکایتیں ہنود کا جزو ایمان ہیں، واقدی کی روایتیں آغانی کی داستانیں مسلمان نقل کرتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اُس مقدس کتاب کے بیانات پر اعتبار نہ کیا جائے جس میں دو ہزار برس سے کسی واقعہ کے متعلق تغیر یا اضافہ نہیں کیا گیا۔

غرض یونان کی قدیم تواریخ سے عہد نامۂ عتیق کم رتبہ نہیں ہے اور عبرانیوں کے احوال دریافت کرنے کے لئے ہمارا یہی مستند ترین ذریعہ ہے۔ عہد نامۂ عتیق سے دوسرے درجہ پر "تالمود" ہے جس کی یہودیوں کی نظر میں وہی عزت ہے جو مسلمانوں کی نگاہ میں کتب احادیث کی۔ اس ضخیم تالیف میں علما اور احبار کے مکاشفات اور انبیاء سابقین کے وہ قصص و حکایات ہیں جو متداول صحف مقدس میں پائے نہیں جاتے۔ یہ کتاب عبرانی زبان میں ۲ جلدوں اور ۱۷ حصوں پر منقسم ہے، اور اس کا معتبر ایڈیشن سنہ ۱۵۲۰ء میں بمقام وینس شائع ہوا تھا۔ اس کتاب میں علاوہ مسائل فقہ اور تعلیم شریعت کے توریت و زبور وغیرہ کتب آسمانی کے بعض آیات و اسفار کی تشریح و تفصیل بھی ہے

اس مشہور تالمود کے علاوہ ایک مختصر کتاب "تالمود یروشیلمی" کے نام سے بھی عبرانی زبان میں دستیاب ہوئی ہے جس کا ترجمہ ۱۸۸۳ء میں بمقام پیرس شائع ہوا تھا۔

فلیویس جوزیفس نام ایک یہودی جو ۳۷ء میں پیدا ہوا اور ۹۵ء میں مرا، یروشلیم کی آخری تباہی کے وقت میدان جنگ میں موجود تھا۔ اور ۷۰ء کے خونیں مناظر کی دردناک تصویر پیش کرنے کے لئے اُس نے یونانی زبان میں بنی اسرائیل کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جس کا یورپ کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہوا، جس کا مطالعہ آج تاریخ یہود کے طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔

ان تالیفات کے علاوہ صحف انبیاء کا ایک بہت بڑا طومار علمائے یہود کے پاس تھا جس کے بعض اجزاء مثلاً "صحیفۂ ابراہیم" یا "کتاب ادریس" وغیرہ ہنوز یورپ میں رائج ہیں مگر مسیحی محققین ان کو الہامی نہیں مانتے۔

ان تمام بیش بہا ماخذوں سے مستفید ہو کر "انجلو ریپوپورٹ" نے ایک کتاب "مذہبی قصص و افسانہائے بنی اسرائیل" کے نام سے تالیف کی اور گریشم کمپنی لندن نے ۱۹۲۸ء میں اس قاموس حکایات کو تین جلدوں

میں شائع کیا۔ اسرائیلیوں کے مراسم اور مذہبی کہانیوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ مجموعہ بغایت مفید ہے۔

اگر عہد نامۂ عتیق۔ تالمود۔ جوزیفس اور قاموس الحکایات کو پیش نظر رکھکر بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب کی جائے تو وہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہو سکتی ہے۔

یہود کے عہد عروج کی تاریخ ہندوستان میں مشہور ہے اور "قصص الانبیا" یا "احوال الانبیاء" کے نام سے متعدد کتابیں اِس موضوع پر اُردو میں لکھی جاچکی ہیں، مگر اُن کے عہد زوال کی داستان جہاں تک مجھکو معلوم ہے ہندوستان کی کسی زبان میں موجود نہیں ہے۔

راقم الحروف "صحیفۂ دانیال" کی تفسیر لکھنے والا تھا مگر چند اوراق تحریر کرنے کے بعد خیال آیا کہ جب تک بنی اسرائیل کے زوال و تباہی کی تاریخ سے اہل وطن کو روشناس نہ کیا جائے حضرت دانیال کی پیشین گوئیاں سمجھائی نہیں جاسکتیں۔ لہٰذا اس خدمت کو ملتوی کرکے تاریخ زوال بنی اسرائیل کے سلسلہ کا آغاز کیا۔ ابتدائی تین ابواب میں یہودیوں کے عہد شباب و ترقی کا افسانہ ہے، اور بقیہ ابواب میں اُن کے زوال کی تاریخ ہے۔ آخر میں یہود کے طرز معاشرت پر بھی خامہ فرسائی کیگئی ہے۔

اِس تالیف کا ماخذ "عہد نامۂ عتیق" اور جوزیفس کی تاریخ ہے۔ ابتدائی ابواب میں چند پر لطف حکایتیں تفنن طبع کے لئے قاموس الحکایات سے اخذ کیگئی ہیں، مگر متن کتاب میں یا حاشیہ پر تصریح کردی ہے کہ یہ حکایات قاموس سے ماخوذ ہیں تاکہ مورخوں کی نگاہ میں ان افسانوں کی آمیزش سے ساری کتاب بے وقعت نہ ہو جائے۔

عوام کو منطقی دلائل، فلسفیانہ نکات اور خشک مباحث سے دلچسپی نہیں ہوتی، وہ قصہ کہانی کے دھوکے میں سارا دفتر پڑھ لیں لیکن تاریخ اور فلسفہ کے نام سے فوراً سرگرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس تالیف کا طرز بیان مورخانہ انداز تحریر سے مختلف رکھا گیا ہے۔ دلچسپ افسانے شامل کئے ہیں اور عشق و محبت کی کہانیاں بھی حذف نہیں کی ہیں۔ یہ کتاب حقیقتاً یہود کی درد انگیز تاریخ کا اجمالی خاکہ اور اُنکی معصر و ہمسر قوموں کے کارناموں کا خلاصہ ہے۔ مگر واقعات و سوانح بقصص و حکایات کی طرح بیان کئے گئے ہیں اور عہد قدیم کی ایک شاندار قوم کا احوال "داستان زوال" کے عنوان سے نذر کیا ہے تاکہ اسی حیلہ سے یہ تالیف عوام و خواص کے طبقوں میں یکساں قبولیت حاصل کرے۔

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو ... کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

---

نوٹ: بنی اسرائیل کے زوال کی مفصل تاریخ جو مخدومی منشی امیر احمد علوی صاحب نے تحریر فرمائی ہے جسکا یہ مضمون دیباچہ ہے زیر طبع ہے۔ اس سے یقیناً اُردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ ایڈیٹر

# مزدور

(از منشی منوہر لال شہید بی اے)

(۱)

تو کشتۂ ادبار ہے ۔ دل میں ترے دُکھ درد ہے
بے جان ہے بیمار ہے ۔ چہرے کی رنگت زرد ہے
مفلس ہے اور نادار ہے ۔ کپڑوں پہ سیروں گرد ہے
غم ناک ہے حالت تری
غم خیز ہے ذلت تری
ادبار ہے قسمت تری
بے کار ہے ہمت تری
خوشیوں سے بیگانہ ہے تو ۔ مجنوں ہے دیوانہ ہے تو
گویا زبانِ دہر پر ۔ خاموش افسانہ ہے تو

(۲)

پڑتی ہیں جو جو آفتیں، چپکے سے سہہ جاتا ہے تو
فریاد کا خوگر نہیں، خاموش رہ جاتا ہے تو
مایوس نظروں سے مگر سب حال کہہ جاتا ہے تو
حسرت ہے دل میں غم بھی ہے
افسردگی پیہم بھی ہے
ایک بے اثر ماتم بھی ہے
جب ہوں تری بربادیاں ۔ دنیا میں ہوں بربادیاں
ٹوٹی ہیں تیری جان پر ۔ سفاکیاں جلادیاں

(۳)

اے کشتۂ جورِ فلک ۔ آہ و فغاں بے سود ہے

اے آتشِ خاموش غم۔ سوزِ نہاں بے سود ہے
ہمت سے دُکھ کو دُور کر۔ دُکھ کا بیاں بے سود ہے
یعنی کبھی رویا نہ کر
اشکوں سے منہ دھویا نہ کر
غفلت میں یوں سویا نہ کر
سویا نہ کر، غافل نہ رہ۔ غافل نہ رہ۔ کاہل نہ رہ
اُٹھ جاگ دنیا کو جگا
میدان میں بڑھ بڑھ کے آ
ہمت سے بگڑی کو بنا
کوشش سے کچھ کرکے دکھا
کوشش سے کیا ہوتا نہیں، کس کا بھلا ہوتا نہیں
وہ کونسا عقدہ ہے جو۔ ہمت سے وا ہوتا نہیں

---

# برسات کی شام

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

خنک ہواؤں میں اُٹھتی جوانیوں کا خرام — کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پہ آسماں کی ترنگ — خنک گھٹاؤں کی بھیگی ہوئی تہوں کا رنگ
فلک پہ بازیٔ طفلانہ ابر پاروں کی — ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نگاروں کی
ہر ایک ذرّے میں ہیجان مست ہونے کا — ذرا سا ریل کی پٹری پہ رنگ سونے کا
ہوائے سرد کی ہر موج نرم میں محلول — گلاب، مُشک، اگر، عطر، عود، عنبر، پھول
شفق، ہلال، ندی، رنگِ ابر، سبزہ، ہوا — ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا
خفیف زمزمہ امواج کی روانی میں — فلک پہ رنگ، درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ، گھٹا لالہ گوں، شفق چنچال — ہوا لطیف، زمیں نرم، آسمان سیال
یہ جانفروز مناظر گہ دل لبھاتے ہیں — بچھڑ گیا ہوں جو تم سے تو کھائے جاتے ہیں

(کنول)

# قلق

(از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے۔ ایل ایل بی۔ مصنف سیر المصنفین)

غلام مولیٰ نام عرف مولا بخش تخلص قلق تھا۔ آپ میرٹھ کے رہنے والے تھے، بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے دہلی چلے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک آپ دہلی میں اقامت گزیں رہے اور طب وہیں حاصل کی چنانچہ آپ حکیم مولا بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ فارسی زبان مولانا امام بخش صہبائی سے پڑھی۔ آپ مولانا کے شاگردوں میں جودت طبع اور جدت ذہن کے لئے ممتاز تھے۔ صرف و نحو و منطق اور دیگر فنون عربیہ ملّا انتظام علی سہارنپوری کے فیض سے حاصل ہوئے۔ شعر و سخن میں حکیم مومن خاں مومنؔ کی شاگردی اختیار کی۔ اُستاد کی خاص نظر آپ پر تھی اور علاوہ اصلاح سخن غوامض و دقائق فن بھی آپ کو بتلاتے رہتے تھے، چنانچہ بہت جلد کلام میں پختگی پیدا ہوگئی۔ مشاعروں میں جہاں کہیں غزلِ طرحی پڑھتے تھے لوگ آپ کے کلام سے مسرور اور متحیّر ہوتے تھے۔ غالبؔ۔ ذوقؔ اور جملہ اساتذۂ فن سے آپ کے تعلقات اور روابط قائم تھے، اور دہلی کی تباہی و بربادی پر افسردہ دل ہوکر وطنِ مالوف واپس آگئے تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں میرٹھ میں انتقال فرمایا۔ مرتے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو وصیت کی کہ آپ کا دیوان شائع کردیا جائے۔ چنانچہ بابو محمد عبداللہ نے جو آپ کے چھوٹے بھائی تھے اس وصیت کو پورا کیا اور مولانا حالی مرحوم سے ایک تقریظ فارسی زبان میں لکھوائی جو دیوان کے آخر میں شامل ہے اور چند اور تقریظیں بھی درج ہیں

کلام پر تبصرہ | قلق کا دیوان ۳۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ حسب رواج شروع میں غزلیات ہیں جو ۱۶۶ صفحات پر ختم ہوتی ہیں اور جن کے اشعار کی تعداد تقریباً دوہزار سات سو ہوگی۔ اس کے بعد رُباعیات ہیں جن کی تعداد پونے دو سو کے قریب ہے۔ مخمسات۔ مسدسات۔ ترجیع بند۔ واسوخت کا نمبران سب کے بعد آتا ہے۔ پھر ایک مرثیہ ہے جس میں ۱۸۶ بند ہیں، بعد ازاں قصائد اور قطعات ہیں۔ غرض آپ کے دیوان میں جملہ اصناف سخن کا نمونہ موجود ہے۔

آپ کا کلام اپنے اُستاد مومنؔ کے طرز پر ہے۔ ترکیب کی برجستگی۔ مضمون آفرینی۔ خیال بندی۔ شوخی اور ندرت سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ کلام مشکل نہیں ہے لیکن بعض بعض اشعار دماغ پر زور

ڈالنے سے حل ہوتے ہیں۔ جا بجا ایسے نمونے موجود ہیں جن سے مومن کی شاگردی نمایاں ہے۔ ان کو اپنے استاد کی زندگی میں زیادہ فروغ کا موقع نہیں ملا اور استاد کے بعد یہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہے ورنہ علمِ استادی بلند کرتے۔ ہنگامۂ غدر نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا اور یہ حضرت بادلِ ناخواستہ دلّی کو ترک کر کے اپنے وطن میرٹھ واپس چلے آئے۔

آپ کا کلام پڑھنے سے طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے، ایک کیف آور حالت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض اشعار بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دلّی کی آخری بہار کے گلہائے شگفتہ بہت تھے اور اُن کی خوشبو سے مشامِ جاں معطر تھے لیکن اب ان کا کلام عام نظروں سے پوشیدہ ہو گیا ہے۔ ذوق۔ مومن اور غالب کے کلام نے وہ شہرت حاصل کی کہ اُن کے شاگردوں کی طرف کسی نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ جو شاگرد ایسے خوش نصیب تھے کہ اپنے اپنے استادوں کے بعد زیادہ مدت تک زندہ رہے اُن کا شمار شعراء کی صفِ اولین میں ہو گیا، اور جن شاگردوں نے جلد راہِ عدم اختیار کی اُن کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ اول الذکر میں داغ اور حالی شامل ہیں، اور آخر الذکر میں میر حسین تسکین قلق شیفتہ۔ نیّر وغیرہ ہیں۔

قلق کے دیوان کے آخر میں بعض اصحاب کی تقریظیں بھی شامل ہیں، اُن میں سے صرف مولانا حالی اور مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ کی تقریظوں کا اقتباس کیا گیا ہے۔ مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں:۔

"از انجا کہ حکیم مولا بخش قلق را مناسبتِ طبع و میلِ خاطر بطریقۂ خامۂ خویش (حکیم مومن خاں) دیدہ بودند نظرے خاص بحالِ ایشاں گماشتہ بعلاوۂ اصلاحِ سخن و القائے غوامض و دقائق ایں فن انواعِ لطف و کرم و اصنافِ شفقت و عنایت بر ایشاں مبذول میداشتند تا آنکہ در اندک فرصت سخنِ ایشاں بر نسقِ خامۂ استادِ خویش کمالِ پختگی پیدا کردہ ہر جا کہ بزمِ مشاعرہ انعقاد می یافت با استادانِ دیگر ہمطرح شدہ داد غزل سرائی میدادند و حاضرین تعجب بر تعجب و حیرت بالائے حیرت می افزودند۔"

مولوی سید احمد مؤلف فرہنگِ آصفیہ لکھتے ہیں:۔

"آپ کے شعر دو تڑپتے ہوئے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو تڑپ ہی جاتا تھا۔ عجب نہیں جو بعض اوقات مولانائے ممدوح کو خود بھی اپنے اشعار پر رشک آجاتا ہو۔" اُستاد اور شاگرد میں جو ایک خاص نسبت ہونی چاہیئے وہ آپ میں اور حضرت مومن خاں میں بخوبی موجود ہے۔ کوئی بڑا ہی صاحبِ مذاق ہو تو شاید یہ کہہ سکے کہ اشعار تو مومن خاں کے ہی ہیں البتہ ابتدا اور انتہا کا کہیں کہیں فرق ہے۔ ورنہ ہر ایک کا کام نہیں ہے کہ مومن اور قلق کے سخن

یں تمیز کر سکے :

چنانچہ نازک خیالی ملاحظہ فرمائیے۔

وصل ہوتا تو نزاکت کا بہانا ہوتا حشر تک بھی تو نہ آتے اگر آنا ہوتا
آسماں کو یاد ہیں کیا کیا گرفتاری کے ڈھنگ ہم چلے کس شوق سے سوئے گلستاں دیکھنا
ہمارا رنگ پریدہ ہے آسماں کیسا وفا کا سایۂ رفتار ہے جہاں کیسا
ہے پھر جو التفات تو کیا امتحاں ہے اب اس دشمنی کو دیکھئے پھر مہرباں ہے اب
ناکامیوں سے رہتا ہے ناکام کامیاب رکھتا ہے حسرتوں کو دل بے خبر لذیذ

بعض اشعار سے شوخی بھی ہویدا ہے، مثلاً :-

ہر اک سے اب وہ کہتے ہیں کہ لو ہم پر یہ مرتے ہیں جئیں گے اس طرح کب تک کہ غیرت آ ہی جاتی ہے
ستم کر کے ستمگر کی نظر نیچی ہی رہتی ہے بُرائی پھر بُرائی ہے ندامت آ ہی جاتی ہے
خدا را اک دم خیال مدعی سے ہو نہیں سکتا تمھیں الزام کیا دوں جب مجھی سے ہو نہیں سکتا
کہتا ہے انجمن کو تری خلد، مدعی اس بوالہوس کے دل میں تمنا ہے حور کی

حسب ذیل شعر میں غالب کا انداز بیان ہے :-

لے چرخ تو نے کیا نہ کیا، یہ نہیں کیا رسوائے بزم ناز کسی نازنیں کے ساتھ

آپ کے یہاں نہایت عمدہ فارسی تراکیب استعمال ہوئی ہیں، اُن میں سے چند ذیل میں درج کیجاتی ہیں
محبت کیشی۔ صلح کیشی۔ عاصی نکردہ جرم۔ دلِ گم گشتہ۔ جوشِ تشنہ کامی۔ فسادِ نظر۔ کشتۂ ذلتِ وفا
شعر کشتۂ ذلتِ وفا نہ ہوا کون بہتر عدو سے ہو سچ ہے
گردِ پسِ کارواں۔ نالہ سرائی۔ برگشتہ روز۔ لبریزِ اشتیاق۔ بے پناہ۔ گرفتہ دم۔ شکرِ خواب۔ ساغرِ بادۂ فرصت
ناتجربہ۔ شعر

وہ خود ناتجربہ ہے کیا کرے درماں مرا عیسیٰ مژہ پرنم نہ دل میں داغ خشک و تر سے کیا واقف

سوز آشنا۔ صبر گریز پا۔ گریباں گیر۔ کشمکش۔ شعر :-

کس جفا کار کی وفا ہے جاں کس کشمکش کا مدعا ہے دل

داغِ بہارِ رفتہ، بختِ ہرزہ گرد۔ ناکردہ کار۔ شکوہ آلود نصیحت۔ سر بگریباں۔ لب گزا ع

یادِ اس کی لب گزا ہے دم واپسیں کے ساتھ

رشک آفریں۔ وفا شعار۔ برقِ یاس۔ غرقِ آتش۔ گداختۂ لذتِ غضب۔ وغیرہ وغیرہ۔

متروکات بھی آپ کے یہاں ہیں اور کثرت سے ہیں :-

دِتنا بجائے اِتنا۔ جلدیوں بجائے جلدی۔ اے لو بالکل متروک ہے۔ رہویگا بجائے رہیگا۔ اللہ رے متروک ہے۔ جفاشعار کیا بجائے جفا شعار کی۔ نظر آوے بجائے نظر آئے۔ کبھو بجائے کبھی۔ ہائے رے متروک ہے۔ موت آئے پہ بھی بجائے موت آنے پر بھی۔ بل بے متروک ہے۔ ٹپکا پڑے ہے بجائے ٹپکا پڑتا ہے۔ کیجے بجائے کیجئے۔ ہنیں آنے کے بجائے نہیں آئینگے۔ ٹلنے کا بجائے ٹلیگا۔ آجانے بجائے آنا جانے وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ آپ کا کلام متین ہے اور کسی جگہ رکاکت نہیں پائی جاتی تاہم حسب ذیل شعر کھٹکتا ہے :-

غیروں کو ہونٹ چاٹتے ہم دیکھتے کبھی — ہوتا مزہ جو تیرے دہن کے لعاب میں

حسب ذیل شعر میں محاورہ کو کس خوبی سے باندھا ہے، فرماتے ہیں :-

ہمارا قافلہ لُٹ کر نہ سلماں میں کبھی آیا — رہا دل کوئے دشمن میں رہی جاں کوئے دلبر میں

آپ کا ایک شعر ہے :-

قطع تقریبِ عیادت کی بھی امید ہوئی — ہوگیا اور بھی بیمار میں اچھا ہوکر

پہلے مصرعہ میں قطعِ تقریبِ عیادت کے لئے "امید" کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ میری رائے ناقص میں اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر ہوتا "قطع تقریبِ عیادت نے کیا حالِ زبوں"۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ذیل میں آپ کے کلام کا انتخاب درج کیا جاتا ہے :-

جس روز حرفِ عشق ہم آہنگِ صور تھا — اے مشتِ خاک تجھکو تامل ضرور تھا

اِک حرفِ شوق لاکھ زبانوں میں جا پڑا — وردِ ملک تھا جو وہی شورِ طیور تھا

آخر ہوائے گلشن لائی قفس میں ہم کو — شوقِ نظارۂ گل جاسوسِ دام نکلا

اے لطفِ چارہ فرما تدبیر اسکی ہو کیا — جو ہے علاج دل کا آزار ہے وہ جاں کا

سخت دشوار ہے آسان کا آساں ہونا — خونِ فرصت ہے یہاں سر بگریباں ہونا

ہوگی حشر تک سیری شہیدوں کی شہادت سے — کہ آب تیغ اِک قطرہ ہے بحرِ آشنائی کا

محبت وہ ہے جس میں کچھ کسی سے ہو نہیں سکتا — جو ہو سکتا ہے وہ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا

اپنے ویرانہ سے اب ہیں خرابی کو ہے بیم — بے سروسامانیوں کا میری ساماں دیکھنا

اُڑتا نہ تھا خزاں میں کہ طاقت رہی درست — اور فصلِ گل جب آئی گرفتار ہوگیا

کوئی تو زخم ہے کہ جگر خون ہو چلا — کوئی تو خار ہے کہ دل افگار ہوگیا

لذتِ قتل سے مقتل کو بھی بسمل دیکھا ذرّہ ذرّہ کا تڑپنا روشِ دل دیکھا
وہی میں وہی فلک وہی عدو وہی نصیب جانے کیا حادثہ ہے کیوں وہ مرے گھر آیا
برقِ خرمن ہے کبھی آتشِ دامن ہے کبھی کس کی شوخی کا اثر اے دلِ مضطر آیا
گر فلک تجھکو خوار ہونا تھا میرا مشتِ غبار ہونا تھا
ہائے کس کس فریب سے مارا عاشقِ روزگار ہونا تھا
بہر آبادی ہے ہم خانہ خرابوں کی طلب کوئی گھر خلد کی مانند نہ ویراں ہوگا
کیوں نہ ہم پہ کھل جاتا پہلے ہی مآل اپنا شوق و ذوق میں لیکن کس کو تھا خیال اپنا
فریب وعدہ سے ظالم نے بیقرار کیا غضب کیا کہ تصور کو انتظار کیا
کہاں تھے اہلِ حرم اہلِ دیر سے پوچھو بتوں کے جلوہ نے کعبہ کو سنگسار کیا
خود دیکھ خودی کو او خود آرا پہچان خدا کو بھی خدا را
تھے کعبہ میں بھی اپنے ہی یارانِ روشناس تھا کون سا کہ راندۂ دیرِ مغاں نہ تھا
آیا وہ دیکھنے کو دمِ نزع اے قلق کس طرح ہو یقین کہ وہ بدگماں نہ تھا
آخر آخر راہ تیری دیکھتے ہی دیکھتے رفتہ رفتہ ختم دورِ آسماں ہو جائیگا
پردہ داری عشق میں پردہ دری سے کم نہیں میرا اندازِ خموشی خود فغاں ہو جائیگا
حیف دستِ دعا و دامنِ ناز خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا
کیا آشیاں بتائیں کہاں تھا کہاں نہ تھا تھا جلوہ گر فریبِ نظر گلستاں نہ تھا
محشر اگر ہے اور کوئی چیز تو غلط اک نقشِ پا ہے فتنۂ رفتارِ یار کا
بے اختیار کیونکہ نہو اختیارِ عشق بے اعتباریاں ہیں سببِ اعتبار کا
ابھی سپہر سے کیا کیا نزول ہونا ہے کہ زخمِ دل میں ہے انداز مسکرانے کا
مرناں بھی تو ارماں کے برابر نہیں ہوتا پاتے ہیں اگر آپ تو خنجر نہیں ہوتا
قدردانِ دوست اب وہ شوخِ پُرفن ہو گیا میں ہلاکِ شیوۂ اندازِ دشمن ہو گیا
انجام کچھ نہیں مرے آغاز کا مگر کس کام کی یہ زیست کہ ہر کام ہے عبث
شامِ فراق موت ہے صبحِ وصال حشر دل دیکھئے زندگی تو ہے مشکل سبھی طرح
ساقی کی نظر گر ہے یونہی ردو بدل پر میخانہ بنے گا کبھی مسجد کے محل پر
ہوتا نہ کوئی دیکھئے خدائی کو بھی راضی دینے کا یقیں کیونکہ ہو قسّامِ ازل پر

ڈوبا ہی چاہتا ہے امید کا سفینہ — طوفاں اٹھا رکھا ہے دل نے رُلا رُلا کر
لیگا کیا وادیِ وحشت سے تو اُکتا پھر کر — کہ وہیں جاتا ہے ہر سمت سے رستا پھر کر
وہ پھر رہے ہیں آنکھ میں لیکن نظر سے دُور — شوخی تو دیکھیے کہ وہ گھر میں ہیں گھر سے دُور
آغاز کی خبر ہے نہ انجام پر نظر — شوقِ گریز پا نے کیا راہبر سے دُور
واعظ وہیں کٹے گی شبِ ہجر سچ بتا — جنت مقامِ امن ہے خوف و خطر سے دُور
میکدہ دیکھ کے جنت کو نہ بھول — حرص سے بندِ قناعت مت توڑ
اِس قدر ہو گئے ہم زیست سے ناچار کہ بس — چارہ سازوں سے طبیعت ہے یہ بیزار کہ بس
جا اب اے حسرتِ دیدار نہ دیکھا کیا کیا — بیٹھ اب اے ہوسِ شوقِ در یار کہ بس
کیا ہی بھولے ہیں دلربائی پہ — دیدیا دل کو جان کر افسوس
ہم اور اس طرح سے کریں غیر کا لحاظ — اِن بے لحاظیوں پہ بھی تیرا رہا لحاظ
بتوں کا جو نہو ساجد عبادت کو وہ کیا جانے — نہو رحمت کا جو قائل مے و ساغر سے کیا واقف
دیکھیے اس کا ہو گا کیا انجام — اب خدا سے ہمیں ہوا ہے عشق
مہمانِ جہاں تھے ایک شب کے — شام آئے تھے اور سحر گئے ہم
جو رشکِ ذوق کو پہلے سے جانتے ہوتے — نگاہِ شوق کو یوں آشنا نہ کرتے ہم
نقشِ بر آب نام ہے سیلِ فنا مقام — اس خانماں خراب کا کیا نام کیا مقام
طرزِ نگہ یہ جامہ سے باہر نقاب میں — رسوائیاں حجاب طلب ہیں حجاب میں
طرزِ ادائے ناز ہے ہر شیوۂ ستم — میں محوِ التفات وہ بیخود عتاب میں
جیتے بیجان ہیں اور مرنے کو جاں رکھتے ہیں — کیا ہی بیتاب و تواں تاب و تواں رکھتے ہیں
نالہ کیا نہیں ہے کہ وہ بیقرار ہیں — بے اعتباریوں کے بڑے اعتبار میں
اُنھیں پھر امتحاں یاد آ گیا میدانِ محشر میں — مگر دادِ ستم بیداد تھی میرے مقدر میں
ظلم کی قدر کے لئے ہے رحم — داد کچھ بہر داد خواہ نہیں
نکالو ہم کو زنداں سے کہ آبادی ہو زنداں میں — ہم آئے کُنجِ زنداں میں بہار آئی گلستاں میں
وہ صیاد آیا ابر آیا وہ کوندی برقِ ناشدنی — بنایا آشیاں اور آفتیں ٹوٹیں گلستاں میں
اُمید جتنی گھٹتی ہے بڑھتی ہے آرزو — کس دردمند کا دلِ امیدوار ہوں
مرا غم عشرتِ رفتہ کا نغمہ ہے — کہ مثلِ گردِ بوئے کارواں ہوں

چُپ رہنے کا مقام ہے خاموش اے قلق
اُس کو ہی کچھ خبر ہے جسے کچھ خبر نہ ہو

ہماری پرسشِ اعمال اور بحثیں فرشتوں سے
ملے ہیں کیا ہی اہلِ دل محبت کی گواہی کو

خودی سے تا بخدائی سبھی تو بھول گئے
بنایا کس کے تغافل کا یادگار مجھے

کیا سرکشی پسند ہمارا نیاز ہے
لو شرمسار سب کی نگاہوں میں ناز ہے

نہ جائے حج کعبہ کو جو رہبر دیر کو سمجھے
نہ چومے سنگ اسود کو جو طرزِ نقشِ پا جانے

کوئی کیسا ہی ثابت ہو طبیعت آ ہی جاتی ہے
خدا جانے یہ کیا آفت ہے آفت آ ہی جاتی ہے

وہی شوقِ راہ ہے رہنما وہی جلوہ گاہ ہے رخ کشا
وہی بزمِ ناز ہے جابجا وہی ہر قدم پہ مقام ہے

مجکو اس جرم پہ مارا کہ گنہگار نہ تھا
اُس نے یہ لطف کیا مجھ پہ جفا سے پہلے

سر پہ بہار آئی اور آشیاں کو توڑا
یہاں بیٹھنے کی فرصت لائینگے ہم کہاں سے

جو دلبر کی محبت دل سے نکلے
تو تُوں امید لاحاصل سے بدلے

سامان عیش و ناز ہے آزارِ جاں مجھے
لایا ہے تیرا شوق کہاں سے کہاں مجھے

اے قیامت تو اُٹھ کے پوچھ مزاج
ہیں وہ کچھ آپ ہی خفا بیٹھے

# رموزِ زندگی

(از مسٹر منوہر لال طالب، بی۔اے۔ ایل ایل بی)

ریاضِ زندگی وقفِ خزاں ہے
فنا مرغِ بقا کا آشیاں ہے

طلبگارِ حیاتِ جاوداں سن
فنا کے گھر حیاتِ جاوداں ہے

مرے اشکِ ندامت ہیں ستارے
انہی سے زندگی کی کہکشاں ہے

بہارِ باغِ دل ہے ان کے دم سے
مزین اِن سے ہی یہ گلستاں ہے

بہارِ جاوداں کو اس کا کیا ڈر
خزاں پروردۂ بادِ خزاں ہے

ہماری خامشی ہے رشکِ گویائی
ہماری بے زبانی ہی زباں ہے

عیاں سوزِ نہاں ہو کر رہے گا
کبھی دردِ نہاں رہتا نہاں ہے

مرے اللہ! یہ کیا میرا ہی گھر ہے!
قفس ہے یا قفس میرا آشیاں ہے

زبانِ داستانِ زندگانی
بیانِ طالبِ شیوا بیاں ہے

# شاہی حولدار

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

مرزا عنایت علی بیگ ایک شریف جوان قوم مغل لکھنؤ ستھ کھنڈہ میں قریب حسین آباد رہتے تھے۔ شاہی زمانہ تھا جان عالم مرزا واجد علی شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں حولدار تھے، اور اسی نام سے مشہور تھے۔ حولدار صاحب ابھی جوان تھے کہ سلطنت میں زوال آگیا اور چھ مہینے کے بعد غدر ہو گیا انگریزی حکام نے کچھ انعام دیکر سب چوکی کے سپاہیوں کو برطرف کر دیا اور اُن سے تلواریں رکھوالیں۔ حولدار صاحب خانہ نشین ہو گئے، گھر پر ڈنڑ پیلنا یا لیزم ہلانا، شام کو درویشوں کی زیارت کو جانا، پانچوں وقت کی نماز پڑھنا، وظیفہ وظائف میں شب گذاری کرنا یہی کام تھا۔ قوی ہیکل آدمی تھے، برس دو برس کی کسرت میں توپ کے توپ بن گئے۔ بے فکری کی روٹی تھی اور آزادی، دو ہی چیزیں آدمی کی تیاری کا باعث ہوتی ہیں۔ غدر کے بعد سے ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کوئی درویش کامل ملجائے تو فکر معاش سے بھی آزادی ہو کیونکہ خدا کا دیا سب کچھ تھا مگر گھر میں بیٹھے بیٹھے کھانے سے خزانے بھی خالی ہوجاتے ہیں اُن کی دولت کی کیا حقیقت تھی۔ اس خیال سے جتنے فقیر ملتے تھے اُن کی خدمت بقدر لیاقت بہت کچھ کرتے تھے۔ مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ۔ ایک دن دیکھا کہ ایک فقیر جاتا ہے صورت شکل سے شریف معلوم ہوتا ہے۔ ایک مٹی کی ہانڈی ہاتھ میں لئے ہوئے دُکان دُکان بھیک مانگتا ہے جو کچھ ملتا ہے ہانڈی میں رکھ لیتا ہے محلہ میں گھر گھر جاتا ہے آٹا۔ روٹی۔ چاول۔ دال۔ چنے جو ملتا ہے اُسی ہانڈی میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح رات کو آٹھ نو بجے تک ہر دروازہ پر بھیک مانگی اور پھر اپنے گھر کی طرف چلا۔ یہ بھی پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور کہا بابا کیوں ہم فقیروں کو جو بھیک مانگتے ہیں گھیرتا ہے۔ اگر تم کو کسی درویش سے ملنا ہے تو اُن کی تلاش کرو ہم بھیک مانگنے والوں سے ملکر تجکو کیا فائدہ ہوگا۔ حولدار اِس درویش کے قدموں پر گر پڑے اور کہنے لگے کہ حضور میں نے دس برس تک فقیروں کو ڈھونڈھا آج تک کوئی ایسا نہیں ملا جو میرے منشاء کے موافق ہوتا۔ دنیا جعل سازوں کی ہے اور فقیر ناپید ہیں۔ اس وقت خیال میں آیا کہ کچھ دن آپ کی خدمت میں رہکر کچھ فیض حاصل کروں۔ درویش نے کہا بابا تو ہمیشہ غلطی میں پڑا رہیگا، بھلا میری خدمت سے تجھے کیا

فیض ہوگا جو خود بھیک منگے ہیں وہ کسی کو کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں، اس خیال کو دل سے نکال ڈال اور کسی کامل فقیر کو ڈھونڈھ جو کسی سے کچھ نہ مانگتے ہوں۔ حوالدار نے ہاتھ جوڑ کر کہا میرا دل چاہتا ہے کہ آج آپکا دولت خانہ دیکھ لوں اور اجازت دیجئے تو میں شام کو خدمت میں حاضری دیا کروں۔ فقیر بولا، بابا تیری مرضی، یہ پیچھے پیچھے ہوئے۔ فقیر بڑے امام باڑے کے دروازے کے پھاٹک کے اندر جاکر دریا کی طرف مڑا اور ٹیلے والی مسجد کے عقب میں ایک چھپر پڑا ہوا تھا، اس میں گیا ایک چیلا وہاں بیٹھا ہوا تھا، اُس نے تعظیم دی۔ فقیر نے اس ہانڈی کو جس میں پیسے کوڑیاں دال۔ چاول۔ روٹی۔ گوشت پکا کچا بھرا ہوا تھا چولھے پر چڑھا دیا۔ اور آپ یہ کہکر چلا گیا کہ ذرا دریا میں نہا آؤں، گھنٹہ بھر میں واپس آیا تو ایک مردے کو کندھے پر لادے ہوئے تھا۔ اُسے لاکر سرو قد کھڑا کر دیا۔ اتنے میں کھانا پک چکا تھا اور فقیر کے پاس دس پانچ آدمی بھی آگئے تھے۔ فقیر نے پوچھا" بابا تم کیا کھانا چاہتے ہو، ایک نے کہا پلاؤ، دوسرا بولا روٹی سالن، تیسرے نے کہا کھچڑی، چوتھے نے کہا پوری کچوری۔ حولدار صاحب سے پوچھا، اُنھوں نے کہا حضور جو دیں مگر پیٹ بھر دیں، کہا جو تمھیں پسند ہو، کہنے لگے قورمہ چپاتی۔ اُس نے تھوڑا تھوڑا سب کو اسی قسم کا کھانا جیسا وہ مانگتے تھے دیا اور اُسی ہانڈی سے دیا۔ حولدار صاحب کو بھی چار روٹی اور قورمہ دیا، سب کو مٹی کے برتن میں دیا۔ حولدار کہنے لگے حضور اس میں کیا ہوگا آدھ سیر کی خوراک ہے۔ کہنے لگے اچھی طرح پیٹ بھر کے کھاؤ کچھ تکلف نہ کرو پک رہا ہے۔ سب نے کھانا شروع کیا اور سب نے خوب جھک کر کھایا۔ حولدار صاحب نے مشکل سے دو چار چپاتیاں کھائیں درویش نے کہا بابا اور کھانا تیار ہے تکلف نہ کرو۔ حولدار نے ہاتھ باندھکر کہا ہمیشہ گھر میں کونڈے میں سالن بھر کر روٹی کھاتا تھا آج یہ چار چپاتیاں پندرہ سیر کی معلوم ہوئیں اور مشکل سے کھائیں گئیں، اب بالکل نہیں کھا سکتا۔ جب سب کھا چکے تو فقیر نے اس مُردے کے سامنے کچھ کھانا رکھدیا وہ کھا چکا تو کہنے لگا کیا حکم ہے۔ کہنے لگے اب جاؤ ضرورت لگے گی تو تم کو بلا لونگا وہ بھی چلا گیا تب فقیر نے اور اُس کے چیلے نے کھانا کھایا اور ہانڈی دھوکر اوندھا دی سب لوگ سلام کرکے چلے گئے۔ حولدار بھی اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن شام کو نو بجے گئے تو دیکھا فقیر آیا ہے اور اسی طرح ہانڈی چولھے پر چڑھا رہا ہے۔ اُنھوں نے گستاخی کرکے پوچھا حضور کا اسم گرامی، کہنے لگے فقیر، انھوں نے کہا آپ کا مشہور نام کیا ہے، کہا جب ہم پیدا ہوئے تو دہلی میں تھے۔ والدین نے اعلیٰ جاہ نام رکھا تھا اور اسی نام سے سب پکارتے تھے

اسی طرح نہانے گئے اور دریا سے ڈھونڈھکر ایک لاش کندھے پر لادکر لائے اور اُسے کھڑا کردیا، کھانا پکایا سب نے کھایا، اُس وقت ایک ہندو آیا، قدموں پر گر پڑا کہنے لگا تین دن سے میری لڑکی گیارہ برس کی غائب ہے، پرسوں اشنان کرنے گومتی پر گئی تھی واپس نہیں آئی اور کچھ پتا نہیں ہے سارا شہر ڈھونڈھ مارا کہیں نہیں ملی۔ آپ نے کہا بیٹھو، جب اُس مُردے کو کھانا دیا اور وہ کھاچکا اور کہنے لگا کیا حکم ہوتا ہے۔ آپ نے کہا اس کی لڑکی ابھی ابھی ڈھونڈھ کر لادو، وہ گیا اور پندرہ منٹ میں لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لایا اور اُس کے حوالہ کر کے چلا گیا۔ پھر حولدار بھی سلام کر کے گھر چلے آئے۔ تیسرے دن حولدار صاحب کچھ مٹھائی لیکر گئے اور کہا مجھے مُرید کر لیجیے، بمشکل تمام فقیر نے مرید کیا اور انھیں کچھ وظائف تعلیم کئے۔ اُن سے پہلے جو چیلا مرید تھا اُسے یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی اور اُن سے رشک وحسد کرنے لگا۔ اب رات دن حولدار بھی اعلیٰ جاہ کی خدمت میں رہنے لگے۔ ڈنڑ پیلتے تھے لیزم ہلاتے تھے گھنٹہ دو گھنٹہ گھر ہو آتے تھے۔ اعلیٰ جاہ کو بھی ان سے محبت ہوگئی۔ ابھی کچھ دنوں شاہ صاحب کی خدمت کی تھی کہ دفعتاً شاہ صاحب بیمار ہوگئے ہزاروں آدمی اُن کی عیادت کو آئے اور شہر کے نامی طبیب علاج کرتے تھے۔ اعلیٰ جاہ نے حولدار کے کان میں کہا، میں دہلی کا باشندہ ہوں اور صابریہ خاندان کا مُرید ہوں، اکبر شاہ ثانی کا بیٹا ہوں۔

سات روز کے بعد شاہ صاحب نے انتقال فرمایا، جنازے میں خدا جانے کہاں کہاں کے لوگ شریک تھے۔ سب سے زیادہ غم مرزا عنایت علی بیگ حولدار کو ہوا۔ شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر دفن ہوئے۔ تیجہ کے بعد سے دونوں مرید اسی چھپر میں رہنے لگے، کچھ لوگ کھانا لاتے تھے مگر اس میں ان کا بھلا نہ ہوتا تھا اور پہلا چیلا جو کچھ ملتا چھپا رکھتا جو اُن کے سامنے ملتا اُس میں یہ بھی شریک ہوجاتے تھے۔ مرزا صاحب کو پھر فقرا کی تلاش ہوئی اور کوئی فقیر نہ ملا۔ ایک دن پہلے چیلے نے اُن سے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو تو ایک فقیر دکھائیں، اپنے ساتھ شہر سے باہر ایک جنگل میں لے گیا اور وہاں پہونچکر کہنے لگا اب تم آنکھ بند کرلو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھ نہ کھولنا، اور دھوپ میں اُن کو کھڑا کردیا۔ تھوڑی دیر میں یہ پسینے پسینے ہوگئے۔ گرمی کی شدت سے بیقرار ہوگئے، اُن کو پیاس لگی تھی آنکھیں کھول دیں دیکھا تو وہ چیلا کہیں نہیں ہے۔ آگے بڑھے تو دیکھا کہ بہت سی سبیلیں رکھی ہیں، ایک سبیل پر گئے اور پانی پینا چاہا اُس نے کہا ٹھہریئے ٹھہریئے کھانا کھا لیجیے تو پانی ملیگا۔ یہ آگے بڑھے اور دوسری سبیل پر پانی مانگا تو اُنھوں نے شراب دی، نہیں پی اور بیچارے بھوکے پیاسے جنگل میں دن بھر مارے مارے پھرے، کوئی آدمی نہیں ملا جس سے پتہ پوچھتے آخر مارے مارے پھرنے لگے۔ ایک باغ

ملا اُس کے پھاٹک میں قدم رکھا تو دیکھا بڑا بھاری دربار لگا ہوا ہے اور ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے، یہ ڈر کر واپس آنے لگے۔ اس شہزادے نے آواز دی، اے مسافر کہاں جاتا ہے یہ واپس آئے شہزادہ نہایت کمسن و شیریں زبان تھا۔ انھوں نے اپنا حال بیان کیا کہ میں بیچارہ مسافر آفت کا مارا ہوں، یار و احباب سے دُور بھوکا پیاسا اس جنگل میں دن بھر مارا مارا پھرا۔ ایک آدمی دھوکے سے لایا اور چھوڑ کر چلا گیا، مکان لکھنؤ حسین آباد قریب ستھ کھنڈے کے ہے۔ اس نے رحم کھا کر کہا کہ اس غریب کو کھانا کھلاؤ پانی پلاؤ پھر ہمارے پاس لاؤ، عمدہ عمدہ نفیس نفیس کھانے کھائے برف کا پانی پیا، پھر شہزادے کے پاس آئے۔ پوچھا تمھارا نام کیا ہے، حولدار نے کہا مجھے مرزا عنایت علی بیگ کہتے ہیں شاہی میں حولدار تھا اب بے روزگاری میں مبتلا ہوں۔ حضور نے اس غریب پر مہربانی فرمائی ہے تو اس حقیر کو گھر پہونچا دیجیے اور حضور اپنا حال کچھ بتا دیجیے تو کمال بندہ نوازی ہے کہ آپ اتنے بڑے شہزادے ہو کر اس جنگل میں کیوں رہتے ہیں۔ اُس نے کہا سن ای آدم زاد میں جِن ہوں، ہوا کھانے یہاں آیا ہوں۔ اب تجھ سے ملاقات ہوگئی ہے تو ہر مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور تم سے ملنے آئیں گے۔ جو ضرورت ہو ہم سے کہنا، پھر اُس نے کہا تم اس نیم کی ٹہنی پکڑ لو یہ درخت تم کو تمھارے گھر پہونچا دیگا، اسی وقت اپنے مکان پر پہنچ گئے اور شہر میں رہنے لگے۔ نوچندی جمعرات بارہ بجے شب کو شہزادہ جِن مع خدم و حشم اُن کے مکان پر آیا اور آدھ گھنٹہ اُن سے باتیں کرتا رہا اور پانچ اشرفیاں اُن کو دیں، اسی طرح ہر نوچندی کو آتا تھا اور کہہ گیا تھا کہ تم پریشان نہ ہو تم کو سرہانے سے ہر صبح کو ایک اشرفی روزانہ ملا کریگی، چنانچہ روز ایک اشرفی ملتی تھی اُن کا بھی اچھا ساز و سامان پیدا ہو گیا۔ محلہ میں ایک غریب آدمی تھے اُن کی دو لڑکیاں تھیں اور اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ مرزا صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے آپ کے یہاں رات کو یہ کون آتے ہیں جن کے ساتھ آٹھ دس گھوڑے ہوتے ہیں۔ مرزا نے بہت حیلہ حوالہ کیا کہ کوئی نہیں میرے ایک دوست ہیں وہ کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ اُنھوں نے ان کو بہت سی قسمیں دیں تو قبول دیئے کہ جن کا شہزادہ ہے۔ انھوں نے کہا ابکی آئیں تو ہم سے بھی ملاقات کرا دیجیے گا نوچندی کا وعدہ کیا انھوں نے عطر لوبان اور قسم قسم کی مٹھائیاں جمع کر رکھی تھیں اور اُس نے منع کیا تھا کہ خبردار ہمارا حال کسی سے نہ کہنا نہیں تو تمھارے یہاں نہیں آئیں گے۔ اُس دن جو آیا تو میر صاحب بھی آئے اور جھک کر اُسے تسلیم کی۔ وہ دیکھ کر ہکا بکا ہو گیا اور دل میں مرزا جی سے بہت ناخوش ہوا۔ میر صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ہمارے غریب خانہ پر دو منٹ کے واسطے

تکلیف فرمائیے وہ مجبور ہوگیا اور میر صاحب کے مکان پر آنا پڑا، میر صاحب نے ہر طرف عطر سے مکان بسا دیا، ہر قسم کی مٹھائیاں اور میوہ جات پلیٹوں میں چُنے تھے، اُن کی جوان لڑکی نے انھیں عطر بھر بھر کے لگایا، منت کرکے کچھ میوہ اور کچھ مٹھائی کھلائی اور شہزادے سے اقرار لیا کہ نوچندی کو ہمارے یہاں بھی آیا کیجئے اور ہم لوگ بہت غریب ہیں کچھ ہمارے لئے بھی مقرر کردیجئے۔ اُس نے سَو اشرفیاں اُسی وقت دیں اور کہا تم کو دس اشرفیاں روز ملیں گی، اُن کی لڑکی بہت حسین تھی اُسے دیکھکر عاشق ہوگئے۔ اُسی دن سے اُس کا آنا مرزا صاحب کے یہاں بند ہوگیا اور وہ سرہانے سے اشرفیاں نکلنا بھی بند ہوگیا۔ فاقہ پر فاقہ کرنے لگے، میر صاحب سے ہرچند منت کی، اُنھوں نے کہا وہ ہمارے یہاں نہیں آتے، سال بھر میں بڑی بڑی عمارتیں میر صاحب نے بنوالیں، بہت سے نوکر رکھے، امیر کبیر ہوگئے، آپ کو لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی، کسی اچھے خاندان اور امیر گھر میں شادی ٹھہری، منگنی ہوگئی، بیاہ کی تاریخ ٹھہر گئی۔ ایک ماما نے جو اُن کے گھر میں نوکر تھی اُس نے کہا کہ بیوی میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ تم اس لڑکی کی شادی نہ کرنا نہیں تو تمھارا سارا خاندان تباہ ہوجائیگا۔ بی بی خفا ہوئیں اور کہنے لگیں مُردار تو بدشگونی کرتی ہے، میری خوشی کا دن نہیں دیکھ سکتی ہے، میں تو شادی کرونگی۔ اُس نے کئی دفعہ کہا بیوی ہرگز شادی کا نام نہ لو نہیں گھر تباہ ہوجائیگا، میں خواب دیکھ چکی ہوں۔ بیوی نے کہا تو بکا کر مجھے کون روک سکتا ہے۔ جب شادی کا ایک دن باقی رہ گیا تو خوب موسلادھار پانی برسا۔ اُسی رات کو نیا مکان نیو سے گر پڑا اور گھر بھر اُسی میں دفن ہوگیا ایک نہ بچا سب کی جان گئی، مال گیا گھر میں ایک آدمی نہ رہا جو اِن غریبوں کا ماتم کرتا عزیزوں نے سب مال اپنے قبضہ میں کرلیا۔ دو چار دن فاتحہ دلوا کر مکان چھوڑ دیا کہ اسمیں آسیب ہے ایک عزیز نے اُسی مکان کو لیکر بنوایا اور چاہا اُس میں رہیں، مکان میں رات بھر کھٹ پٹ دھڑام کی آواز آیا کی، اور سب کُنڈیاں آپ سے آپ کھُل گئیں، کبھی سارے گھر میں روشنی ہوگئی کبھی گھر کے سب چراغ بجھ گئے، کبھی بیل گائے دوڑتے نظر آئے، کبھی گو کی ہانڈیاں گرنے لگیں۔ آخر دوسرے دن بھاگے۔ جس کرایہ دار کو رکھتے وہ دوسرے دن بھاگتا تھا، آخر مکان مفت دیتے تھے اور کوئی رہنے پر راضی نہ تھا، خالی پڑے پڑے منہدم ہوگیا ابتک کھنڈر پڑا ہوا ہے۔ مرزا صاحب یعنی حولدار صاحب بہت پریشان ہوگئے۔ ہزاروں تعویذ ہزاروں عمل کئے شہزادہ جن سے پھر ملاقات نہ ہوئی، بیچارے فاقے پر فاقے کرتے تھے اور جو کچھ رقم کسی سے ملجاتی تھی وہ عاملوں تعویذوں نجومیوں کو دیدیتے تھے، سب طرح ہار چکے تو پھر فقرا کا پیچھا کیا۔ ایک مرتبہ اُن کے یہاں ایک فقیر

آیا، اُس نے کہا ہمیں حقہ پلا۔ اُنھوں نے کہا میں نے خود آج تک حقہ نہیں پیا میں کہاں سے لاؤں، مجھ سے پیسہ لے لیجیے بازار میں پی لیجئے گا۔ اُس نے کہا نہیں تو اپنے ہاتھ سے حقہ بھرے گا تو ہم پئیں گے مجبور ہو گئے، محلہ سے مدریہ حقہ مانگ لائے، پیسہ کا تمبا کو لائے، توا جما کر شاہ صاحب نے پیا اور ایسا دم مارا کر لَو دینے لگا۔ چلتے وقت کش کے دو دم مار کے کہہ گئے اپنے ہاتھ سے چلم اُلٹ دینا۔ فقیر ابھی چند قدم گیا ہوگا کہ اُنھوں نے چلم اُلٹی تو اُس میں سے سونے کی گلی نکلی، فوراً چلم کو پھینک کر اُس کے پیچھے دوڑے اور اُسے گھر پر لائے، کہا مجھے بھی نسخہ بتا دیجئے، وہ کہنے لگا تیری قسمت میں اکسیر نہیں ہے تو کیا کرے گا۔ یہ کہکر اُس نے اپنی دھوتی سے ننانوے اشرفیاں گرائیں اور اُن کو دیکر چلا گیا۔ بیچارے نے بقیہ عمر اسی ننانوے اشرفیوں میں عزت سے بسر کر دی۔ منھ سے بہت کم بولتے تھے، لالہ بڈا ایک بڑا چوک میں تھا صرف اُس کی دکان پر ایک پھاٹک کے قریب تن کر کھڑے ہو جاتے تھے، کسی سے بات نہیں کرتے تھے، شام کو چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ بڈھے ہو گئے، بیمار ہوئے تو بے انتہا دُبلے ہو گئے، بچنے کی امید نہ تھی، اچھے ہو گئے، اب جو کسی میلے یا عشرہ میں جانے کا اتفاق ہو جاتا تو روئی کے پہل بدن پر لپیٹتے، ڈنڑ پر روئی کے پہل لپیٹتے، جب خاصے موٹے تازے پہلوان معلوم ہوتے تھے تو مندیل نما ٹوپی سر پر رکھتے یا جامہ پہنتے، انگرکھا پہنتے، سرمہ لگاتے، اینٹھتے بَرَتتے ہوئے آٹھوں کے میلے میں کسی بلند ٹیلے پر تیور بدلکر کھڑے ہو جاتے، لوگ آوازے کستے "آدمی ہے یا شیرہ کا پیپا، آدمی ہے یا بن مانس، اور تن جا، یہ تو بالکل بے ٹوٹی کا بدھنا معلوم ہوتا ہے۔" مگر آپ منھ سے بولنا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح عیش باغ کے میلے یا عشرہ میں کربلا جاتے تھے اور کسی اونچے ٹیلہ پر چڑھکر اسی پیترے سے سات گھنٹے تک کھڑے رہتے تھے، ایک خدائی نے ان کو دیکھا اور لکھنؤ کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ان کو نہ جانتا ہو، بیاہ شادی میں لوگ اُن کی دعوت نہیں کرتے تھے اس لئے کہ آٹھ دس سیر کھا جائیں گے، اتنا کھانا کہاں سے آئیگا، صرف اُن کے گھر پر دو چار سیر کا پلاؤ جو میسّر ہوتا دے آتے، یہ بیچارے صبر و شکر کرکے کھا لیتے، یا روٹی سالن دے آتے، کوئی پوچھتا مرزا صاحب کم تو نہیں، کہتے بھائی کم تو ہے مگر شاباش ہے تم کو تم نے بڑی ہمت کی اور ہمارا خیال تو رکھا تم بہت اچھے آدمی ہو، سالن کونڈے میں بھر لیا روٹی توڑ کر اُسمیں ڈال لی، ملتے گئے اور کھاتے گئے کیونکہ بڈھے تھے دانت گر گئے تھے۔

مرزا صاحب بالکل معصوم صفت تھے، محلہ میں بہت لوگ اُن سے خوش تھے، کبھی کسی

سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوا، نہ کسی کو پریشان کیا۔ اُن کی شہ زوری کا ایک قصہ لوگ بیان کرتے ہیں، ایک رات برسات میں پانی بہت برسا، دیوار گر چکی تو شہتیر کھسکنے لگا۔ آپ اندر لیٹے ہوئے تھے فوراً شہتیر روک کر رات بھر کھڑے رہتے۔ جب صبح کو لوگ خیریت پوچھنے آئے، آپ نے کہا ذرا اس شہتیر کے نیچے اڑا نے لگا دو، لوگوں نے تعجب کیا، اور کہا مرزا صاحب آپ شہتیر رات بھر روکے رہے، آواز کیوں نہ دے لی، کہنے لگے تم لوگوں کو نیند میں کیا حیران کرتا۔ بڑھاپے تک آپ کی خوراک ڈیڑھ سیر کی تھی، کوئی ڈر کے مارے کبھی دعوت نہیں کرتا کہ آئیں گے تو ساری محفل کا کھانا چٹ کر جائیں گے، ایسے گوشہ نشین تھے کہ اسّی برس کی عمر میں مرے لیکن سب حولدار کہتے تھے نام کسی کو نہیں معلوم تھا۔ اُن کے مرے ہوئے تخمیناً چالیس برس ہوئے پرانے عیش باغ میں اُن کی قبر بنی ہوئی ہے جس کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد ہے، قبر پر مادۂ تاریخ تو نہیں ہے مگر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے۔

مرزا عنایت علی بیگ حولدار شہزور پہلوان انتقال ۱۳۲۲ھ

## خیر مقدم

(۱۱۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو بے روزگاروں کی تحقیقاتی کمیشن کے سلسلے میں علیگڈھ تشریف لائے تھے۔ اُن کی ادب نوازی اور مذاق ادبی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کی انجمن اُردوئے معلی کی طرف سے ایک ایٹ ہوم دیا گیا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی موصوف کے خیر مقدم میں ایک مختصر نظم کہنے کا موقع ملا۔ پارٹی میں دیگر ۔۔۔زین کے علاوہ نواب صاحب چھتاری بھی شریک تھے۔ اس سنگم کو نیک شگون سمجھکر پہلے ایک رباعی پیش کی گئی پھر یہ نظم جو ناظرین زمانہ کے نذر ہیں۔

احسن مارہروی

### رباعی

باشندۂ یک ملک ہیں، مسلم، ہندو — نواب چھتاری ہوں کہ وہ سر سپرو
اس یک جہتی کا یہ نتیجہ نکلا — اُردو، ہندی ہے۔ اور ہندی اُردو

### نظم خیر مقدم

دیس کی دُھن میں ہے آغازِ سرودِ زندگی — ہے جدا ہر ایک اندازِ سرودِ زندگی
بزمِ اُردوئے معلےٰ کو نہ ہو کیوں افتخار — آج ہے گویا وہ دمسازِ سرودِ زندگی
مقدمِ والا سے سر سپرو سے ہو کر سربلند — تا ثریا ہو بجی آوازِ سرودِ زندگی
ہو یہ تشریف آوری بے روزگاروں کو مفید — پائیے صحت طبع ناسازِ سرودِ زندگی
جن کا ہے بے روزگاروں سے الگ اک روزگار — ہیں قلم در کف وہ غمّازِ سرودِ زندگی
اُن کا مذہب یکدلی ہے اُن کا مسلک اتحاد — چاہتے ہیں ایک پردازِ سرودِ زندگی
صاف کہتے ہیں لگی لپٹی نہیں رکھتے ہیں کچھ — کیوں بنیں وہ رخنہ اندازِ سرودِ زندگی
ہم نوائی، ہم خیالی، ہم نشینی، ہمدمی — ہو علانیہ، یہ ہے رازِ سرودِ زندگی
قصہ کوتہ! ہم کہ ہیں شعر و ادب کے جاں نثار — ہیں بیک آہنگ جاں بازِ سرودِ زندگی

# مومن کی ایک غزل پر غزلیں

(از سید مظہر حسین صاحب اختر میرٹھی مرحوم)

بہادر شاہ بادشاہ کے وقت میں سلطنت برائے نام رہ گئی تھی لیکن بادشاہ شعر کے عاشق تھے۔ ظفر تخلص تھا اور خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے تھے کبھی کبھی دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا، اس کے بعد اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسے میں صحبتیں رہیں۔ نواب اصغر علی خاں اور شاہزادہ خدا بخش قیصر کے یہاں بھی گاہے ماہے شعر و سخن کے جلسے ہو جاتے تھے۔ ذوق، مومن اور غالب کا زمانہ تھا، ان میں ہر ایک عالی دماغی اور تخئیل کی بلندی میں ایک دوسرے سے فوقیت لے جانا چاہتا تھا۔

اس وقت کے شعرا اس پایہ کے تھے کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اب بھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ بہر حال اس وقت میں صرف "عذاب میں"۔ "خواب میں" کے ردیف قافیہ پر ان استادانِ فن کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مختصر دیوان میں عرصہ ہوا میں نے ایک شعر پڑھا تھا:۔

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

شعر کے قوی ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، اور پھر شعر بھی کس کا ہے حکیم مومن خاں کے شاگرد رشید کا جن کو استاد جان سے سوا عزیز رکھتے تھے اور جن کو بڑے بڑے استادوں نے استاد مانا ہے۔ اسی کے ساتھ مومن خاں مرحوم اور مرزا نوشہ غالب کی غزلیں بھی میرے دماغ میں تھیں۔ اتفاق سے پچھلے دنوں رسالہ مخزن کی پرانی جلدوں میں مرزا بسم اللہ بیگ صاحب بسمل دہلوی کا ایک سہ غزلہ نظر پڑ گیا، جس پر ایڈیٹر صاحب نے ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا ہے کہ:۔

"اس گئے گذرے زمانے میں بھی دتی اہل کمال سے خالی نہیں، مگر کمال یہ ہے کہ وہ دنیا سے بے پرواہ ہیں اور دنیا اُن سے بے پرواہ۔"

یہ عبارت ایسی مؤثر ہوئی کہ مجھے اِن تینوں غزلوں کو شروع سے آخر تک پڑھنا پڑا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بسمل نے اس ردیف قافیہ میں بعض شعر ایسے نکالے ہیں کہ دل لوٹ گیا۔ یہ سب غزلیں ملا کر اس زمین

میں ایک مختصر رسالہ تیار ہو سکتا ہے، لیکن اس زمانہ میں لوگوں کو شعراء کے دیوان اٹھا کر دیکھنے کا وقت کہاں، اس لئے ان چند غزلوں کا انتخاب پیش کرتا ہوں

مومن نے اس ردیف قافیہ میں دو غزلہ لکھا ہے، ان کا ایک مطلع اپنا جواب نہیں رکھتا، فرماتے ہیں:-

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

دوسرا مطلع ہے:-

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

استاد ذوق کا مطلع ہے:-

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

غالب کا مطلع ہے:-

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

شیفتہ کا مطلع ہے:-

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

بسمل دہلوی کا مطلع ہے:-

سو آفتوں سے امن ہے ان کو حجاب میں
سو فتنے ہیں بندھے ہوئے بندِ نقاب میں

چشم اشک میں ہوا اشک ہی چشم پر آب میں
دریا میں ہیں حباب تو دریا حباب میں

اس انتخاب کا ہر شعر اپنی اپنی جگہ بلند دکھائی دیتا ہے لیکن مومن کی بیساختگی اور نازک خیالی سب سے جدا ہے۔

"جواب" کے قافیہ کو مرزا غالب نے لکھا ہے:-

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

بسمل اس قافیہ کو لکھتے ہیں:-

پڑھتے اڑا کے خط کے یہ اک پرزہ لکھ دیا
لو اپنے سو خطوں کے یہ اک خط جواب میں

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی مرحوم جن کی درسی کتابیں سرکاری مدرسوں میں عرصہ تک

جاری رہیں اپنے ہمعصر شعراء کے مقابلے میں غزل بہت کم لکھتے تھے مگر اس ردیف میں اُن کا ایک شعر مجھے یاد ہے، ملاحظہ ہو:-

پیغامبر اشارۂ ابرو سے مرگیا　　پھر جی اُٹھے گا لب ہی اُٹھا دو جواب میں

غالب:-

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے رات بھر　　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

بسمل:-

آئیں کہاں وہ خانہ خرابوں کے گھر کہاں　　یا خواب تک نہیں کہ کبھی آئیں خواب میں

اِس قافیہ میں غالب کے تخیلات خواب سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ بسمل نے بھی حتی المقدور اپنے خیالات میں سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن غالب کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔

غالب:-

مجھ تک کب اُس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مومن خاں اور ذوق کا اس قافیہ پر کوئی شعر نہیں ملا، اور شیفتہ و بسمل غالب سے بہت دُور نظر آتے ہیں لہذا شراب پر غالب غالب ہے۔

مومن خاں اور غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

(مومن)

بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ چشم سے　　اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں　　بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں
تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی　　ہوویگا اجتماع شب ماہتاب میں
کھولا جو دفترِ گلہ اپنا زباں کیا　　گذری شب وصال ستم کے حساب میں

(غالب)

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے　　جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتا ہوں روزِ وصل و شب ماہتاب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

ذوق نے بھی اس پر دو غزلہ کیا سہ غزلہ لکھا ہوگا لیکن موجودہ دیوان میں صرف چند اشعار ملتے ہیں

جن میں سے ایک مطلع جو اوپر لکھا جا چکا ہے اُن کی اُستادی اور قادر الکلامی کے لئے کافی ہے۔

**شیفتہ**

سب اُس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے
جوں آفتاب و روشنی آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

**(بسمل دہلوی)**

نارا ستی بھی حسن ہے اپنے مقام پر
کاکل کا اور حسن بڑھا پیچ و تاب میں

گھر کا تو ذکر کیا ہے اگر اُس کا بس چلے
آنے نہ وہ خیال میں میرے نہ خواب میں

کُمھلا نہ جائیں پھول سے رخسار آپ کے
ہر دم نہ گھونٹ گھونٹ کے رکھو نقاب میں

دنیا ہے ایک خواب اور اس میں یہ زندگی
گویا کہ خواب دیکھ رہے ہم ہیں خواب میں

جس طرح مومن کا ایک مطلع اپنا جواب نہیں رکھتا اسی طرح اُن میں ایک مقطع :-

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

بھی نزاکتِ اضطراب میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

---

# غزل

**(حضرت باسط بسوانی)**

ہر نظر داستان ہے گویا
آنکھ اپنی زبان ہے گویا

گل فشاں یوں ہیں حضرتِ ناصح
آپ ہی کی زبان ہے گویا

جور کرتا ہے اس ادا سے حسن
عشق کا امتحان ہے گویا

پردۂ قوس میں سرا فلاک
کوئی ابرو کمان ہے گویا

سامنے میرے دل کیا پامال
صبر کا امتحان ہے گویا

خونِ ناحق نہیں سرِ دامن
ظلم کی داستان ہے گویا

جانستانئ تیشۂ فرہاد
اُس کے قصہ کی جان ہے گویا

کوئے قاتل کی سرزمیں کیا ہے
ظلم کا آسمان ہے گویا

کیا ہے باسط غزل سرائی میں
دردِ دل کا بیان ہے گویا

# مزدور کی موت

(از مسٹر عزیز الرحمٰن ایم۔اے)

یوں تو بیچارہ کلّو دن رات درد کے مارے کراہتا رہتا تھا، مگر اس روز بیماری نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ اس جواں مرد کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔ غریب نے بہتیرا مٹھیوں کو بھینچا، کئی لمحے تک نیچے کے ہونٹ کو دانتوں سے دبائے رکھا یہاں تک کہ دائیں جانب ایک مقام پر خون کی ایک باریک لکیر سی نمودار ہوگئی، مگر آنسو نہ رُک سکے۔ گرم گرم قطرے اُس کے زرد رخساروں پر بہ نکلے اُس کی گردن کی پُشت تر ہوگئی، اور اُس کے نیچے تکیہ بھی بھیگ گیا۔ پسلی کا درد اور پھر بغیر کسی خاص علاج کے کامل ایک ماہ تک اُس کو برداشت کرنا اُسی کی ہمت اور اُس کے استقلال کا کام تھا۔ اگر اُس کی جگہ کوئی اور اس مہلک مرض میں مبتلا ہوتا تو ابتک سپرد خاک بھی ہو چکا ہوتا مگر جسمانی طاقت بیماری کا کہاں تک مقابلہ کرتی! آخر اُسے دشمن کے سامنے سر خم کرنا ہی پڑا

خدا کی ذات اور ضعیف ماں کے سوائے کلّو کا دنیا میں کوئی اور سہارا نہ تھا۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا تھا۔ مزدوری! آہ، اس لفظ سے ہی مایوسی ٹپکتی ہے صبح سے شام تک شدید مشقت کرنا اسکا روزانہ معمول تھا۔ گرمی ہو یا سردی، اُس کے لئے دونوں برابر تھے۔ دھمکیوں اور طعن و تشنیع کو بے چون وچرا سہنا اُس کی روزمرہ کی زندگی کا ضروری جزو تھا۔ بسا اوقات اُسے جسمانی سزائیں بھی برداشت کرنی پڑتی تھیں

کلّو اپنی بوڑھی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، ماں کی محبت سے کون واقف نہیں، ضعیفہ دن رات دل وجان سے اُس کی تیمار داری کرتی تھی۔ یہ بھی کبھی جوان تھی، کبھی خوش قسمت تھی کیونکہ اُسے ایسا شوہر ملا تھا جو اُس کی خوشنودی کو ہر بات پر مقدم رکھتا تھا اور خدا نے اُسے ایک چاند سا بیٹا بھی عطا کیا تھا۔ مگر زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی، خصوصاً خوشی کا زمانہ بہت جلد گذر جاتا ہے۔ ابھی کلّو پورے چار سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُس کی ماں بیوہ ہوگئی، شوہر جو کچھ کماتا تھا وہ اپنی بیوی اور بیٹے پر خرچ کر دیتا تھا، اس لئے اُس کی وفات پر گھر میں کچھ نہ بچا۔ مگر غیور بیوہ نے کسی دوسرے کی بیوی بننا گوارا نہ کیا۔ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی رہی، وقت گزرتا گیا، لڑکا

بڑا ہو گیا۔ جب محنت مزدوری کر کے کچھ کمانے کے قابل ہوا تو اُس نے اپنی ماں کو محنت مشقت سے نجات دلائی محلّے میں ایک ساہوکار کے گھر کے ساتھ ایک چھوٹی سی خراب و خستہ کوٹھری خالی پڑی تھی، وہ اُس نے کرایہ پر لے لی اور وہیں دونوں رہنے لگے۔ اسی کوٹھری میں ضعیفہ ماں اب کلّو کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔ دن رات بیٹے کی چارپائی کے پاس ایک چھوٹی سی کھاٹ پر بیٹھی رہتی، پاؤں دباتی، پنکھا جھلتی، اور اُن باتوں سے جو صرف ایک ماں ہی جان سکتی ہے اُسے دلاسا دیتی۔ مگر ایک افلاس زدہ گھر میں جہاں کچھ کھانے کو بھی نہ ہو ایک مریض خواہ وہ کتنا ہی شہ زور ہو مرض پر کیسے غلبہ پا سکتا ہے؟ بڑھیا نے محلّے کے ایک دو گھروں سے منت سماجت کر کے کچھ اُدھار بھی لیا، مگر وہ سب ختم ہو گیا اور کلّو چارپائی سے اُٹھنے کے قابل بھی نہ ہو سکا۔

( ۲ )

رات تاریک اور اُداس تھی، سیاہ آسمان پر بے شمار ستارے انسان کی بے بسی پر ماتم کرتے کرتے زرد ہو چکے تھے، زرد اور بے رونق۔ بالکل ٹمٹماتے ہوئے چراغِ سحری کی مانند۔ کلّو کی کوٹھری میں ایک دھندلا سا چراغ تاریکی پر غلبہ پانے کی کوشش میں کانپ رہا تھا۔ مریض کی آنکھیں بند تھیں، یکایک برابر والے مکان میں کچھ آہٹ ہوئی۔ مریض کی آنکھیں کھُل گئیں۔

"اماں!"

"ہاں بیٹا"۔ بڑھیا نے اپنی کھاٹ اور نزدیک کھینچ لی اور اپنا دایاں ہاتھ نرمی سے بیٹے کے تپتے ہوئے ماتھے پر پھیرا۔

"یہ آواز کہاں سے آئی؟"

"بیٹا، شاید ہمسائے باہر سے تماشا دیکھکر واپس آئے ہیں، ہاں موٹر کی آواز بھی سُنائی دی"۔

کلّو کی نگاہیں کوٹھری کے چھوٹے سے سوراخ کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے والے مکان پر ساتھ والے مکان سے بجلی کی روشنی کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ کلّو چند لمحے ٹکٹکی لگائے اُدھر دیکھتا رہا، پھر اُس نے اپنی گردن دوسری طرف موڑ لی، اسی وقت ایک قہقہے کی آواز نے فضا کی خاموشی کو توڑا اور کلّو کو محسوس ہوا کہ کسی تیز نوکدار چیز نے اُس کے جگر کو چھید ڈالا ہو۔

"اماں"

"ہاں بیٹا"

"یہ اتنے زور سے کیوں ہنستے ہیں؟"

"بیٹا مالدار ہیں، خوش قسمت ہیں، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں..... میرے لعل، ایسے سوال نہ پوچھو، چپکے لیٹے رہو، زیادہ باتیں کرنے سے پھر درد شروع ہو جائیگا۔"

"آج اُنھوں نے کیا کہا؟"

یہی کہ ہمارے پاس اب کچھ دینے کو نہیں"۔ بڑھیا نے چھت کی طرف دیکھکر دھیمی آواز سے کہا کہ بیٹا "تماشا دیکھنے کے لئے سب کچھ ہے"۔ ہم غریبوں کی مدد کے لئے کچھ نہیں۔ یہ کہکر اُس کی پُر حسرت نگاہیں بیٹے کے چہرے پر جم گئیں۔

سامنے والے مکان سے روشنی غائب ہوگئی، مگر کلّو کی نگاہیں کئی لمحے تک اُسی سوراخ کی طرف لگی رہیں۔ اُس وقت اُس کے دماغ میں ایک آراستہ و پیراستہ امیر گھرانے کے سونے کے کمرے کی تصویر چکر لگا رہی تھی۔ اس کمرے میں ایک خوبصورت پلنگ پر ایک معمّر شخص سفید ریشمی لباس پہنے ہوئے سو رہا تھا۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود اُس کے چہرے پر کوئی شکن نہ تھی، یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جس نے دکھ اور مصیبت کا شاید کبھی نام بھی نہ سنا ہو۔ یہی شخص کلّو کا دولتمند ہمسایہ تھا۔ اِسی نے آج صبح اُس کی ماں کو یہ جواب دیا تھا کہ اُس کے پاس کچھ دینے کو نہیں۔ کلّو نے آنکھیں بند کر لیں۔

کئی لمحے یوں ہی گذر گئے......

"اماں، تمھیں یاد ہے کہ جب میں چھوٹا سا بچہ تھا تو بہت ضدّی تھا، جب کبھی میں کسی چیز پر مچلتا تھا تو بتاؤ میں کیا کیا کرتا تھا۔؟"

"بیٹا، اچھی طرح یاد نہیں۔"

"میں تمھیں امّاں کہنے کے بجائے 'امی' کہتا، پھر تم کبھی کسی چیز سے انکار نہ کرتیں۔"

"کلو بیٹا، کلو!" بڑھیا کی آواز بھرائی ہوئی تھی، بے اختیار بیٹے کی چارپائی پر جھک گئی، اور بیٹے کی گرم پیشانی کو پیار سے چوما۔

"اگر میں تمھیں اب بھی امّی کہوں تو میری ایک بات مانو گی؟"

"بیٹا، میں تو اپنی جان بھی تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

"مجھے آج نہ جانے کیوں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اگر تم مجھے اُس نہر میں تیرنے کے لئے لے چلو جہاں میں بیمار ہونے سے پہلے روز جایا کرتا تھا تو مجھے آرام ہو جائیگا۔"

"مگر میرے لعل، تم میں اُٹھنے کی طاقت نہیں، پھر اتنی دور کیسے چل سکو گے، اور اگر کسی طرح

پہونچ بھی گئے تو ٹھنڈا پانی تمھیں اور تکلیف دیگا، بیٹا! ایسا خیال مت کرو "امّی"

وہی مقناطیسی الفاظ! بڑھیا کو جوان بیٹے کی شکل میں ایک معصوم بچے کا چہرہ دکھائی دیا، اُس نے ہاں کردی۔ صبح ہوگئی اور کلّو کے جسم میں نہ معلوم کہاں سے اتنی طاقت پیدا ہوگئی کہ وہ اپنی ماں کے ہمراہ نہر کے کنارے پہونچ گیا۔ ماں ڈر کے مارے کانپ رہی تھی

بیٹے نے ماں کو دلاسا دیا "اماں! بس اب سمجھو کہ مجھے آرام ہوگیا"۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بیٹا اللہ کا نام لیکر نہر میں کود پڑا۔

پانی میں ایک شور بپا ہوا ......... اور بس!

(۳)

ایک ضعیفہ شہر کے بازاروں میں چکّر لگایا کرتی ہے۔ اُس کے سفید بال پریشان ہوتے ہیں اُس کی نگاہوں میں وہی جھلک پائی جاتی ہے جو دیوانوں کی نگاہوں میں ہوتی ہے، اُس کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے ہوئے ہیں، مگر اُسے ان باتوں کی مطلق پرواہ نہیں۔ اگر اُس کے برہنہ پاؤں میں کبھی کوئی کانٹا چُبھ جائے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے، چلّاتی نہیں۔ پہلے پہلے تو شریر لڑکے اُس کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے اور "پگلی پگلی" کہکر اُس کا پیچھا کیا کرتے تھے، مگر اب جو کوئی اُسے دیکھتا ہے اُس کے دل میں رحم کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اُس کی زبان پر یہی الفاظ آتے ہیں "بیٹے کی موت نے بیچاری کی یہ حالت کردی۔ خدا اُس کو صبر عطا کرے"۔

ضعیفہ گلی کوچوں میں ایک درد بھری آواز سے یہ الفاظ دوہراتی ہوئی سُنائی دیتی ہے:۔

"میرا کلّو بھوکا ہے، اُس کے لئے روٹی اور سالن دیدو، وہ میری راہ دیکھتا ہوگا"۔

رات کے وقت بھی جب کامل خاموشی ہوتی ہے لوگ یہی آواز سنتے ہیں:۔

"میرا بیٹا بھوکا ہے......"

سب اُس پر ترس کھاتے ہیں، اور جہاں کہیں بھی وہ چلی جائے اُسے روٹی اور سالن مل جاتا ہے۔ وہ سَو سَو دعائیں دیتی ہوئی خوشی خوشی نہر کی طرف جاتی ہے اور وہاں جا کر روٹی اور سالن کو پانی میں پھینک دیتی ہے اور پانی کو مخاطب کرکے کہتی ہے "جا، اِسے میرے بیٹے کے پاس لے جا، وہ بھوکا ہوگا"۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرتی ہے اور پھر واپس ہو جاتی ہے۔

دوسرے دن صبح کے وقت شہر کے کسی اور کوچے میں وہی دلدوز آواز پھر سنائی دیتی ہے:۔

"میرا بیٹا بھوکا ہے۔ اُس کے لئے روٹی اور سالن دیدو......"

# تنقید کتب

## طنزیات و مضحکات[1]

یہ کتاب مسٹر رشید احمد صدیقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی تصنیف لطیف ہے جس میں فاضل مصنف نے دلپسند اسلوب سے ہجو، ہزل، مضحکہ، طنز وغیرہ کی مختصر تاریخ یونانی، رومی، انگریزی اور فارسی ماخذوں سے بیان کرکے اُردو طنزیات و مضحکات کی داستان لکھی ہے۔ اور سودا، مصحفی، انشا اللہ خاں، مرزا غالب، منشی سجاد حسین مرحوم اودھ پنچ کے اڈیٹر اور اُن کے مضمون نگاروں، نواب سید محمد آزاد، سید محمد عبدالغفور شہباز، پنڈت رتن ناتھ سرشار، حضرت اکبر الہ آبادی وغیرہ کے علاوہ موجودہ زمانہ کے مزاح نگاروں کے طرز بیان کی محققانہ تنقید کرکے تقریباً ہر صاحب کی تحریر کا نمونہ دیا ہے پرانے مضمون نگاروں میں صرف ہُدہُد دہلوی اور احمد علی کسمنڈوی نظر انداز ہوئے ہیں۔ فاضل مصنف کتاب خود بھی ملک کے موجودہ مزاح نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں، اس لئے بھی اس زمرہ کے دیگر مضمون نگاروں کے متعلق ان کی رائے خاص وقعت کی مستحق ہے۔ کتاب کے بہرہ عرض حال میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اس مقالہ کی ترتیب و تدوین کی شان نزول عبرتناک حد تک دلچسپ ہے، یعنی یہ فہمائش پر لکھی گئی، فرمایش پر طبع کرائی گئی اور ...... بخشائش کی توقع ہے"

دوستوں کی خدمات کا اعتراف بھی نہایت پرلطف پیرایہ میں اس طرح کرتے ہیں:۔

"مجھے اس مقالہ کی ترتیب میں اپنے بعض عزیز دوستوں اور بزرگوں سے نہایت گراں قدر مدد ملی ہے امداد کی نوعیتیں مختلف تھیں، مثلاً کسی نے بات بنائی، کسی نے تردید کی، کسی نے مسودہ دیکھا، کسی نے پروف پڑھا، کسی نے غلطنامہ مرتب کیا، کسی نے واہ واہ کی، کسی نے کام جاری رکھنے اور ختم کرنے پر مسلسل اصرار کیا۔ کسی نے قرض دیا اور نہیں مانگا، اور کسی نے قرض لیا اور نہیں دیا۔"

کل کتاب کا دو تہائی حصہ دوسروں کے اقتباسات سے بھرا ہوا ہے اور فاضل مصنف کی ذاتی تحریر بہت کم ہے۔ لیکن جتنی بھی ہے وہ ایسی ہے جیسے مرصع زیور میں جواہرات کے نگینے۔

[1] ملنے کا پتہ: ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد یا کتابستان الہ آباد، قیمت مجلد ہے، غیر مجلد تہ۔

فاضل مصنف نے طنزیات و مضحکات کی فہرست میں اُردو ریختی کو بھی شامل کر لیا ہے جو ہمارے خیال میں نہ ہونا چاہیئے تھا۔ ایک اور امر قابل توجہ ہے، یعنی طنزیات مضحکات کی تاریخ کے سلسلے میں قدیم یونانی، رومی، انگریزی اور فارسی کتابیں تو خوب چھانی گئی ہیں لیکن ہندوستان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ حالانکہ کتاب کا نام بھی "طنزیات و مضحکات اردو" ہے۔ اگر فاضل مصنف امیر خسرو کے دوسخنوں، ڈھکوسلوں، کہہ مکرنیوں، پہیلیوں، کبیر کے بعض بھجنوں، ہولی کے کبیروں، دیہاتی چنڈال چوکڑیوں کے گانوں اور مسخرے بھانڈوں کے فقروں، ناٹکوں کے کامک مکالمات کی طرف توجہ فرماتے تو کافی مسالہ مل سکتا تھا۔ بہرحال اب بھی اس کتاب میں جس قدر جمع کر دیا گیا ہے اپنی جگہ پر بہت اچھا ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسمیں جو تنقید کیگئی ہے وہ بلا رو رعایت اور جامع و مانع ہے۔ مثلاً شوکت تھانوی صاحب اور مُلّا رموزی کا موازنہ کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں:-

"شوکت میں شگفتگی ضرور ہے لیکن ابھی شگفتہ نگاری پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ اُنھوں نے مطالعہ پر کافی وقت نہیں صرف کیا ہے، لکھنا بغیر پڑھنے کے نہیں آتا اور پڑھنا بغیر لکھنے کے بیکار ہے۔ ملا رموزی کی تحریریں اتنی پختگی ہے کہ آیندہ اس میں اصلاح یا ترقی کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔ شوکت میں ابھی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں، یہی نہیں اگر وہ ترقی کی کوشش نہیں کریں گے تو بہت ممکن ہے ان کی شخصیت اور انشا پردازی دونوں خطرہ میں پڑ جائیں۔ ان کو ابھی سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامنگیر معلوم ہوتی ہے حالانکہ ابھی اُن کی کھیتی لہلہانی بھی شروع نہیں ہوئی ہے۔"

اِس کتاب کی زبان نہایت سلیس ہے لیکن ہمیں ایک سرسری نظر میں دو باتیں کھٹکی ہیں مثلاً ایک جگہ "اہالیان یونان" کا ذکر آ گیا ہے۔ حالانکہ یہاں پر "اہل یونان" ہی کافی تھا۔

غرض یہ کتاب اُردو کے ادبی ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، شائقین ادب کو اس کی قدردانی کرنا چاہیئے۔ ہندستانی اکیڈیمی کی دوسری ادبی مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی اُردو ٹائپ میں چھپی ہے اور کاغذ وغیرہ سب بہت عمدہ ہے، حجم سوا دو سو صفحات۔

## عربوں کی جہاز رانی

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی اڈیٹر "معارف" کے چار محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف نے مارچ ۱۹۳۱ء میں انجمن اسلام ہائی اسکول ہال بمبئی میں پڑھکر سنائے تھے۔ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی

لہ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: آصف اے۔ اے۔ فیضی اسکوائر ایم۔ اے سکریٹری اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن ۲۴۷ چرپانی روڈ بمبئی

نے اب اِن مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

کسی قوم کی زبان اس کے روزمرہ مشاغل اور کارناموں سے خالی نہیں ہوتی، چنانچہ عربی زبان میں بھی ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کا تعلق کشتیوں، جہازوں اور اُن کے متعلقہ علوم و فنون سے ہے۔ اِن الفاظ کی تحقیق و تدقیق کر کے فاضل مصنف نے ثابت کیا ہے کہ عربوں میں جہاز رانی کا فن اسلام سے صدیوں پیشتر موجود تھا۔ البتہ اسلام کے زمانہ میں بہت ترقی ہوئی۔ جہاز رانی کے متعلق علامہ موصوف نے الفاظ کی جو ریسرچ کی ہے اس میں بعض لفظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مثلاً:۔

(۱) "خلاسی" جسے آجکل "خلاصی" لکھا جاتا ہے، اور جس کے اصلی معنی وہ لوگ بتائے گئے ہیں جن کی ماں حبشن اور باپ عرب ہو۔ چونکہ عرب حبشی کنیزیں رکھتے تھے اور اُن کی اولاد نرینہ کو جہاز کے کاموں میں لگا دیا کرتے تھے اور یہ لوگ "خلاسی" کہلاتے تھے۔

(۲) ساحلِ بحر کے لئے قدیم لفظ "جد" ہے، اسی سے حجاز کے مشہور ساحلی شہر کو جدّہ کہتے ہیں۔ لیکن عام روایت یہ ہے کہ ہبوطِ آدم کے بعد حوّا کو جدّہ میں اور آدم کو سراندیپ میں پھینکا گیا تھا۔ شہر جدّہ میں حوّا کی قبر بھی بتائی جاتی ہے۔ اور چونکہ بنی آدم کی نسل حوّا سے شروع ہوئی ہے اس لئے ان کو عربی میں احتراماً "جدّہ" کہا جاتا ہے اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

(۳) "واڑ" سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی کنارہ ہیں جیسے کاٹھیاواڑ اس کی تعریب "بار" کی گئی جس کے معنی ساحل ہیں۔ مثلاً میبار، زنگبار وغیرہ، مگر مارواڑ کی نسبت مولانا کا کیا حکم ہے جو نہ ساحلی ملک ہے نہ سمندر کے قریب بلکہ ایک ریگستانی ملک ہے۔

بہرحال کتاب بڑی محنت اور تلاش سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے زمانہ میں ہندوستان کے کون کون سے بندرگاہ بارونق تھے جو اب غیر مستعمل یا بند ہو گئے ہیں کتاب میں اس سے بھی بحث کی گئی ہے کہ نہر سوئز کس طرح وجود میں آئی۔ مگر ہمیں مصنف کے اس بیان کے متعلق شک ہے کہ سب سے پہلے عمرو بن العاص گورنر مصر کو بحر احمر اور بحر روم کے بیچ سے خاکنائے سوئز کو ہٹا کر دونوں سمندروں کو باہم ملا دینے کا خیال ہوا۔ کیونکہ تاریخی اعتبار سے نہر سوئز کے سب سے پہلے تعمیر کرنے والے ایرانی تھے نہ کہ عرب لیکن ایرانی عہد کی نہر کس پرسی اور سلطنتوں کے ردوبدل کے باعث ریت سے اَٹ گئی تھی جسے عربوں نے از سر نو کھود کر بنایا۔

افریقی سواحل کے سلسلے میں مولانا نے بندرگاہ "زیلع" کو موجودہ اطالی ارٹیریا کے پاس بتایا ہے حالانکہ یہ بندرگاہ برطانوی سومالی لینڈ میں افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ کسی زمانہ میں یہی حبش

کا بندرگاہ تھا اور اس کو موجودہ جنگ حبش واٹلی میں لیگ اقوام کی کمیٹی نے حبشی علاقہ کے عوض حبش کو دینا تجویز کیا تھا۔

یوں جزئیات سے قطع نظر کتاب اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور کوئی لائبریری اس سے خالی نہ رہنی چاہیئے۔ اس کا حجم دو سو صفحات، کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی اور دیگر محاسن ظاہری کے لئے مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ کا نام کافی ہے۔

## انجام کار

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے کچھ عرصہ سے اخلاقی اور اصلاحی ڈراموں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے جن میں سے بعض پر زمانہ میں ریویو بھی کیا جاچکا ہے۔ یہ ڈرامہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس کے مصنف پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) ہیں۔ ڈرامہ کے ہیرو شیخ نجم الدین صاحب ایک پنشن یافتہ افسر ہیں اور برتی نائک یعنی Villain کا کام مولوی عبد اللہ عرف صوفی شاہ نور اللہ نے کیا ہے۔ تیسرا قابل ذکر کیرکٹر مختار علی کا ہے جو ہیرو کا مصاحب ہے۔ ڈرامہ کا پلاٹ معتقدات مذہبی اور نفسیات انسانی پر مبنی ہے۔ اس ڈرامہ میں ریاکار مولویوں اور عیار صوفیوں کے ہتھکنڈے طشت از بام کئے گئے ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے، جسے ہر شخص سمجھ کر لطف اُٹھا سکتا ہے۔

## مسلمان بیبیاں

یہ چھوٹی سی کتاب مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب نے صاف و سلیس اُردو میں مسلمان لڑکیوں کی ہدایت کے لئے تصنیف کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب مسلمان لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن اس کا دو تہائی آخری حصہ ہر مذہب اور قوم کی لڑکیوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ جس میں حیا، غیبت اور بدگوئی صبر، خود پسندی، خدا کا خوف، دلیری اور بہادری، معاشرت، رشتہ داروں کے حقوق، شوہر کی محبت خاوند کی خدمت، اولاد کی پرورش، سوتیلی اولاد کے ساتھ سلوک، یتیموں کی پرورش، فضول خرچی گھر کے کام کاج اور دستکاری کے متعلق شگفتہ بحث کر کے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰ حجم ۸۸ صفحات قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔



# مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کا جشن

سرزمین پانی پت جس کے ذرہ ذرہ میں ہندوستان کی تاریخ کے باب مستور ہیں آج اسی سرزمین پر ہندوستان کے اس سپوت کی جس کی ذات انفرادیت کے گرداب سے نکل کر حیات قومی کے محیط بے کراں میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ جبتک کرۂ ارض پر ہندوستان قائم ہے اور ہندوستان میں اُردو زبان باقی ہے حالی کی یاد منائی جاتی رہے گی۔ یہ دراصل اس انقلاب کی یاد ہے جو ملک کے مذاق میں پچھلی صدی کے آخر میں پیدا ہوئی۔

جشن حالی کی صدارت کے لئے ہز ہائی نس فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہ منتخب ہوئے۔ ہز ہائی نس کو اُن کی مادر مہربان علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم جنت مکانی نے رؤسا کے مدرسہ میں تعلیم دلانے کی بجائے مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی تعلیم گاہ میں تعلیم دلائی، جہاں سے وہ سچے سردار قوم اور محب وطن بنکر نکلے۔ غرض پانی پت جیسے تاریخی مقام اور حالی جیسے تاریخی انسان کی صد سالہ یادگار کے واسطے ہز ہائینس جیسی ہستی کی صدارت ہی موزوں و مناسب تھی۔ یہ جشن تاریخ پانی پت میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔

حالی ہائی اسکول اور ڈاک بنگلہ کے درمیانی میدان میں مہمانوں کے لئے خیموں کا ایک کیمپ قائم کیا گیا جس میں تقریبًا سو ڈیرے نصب تھے۔ اسکول کی عمارت کو ڈائیننگ ہال و نمائش دستکاری کے لئے تجویز کیا گیا۔ اسکول بلڈنگ کی پشت پر پنڈال تیار کیا گیا

بیرونی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ ۲۴۔ اکتوبر ہی سے شروع ہو گیا، چنانچہ سر سید راس مسعود، ڈاکٹر سر محمد اقبال ۲۴۔ اکتوبر کو پانی پت تشریف لے آئے، مولانا عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد نواب صدر یار جنگ بہادر، خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں، ڈاکٹر عابد حسین، مسٹر شعیب قریشی (منسٹر وٹینگ اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال) مولوی محمد امین صاحب زبیری، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اور دیگر اصحاب ۲۵۔ اکتوبر کی شام تک پہونچ گئے۔

۲۶ کی شب میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (امیر جامعہ دہلی) رشید احمد صاحب صدیقی مسلم یونیورسٹی وغیرہ تشریف لائے۔ غرض ۲۶ کی صبح تک تقریبًا چار سو مہمانوں کا شاندار مجمع حالی ہائی اسکول کے اطراف میں خیمہ زن تھا۔

اعلیحضرت صدر ۹ بجکر ۵ منٹ پر اسٹیشن پہونچے، جہاں اُن کے استقبال کے لئے ایک شامیانہ استادہ کیا گیا تھا، سُرخ بانات کا فرش بچھایا گیا تھا۔ سر سید راس مسعود، سر محمد اقبال، نواب محمد اسمٰعیل خاں، نواب زادہ میجر سعید الظفر خاں، آقائی صلاح الدین سلجوقی (کونسل جنرل افغانستان مقیم دہلی) مسٹر شعیب قریشی نے ہز ہائی نس کا استقبال کیا، صاحب ڈپٹی کمشنر، صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع کرنال بھی معہ ایک گارد اسٹیشن پر موجود تھے۔ اعلیحضرت اپنے درجہ سے باہر تشریف لائے اور سب سے مصافحہ فرمایا، گارد نے سلامی دی اور اعلیحضرت معہ معزز اراکین استقبالیہ کمیٹی موٹر میں بیٹھکر اپنے قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ سر اکبر حیدری، مولانا شوکت علی، مولانا حسن نظامی، سر عبدالرحمن، پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم اور دیگر اکابر بھی اسی ٹرین سے تشریف لائے۔

پروگرام میں فاتحہ کا وقت شام کا مقرر تھا، لیکن اعلیحضرت ناشتہ کے بعد ہی حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ پر حاضر ہوئے اور مزاراتِ مقدسہ پر فاتحہ پڑھی، مزار شریف سے سیدھے حالی ہائی اسکول تشریف لائے، جہاں خواجہ سجاد حسین صاحب نے اراکین مجلس انتظامیہ و اسکول و اسٹاف کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد اسکول کی عمارت کا معائنہ فرماتے ہوئے پنڈال میں تشریف لائے۔

ڈائس پر بہتر نشستیں ترتیب دی گئی تھیں، اس کے قریب ہی پریس رپورٹر اور سامنے اراکین استقبالیہ کمیٹی کی نشستیں تھیں، علیگڈھ کے طلبہ و اسٹاف کے لئے علیحدہ نشستیں مخصوص تھیں، حاضرین کی تعداد پانچ ہزار سے کم نہ تھی اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تھا۔

اعلیحضرت کے صدر نشین ہونے کے بعد حسب اعلان خواجہ غلام السیدین صاحب مولانا چودھری محمد اسلام صاحب نے کلام پاک کی تلاوت فرمائی، بعدہٗ اسکول کے طلبا نے اپنی روزانہ دعا پڑھی، اس کے بعد خواجہ سجاد حسین صاحب نے اراکین استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے اعلیحضرت کی خدمت میں ایڈریس پڑھکر سنایا۔ ایڈریس میں اسکول کی مالی مشکلات اور مساعی جمیلہ کا تذکرہ تھا جو اراکین مجلس انتظامیہ کو گذشتہ بیس سال سے درپیش ہیں، آخر میں اعلیحضرت کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ یہ ایڈریس اعلیحضرت کی خدمت اقدس میں ایک نہایت خوبصورت کاسکٹ میں پیش کیا گیا اور نواب ابراہیم علی خاں صاحب آف کنج پورہ نے اعلیحضرت نواب صاحب بالقابہ کے گلے میں ایک خوشنما ہار پہنایا۔

اس کے بعد ماسٹر لئیق احمد صاحب ٹیچر حالی اسکول نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ اشعار سنائے جو یہ ہیں:-

مزاج ناقہ را مانند عُرفی نیک می بینم　　　چو محمل را گراں بینیم حدیٰ را تیز تر خوانم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو — ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را — نوائے او بجا نہا افگند شورے کہ مندانم

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم — تو بر خاکش گہر افشان و من برگ گل افشانم

نظم خوانی کے بعد جناب مولانا عبد الحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے "مولانا حالی بحیثیت شاعر نثر نگار و نقاد" کے عنوان سے ایک پُر مغز تقریر فرمائی جس میں عنوان بالا کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ طور پر روشنی ڈالی گئی تھی، مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے مولانا موصوف اپنا پورا مقالہ سامعین کو نہ سنا سکے۔ مقالہ میں حضرت مولانا کی زندہ دلی خاص طور پر نمایاں تھی جو آپ کی طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ دوران تقریر میں آپ نے زبان اُردو پر ریویو کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"ایک مرتبہ مرزا آوج حیدر آباد تشریف لائے نہایت دلچسپ صحبت تھی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ کل صنائع بدائع کا مرثیہ ہوگا۔ اس پر مرزا صاحب سے مولانا نے دریافت کیا کہ کیا صنائع بدائع بھی شہدائے کربلا میں شامل تھے۔"

اس کے بعد مقامی شعرا نے اعلیحضرت کی شان میں نظمیں پڑھیں۔ نظموں کے بعد خواجہ غلام السیدین صاحب نے "مولانا حالی بحیثیت مصلح قوم" کے عنوان سے تقریر فرمائی جس میں مولانائے مرحوم کی اصلاحی نظموں کے اقتباسات کے حوالے دیئے گئے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے "مولانا حالی بحیثیت محب وطن" کے عنوان سے دہلی کی سلیس اور بامحاورہ زبان میں تقریر فرمائی اور نہایت عمدگی سے منطقی استدلال کر کے مولانا مرحوم کو محب وطن ثابت کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بعد خانصاحب حفیظ جالندھری نے "دور حالی" کے عنوان سے ایک نظم ارشاد فرمائی۔ اس کے بعد اعلیحضرت نے ایڈریس کا جواب ارشاد فرمایا۔ جب یہ ختم ہوا تو اعلیحضرت کے ایما سے سر سید راس مسعود صاحب نے اعلان فرمایا کہ اعلیحضرت نے مبلغ بیس ہزار کی گراں قدر امداد حالی میموریل اسکول کے لئے منظور فرمائی ہے۔ اور وزرائے بھوپال ایک ہزار روپیہ اس مد میں نذر کرتے ہیں۔ صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع کرنال نے پنجاب گورنمنٹ کی جانب سے ایک ہزار روپیہ کی امداد کا اعلان فرمایا اور جلسہ کی پہلی نشست ختم ہوئی۔ اور جلسہ لنچ کے لئے برخاست ہوا۔

لنچ کے بعد اعلیحضرت پھر پنڈال میں رونق افروز ہوئے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب نے معززین کے پیغامات پڑھکر سنائے اور حسن انتظام کے سلسلے میں چند تمغے اعلیحضرت کے دست مبارک سے تقسیم کرائے گئے۔ اور چندہ دینے والوں کے اسمائے گرامی کا اعلان ہوا۔

شام کو حالی اسکول میں ایک بہت بڑے پیمانہ پر ایٹ ہوم ہوا جس کے بعد آتشبازی چھوڑی گئی اور اعلیٰحضرت بہ ہمراہی سر سید راس مسعود بذریعہ موٹر دہلی تشریف لے گئے۔

## مولانا حالی اور اُن کے احسانات

مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ حالی کی صد سالہ سالگرہ کے جلسے کی انجمن استقبالیہ نے اس تقریب میں دعوت دیکر میرے لئے آپ کے اس قدیم اور تاریخی شہر میں آنے کا موقع مہیا کر دیا جس کی سرزمین پر بارہا ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے، اور جس کی گذشتہ صدی کی سب سے بڑی خصوصیت اور فضیلت یہ ہے کہ وہ مولانا حالی کا مولد و مدفن ہے۔ اسی واسطے جب مجھے اس جلسہ کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک ایسے شخص کی یادگار میں منعقد ہو رہا ہے جو کسی ایک خطے یا طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ جس کی ذات پر ہر زمانہ اور ہر ملک فخر کر سکتا ہے اور اس کی عالمگیر اہمیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس میں شرکت کو اپنی دیگر گوناگوں مصروفیتوں پر مقدم رکھا۔ کیونکہ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ حتی الامکان ہر ایسی تحریک میں ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا جائے جو اہل ملک اور ابنائے وطن کے واسطے مفید ہو اور یہ نتیجہ ہے میری اس تعلیم و تربیت کا جس کے لئے میں سب سے زیادہ اپنی والدہ محترمہ حضور سرکار عالیہ مرحومہ فردوس آشیاں کا اور ان کے بعد اپنی مادر درسگاہ علیگڈھ کا ممنونِ منت ہوں۔

مجھے حالی مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح حیات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ملک ان کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ محتاج تشریح نہیں۔ میں اُن کے ادبی کارناموں پر بھی کوئی تنقید او تبصرہ نہیں کرونگا کیونکہ اسی جلسے میں انکے مختلف پہلوؤں پر نہایت خوش اسلوبی سے کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے البتہ مجموعی طور پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی مرحوم جن کے یوم ولادت کی صد سالہ سالگرہ منانے کے لئے آج ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں ملک کے ایک سچے بہی خواہ اور قوم کے ایک مخلص ہمدرد تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر ابنائے وطن کی اصلاح و تربیت کی کوشش میں صرف کی، اُن کی ہر بات وعظ و نصیحت کی تھی اور اُن کا ہر کام خلوص و محبت کا۔

میرا یقین ہے اور غالباً اس سے کسی شخص کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ ان تمام پہلوؤں سے مرحوم گذشتہ صدی کے اکابر ملک کی صفِ اول میں تھے اور وہ ہر حیثیت سے اس کے مستحق ہیں کہ اُن کے احسان شناس ہر ممکن ذریعہ سے اُن کی یادگار کو قائم رکھیں تاکہ نوجوانوں میں ان کی تقلید اور تتبع کی تحریک ہو۔

بلاشبہ اُن کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہے

حقیقت میں وہ اُردو شاعری کے دَور جدید کے بانی اور موجد تھے، اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اُردو ادب تنقید اور شاعری کی شمیہ ثانیہ تمام تر انہی کی مرہون منت ہے۔ اُردو شعرا میں سب سے پہلے انھوں نے شاعری کے اصلی مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور یہ محسوس کیا کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ قدرت کی نیرنگیوں کے مشاہدے سے جو اثر اس کے احساس اور ذکی دل و دماغ پر مترتب ہوا اُسے ایسے دلکش انداز اور موزوں الفاظ میں ادا کرے جس سے سامعین کے اعلیٰ ترین احساسات برانگیختہ ہوں اور نظام فطرت کے مطالعہ سے مسائل حیات کے متعلق جو نتائج وہ خود اخذ کرتا ہے، وہ دوسروں کے دلوں میں بھی پیدا کردے۔ اور اس کی نظم ہر قسم کے رکیک خیالات اور ادنیٰ جذبات سے پاک ہو۔ چنانچہ اُنھوں نے نثر میں شاعری کے اِس نصب العین کو نہایت وضاحت اور سلاست سے پیش کیا ہے۔ اور نظم میں پوری بیباکی اور یکسوئی سے اسے پیش نظر رکھا۔ اسی لئے انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملک اور قوم کی اصلاح میں صرف کردیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے وہ غیر فانی اور عدیم المثال کتاب "مدوجزر اسلام" المعروف بہ مسدس حالی، جس کی نسبت سرسید علیہ الرحمۃ نے بجا فرمایا ہے کہ قیامت میں اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لایا تو میں مسدس حالی پیش کردونگا۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ وہ خاص طور پر مسلمانوں کو ان کی موجودہ زبوں حالی پر عبرت دلانے اور ان میں ملکی اور قومی حمیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی تھی یہ یقینی بات ہے کہ اُردو شاعری میں بھی وہ ایک ایسی نئی چیز تھی جس کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہیں تھی کیونکہ جیسا کہ مرحوم نے خود اسکے پہلے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "اسمیں نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگیں بیانی ہے نہ مبالغہ کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ مگر ہے کیا؟ خلوص ہے، صداقت ہے سلاست ہے، روانی ہے، صاف گوئی ہے، سادہ بیانی ہے، ایک آئینہ خانہ ہے جس میں قوم اپنے صحیح خط و خال دیکھ سکتی ہے، اور سمجھ سکتی ہے کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔"

اِس نظم کی ہر دلعزیزی اور قبولیت عامہ نے اور اس کے ساتھ مرحوم کے "مقدمہ شعر و شاعری" نے شعراء کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستانی شاعری میں پیدا ہو گیا، اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے اور جس کی مثال میں دَور حاضرہ کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبال کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی مرحوم نے اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا کہ اہل مشرق کا مذہب سے کتنا گہرا تعلق ہے اور وہ ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں کتنا مؤثر اور دخیل ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ مسلمانوں کی تمام شیرازہ بندی مذہب ہی سے ہے۔ اور ان کی ساری قومی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے مگر اس کے

ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہب کا اصل مفہوم فرقہ وارانہ تعصب اور تنگ نظری سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، اور اس کی صحیح اور سچی تعلیم عالمگیر اخوت اور رواداری کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے احکام کی تعمیل جہاں ہر شخص کو بہترین اخلاق سکھاتی ہے وہیں وہ اسے کسی دوسرے شخص کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے سے بھی باز رکھتی ہے، اور اس کے دل میں عام انسانی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ حالی کی تمام تصنیفیں شاہد ہیں کہ وہ اس سچی تعلیم کے کیسے سچے عامل تھے۔ ان کے دل میں سچا اسلامی درد تھا، ان کو اپنی قوم کے تنزل کا شدید احساس تھا۔ ان کی تمام سعی و کوشش یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو اُن کے اس خواب غفلت سے بیدار کریں۔ اس لئے وہ ان کو سخت سُست کہتے تھے، ان کو لعن و طعن کرتے تھے۔ مگر وہ کسی دوسری قوم کو کبھی بھی بُرا نہیں کہتے تھے، کسی دوسرے مذہب کی بھول کر بھی بُرائی نہیں کرتے تھے، ان کے کلام میں تعصب مذہبی کا شائبہ بھی نہیں ہے اور ان کے پند و نصائح سے تمام اہل وطن یکساں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، یہی ان کی وہ خصوصیت ہے جو ان کی مابہ الامتیاز ہے اور جس کی تقلید آجکل ہر شخص کو کرنی چاہیئے۔

چنانچہ 'یادگار غالب' میں ایک جگہ انھوں نے نہایت پر لطف طریقے سے اس روش کے برخلاف اپنے سابقہ طرز عمل پر خود بھی اعتراض کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:-

ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ شرمندگی ہوتی ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشہ میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے صرف اہل سنت اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور اُن میں سے بھی صرف ان لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرہ رحمت الٰہی کو کوئن وکٹوریہ کی وسعت سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و اماں زندگی بسر کرتے ہیں زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔

میرے نزدیک یہ سب سے بڑا سبق ہے جو ہم کو مرحوم کی زندگی سے لینا چاہیئے کیونکہ اگر اس وقت ہم سب اسی نقطۂ خیال سے اپنے مذہبی عقائد کو جانچیں اور مرحوم کی وسعت نظری اور فراخ دلی سے کام لے کر آپس میں رواداری کا برتاؤ کرنے لگیں تو یقیناً ہمارے سارے جھگڑے مٹ جائیں اور ہماری ساری دقتیں حل ہو جائیں۔ آخر ہمارے بزرگوں نے اسی ملک میں ہزار برس تک باہم شیر و شکر

رہ کر زندگی بسر کی ہے، کیا وہ اپنے مذہب کے سچے پرستار نہ تھے۔ یا ان میں ہماری نسبت مذہبی شغف کم تھا۔ کم سے کم میں تو یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور میں اس خلاف مذہب تعصب کو صحیح اور سچی مذہبی تعلیم سے بیگانگی اور اصولِ مذہب سے ناآشنائی کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے مذہبوں کے اصل اصول ایک ہیں۔ ہر مذہب نکوکاری کی تلقین کرتا ہے، ہر مذہب ہمدردی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے تو پھر کیا ہم ان اصول اصلیہ کے اشتراک کے باوجود بھی لکم دینکم ولی دین کے زریں اصول پر کاربند نہیں ہو سکتے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا برتاؤ نہیں کر سکتے میں نہایت اصرار و تاکید سے اپنے تمام ابنائے وطن اور بالخصوص ہر ایک مسلمان سے یہ درخواست کرونگا کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں کہ وہ اس طرح اپنے معبود حقیقی کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کر سکتے ہیں جو بلاشبہ اُن کی تمام تگ و دو کا منشا ہے۔

میری رائے میں ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم بھی ایک بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے تعلیم کا ایک صحیح مقصد یہ ہے کہ ہم کو ماہیتِ اشیاء کا علم ہوتا کہ ہم قوانینِ قدرت کو سمجھ سکیں، ہم میں تحقیق و تنقیح کی قابلیت ہوتا کہ ہم بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکیں، اور جو معاملات ہمارے سامنے آئیں اُن کے متعلق ہم کوئی درست رائے قایم کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہونچ سکیں، غرض یہ کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، اور دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ قابلیت پیدا کرنے کے بجائے ہم مدرسوں کی مروجہ تعلیم سے فقط چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ سیکھ لیتے ہیں، چند غلط سلط اصطلاحیں ازبر کر لیتے ہیں، چند اُلٹے سیدھے جملے بول لیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنے قدیم تمدن کو بھول جاتے ہیں، اپنی آبائی معاشرت کو فراموش کر دیتے ہیں، اور اپنے مذہب کے اصول سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا غایت الآمال کوئی سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہے، اور ہماری معراج ترقی کسی محکمہ میں محرری کی جگہ لے لینا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملازمتوں کی تعداد محدود ہے، اور یقیناً وہ اس قدر جلد خالی اور زیر انتظام نہیں ہوتیں جتنی کثرت سے ان کے خواستگار پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تعلیم کی عمومیت کی خواہش اور دوسری طرف تعلیم کے بعد ملازمتوں کے لئے جدوجہد دو ایسی مخالف اور متضاد باتیں ہیں جن کو کسی طرح جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ تعلیمی اسناد کی کس مپرسی اور کساد بازاری اور مختلف قوموں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ملازمتوں کے حصول میں جو بڑی حد تک فرقہ وارانہ جنگ و جدل کی ذمہ دار ہے۔

یہ درسگاہ جس کی بنیاد حالی کے مقدس ہاتھوں نے رکھی ہے اور جو مرحوم کی یادگار ہے۔ اس کے طلبہ سے میں خاص طور پر یہ کہونگا کہ وہ اپنی تعلیم کا مقصد محض سرکاری تعلیم ملازمت قرار نہ دیں بلکہ اپنا نصب العین اس سے بلند تر رکھیں، یعنی وہ تعلیم کو تعلیم کی غرض سے حاصل کریں



# کیا آپ کمزوری محسوس کرتے ہیں؟

آپکی یہ کمزوری خواہ بخار یا کسی بیماری کے باعث ہو خواہ اپنی قوت مردمی کے زیادہ خرچ کرنیکے باعث ہو آپ مشہور و معروف مقوی غذا سناٹوجن استعمال کیجیے آپکی روشن صحت اور طاقت بہت جلد پھر بحال ہو جائیگی۔ کمزوری اور اسکی وجہ سے پیدا شدہ عوارض مثلاً تعطل دماغ، دوران سر، درد سر اور فقدان اشتہا سبکو معدوم کرنیمیں سناٹوجن اپنی طاقتوں اور خواص میں شہرہ آفاق ہے

ڈاکٹر، ایس کرشنا مورتی راؤ سلیم سے تحریر فرماتے ہیں:-

"میری رائے میں کمزوری اعصاب طاری کرنیوالی بیماریوں سے افاقہ پذیر لوگوں کیلئے سناٹوجن ایک بیش بہا نعمت ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جنھیں عام کمزوری اعصاب خستگی اور تکان وغیرہ کی شکایت ہے"

آپ "سناٹوجن" کا استعمال کر کے دیکھئے آج ہی ایک شیشی خرید کر کچھ عرصے کے لئے روزمرہ استعمال شروع کر دیجئے۔ آپ حیران ہو جائینگے کہ آپکی طاقت میں کسقدر جلد اضافہ ہوتا ہے اور کس قدر جلد تندرستی بحال ہو جاتی ہے

ہر دوا فروش اور بازار میں سناٹوجن ملتی ہے۔

**SANATOGEN**

اصلی مقوی غذا

ہاتھ سے چھوٹی نہیں جاتی۔



# اگزیما پھنسیوں اور ہر قسم کے زخم کو زمبک سے اچھا کرو

## یہ جڑی بوٹیوں کا مرہم ہے

اگر آپکو اگزیما پھنسیوں۔ دانوں یا کسی اور جلدی مرض کی شکایت ہو گئی ہے تو آپ اپنے جلد کو جڑی بوٹیوں والے مرہم زمبک کے روزانہ استعمال سے پھر صاف اور تندرست بنا لیجیے۔ زمبک قدرتی طریقہ سے جلد کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور مرض کو جڑ ہی سے اچھا کر دیتا ہے۔ اس سے درد رفع ہو جاتا ہے۔ زہریلے جراثیم نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور جلد ہر قسم کے نقص سے پاک و صاف رہتی ہے۔ آپ یقینی طور سے زمبک ہی استعمال کیجیے۔ کوئی مرہم اسکے برابر شفا بخش نہیں ہے

قیمت ایکروپیہ فی ڈبیہ بڑی ڈبیہ کی قیمت دو روپیہ چار آنہ

سب انگریزی دوا فروش اسکو فروخت کرتے ہیں۔

ایجنٹس مسرز اسمتھ اسٹن اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ انٹالی کلکتہ،

حیوانی چربی سے پاک و صاف،

**زمبک**

**Zam Buk**

# آپ کی تقدیر

آپ ایک کارڈ پر صرف کسی پھول کا نام اپنے نام و پتہ کیساتھ لکھ کر بھیجدیجئے، اور ہم آپ کو بذریعہ وی، پی پوسٹ ایک روپیہ چار آنہ میں (علاوہ محصولڈاک) آیندہ ایک سال کیلئے آپ کے متعلق مفصل حالات لکھ کر بھیجدیں گے جس میں کاروبار کے اندر نفع و نقصان، ترقی، تبادلہ، ملازمت میں تخفیف، بچوں کی ولادت، شادی بیاہ، خوشی و غم اور جسمانی عوارض کے حالات ہوں گے، اور ستاروں کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے ہدایات بھی ہونگی، ہماری پیشگوئیوں کی تصدیق کیلئے آزمایش شرط ہے ہر قسم کے پانچ سوالوں کے صحیح جوابات کے لئے علاوہ محصولڈاک سوا روپیہ ہے

نوٹ:۔ جو شخص ہمارے بیان کو چیلنج کریگا ہم اسے مبلغ سو روپیہ انعام دیں گے۔

**پروفیسر جی شنکر پوسٹ بکس ۲ لاہور**

---

## سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا

انگوری منقاؤں سے تیار کردہ

## سُکھ سنچارک دراکشا سُو

جسم کو طاقتور بنانے گوشت و خون بڑھانے چہرہ پر رونق لانے۔ دست صاف ہو کر بھوک بڑھانے والی خوش ذائقہ دوا قیمت چھوٹی بوتل عہ بڑی عہ

ہمارا ہی ایک دراکشا سو ایسا ہے جس کی

**۵۲ - اخباروں نے تعریف لکھی ہے**

طلب فرمائیے نمونہ اور فہرست مفت

**روانہ کی جاتی ہے**

---

## سکھ سنچارک کمپنی متھرا کی

ادویات

## سُدھا سندھو

کف کھانسی ہیضہ۔ دمہ۔ شول۔ سنگرہنی آتیسار وغیرہ کی خوش ذائقہ و خوشبودار دوا قیمت عہ

## دورو گج کیسری

داد کی سب سے اچھی دوا قیمت عہ

## بال سُدھا

دُبلے و کمزور بچوں کو طاقتور بنانیوالی دوا قیمت ۲

**سب دوا فروشوں کے پاس ملتی ہیں**

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

بیادگار جشن صد سالہ یوم ولادت شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

## حالی نمبر

# زمانہ

جلد ۶۵ دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر ۶

(مرتبہ)

دیا نراین نگم، بی۔ اے

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی کاپی ۱۲؍

# ڈابر (ڈاکٹر ایس - کے برمن) لیمیٹڈ

پچاس برس سے مشہور و لاثانی دیسی پیٹنٹ دواؤں کا ہندوستانی وسیع کارخانہ

صیغہ نمبر ۱۱۸ پوسٹ بکس ۵۵۴ کلکتہ

## کمزوروں کی تلاش




اسٹار ٹریڈ مارک




دماغ، رگ اور پٹھوں میں طاقت پہونچانے اور تھکاوٹ کو دور کرنے میں بے مثل ہے یہ تھکے ماندے جسم میں قوت پہونچاتا اور سستی و کاہلی دور کرتا ہے دم کو بڑھاتا ہے، اور افیون کو چھڑاتا ہے نیز گلے کی آواز کو سریلا بناتا ہے، گویئے طالب علم اور ورزش کرنے والوں کو ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنہ عہ
ڈاک محصول سات آنہ ۷/

نمونہ ۴/ جو صرف ایجنٹوں سے ہی ملسکتا ہے۔




سالہائے گذشتہ کی طرح امسال بھی عمدہ چکنے کاغذ پر نستعلیق لکھی ہوئی بہت ہی خوبصورت جنتری شایع ہوتی ہے، اس میں بہت ہی مفید اور کارآمد باتیں درج ہیں۔

معزز قدردان **مفت** طلب فرمائیں۔

**نوٹ:-** ہر جگہ ہمارے ایجنٹوں سے اور دواخانوں میں ملتا ہے، دوا خریدتے وقت اسٹار ٹریڈ مارک اور ڈابر نام ضرور دیکھ لیا کریں۔

(۱) کانپور (نیا گنج) کے ایجنٹ محمد حفیظ محمد نصیر۔

(۲) کانپور (نیا گنج) کے ایجنٹ رام غلام شیو غلام۔

(۳) کانپور (کلکٹر گنج) کے ایجنٹ مسرز چھوٹے لال اینڈ سنس۔

حالی نمبر

# زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔ اے۔


| نمبر ۶ | دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء | جلد ۶۵ |
|---|---|---|


## فہرستِ مضامین

تصاویر:- (۱-۲) مولانا حالی مرحوم کی دو تصویریں۔ (۳) رفقائے مولانا حالی (۴) عکس تحریر مولانا حالی۔ (۵) ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال۔




چندہ سالانہ ۶ر

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸ر

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ ششماہی ۶ر۔ ہندوستان کے لئے ششماہی ۳ر۔

## خریدارانِ "زمانہ" کی خدمت میں

# ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اس نمبر سے ختم ہو گیا ہے اور آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہو گئی، لہٰذا ایسے صاحبان براہِ کرم ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء تک "زمانہ" کا سالانہ چندہ مبلغ پانچروپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں، ورنہ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V. P. P.) ارسال ہوگا۔

قیمت طلب (ویلیو پے ایبل V.P.P.) پیکٹ میں پانچ آنہ کا صرفہ ہوتا ہے کیونکہ ہر ویلیو پے ایبل (V. P. P.) کے لئے رجسٹری ہونا ضروری ہے، اس لئے دو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ رجسٹری فیس بھی ادا کرنی پڑتی ہے منی آرڈر سے قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ کی کفایت ہو سکتی ہے۔

(نوٹ) قواعد ڈاکخانہ کی رُو سے ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاکخانہ میں امانت نہیں رکھے جا سکتے ہیں اس لئے استدعا ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں وہ براہ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ فوراً ہی وصول فرما لیں، ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ معہ نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں۔ تاکہ رجسٹر میں رقم مُرسلہ کا صحیح اندراج ہو سکے۔

---

جن صاحبان کو آئندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب پیکٹ (V. P. P.) کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ہٰذا مزید نقصان سے محفوظ رہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کا رسالہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء تک شائع ہو جائیگا۔

مینجر

# زمانہ

جلد ۶۵ دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء نمبر ۶

## مولانا حالی مرحوم

### ذاتی حالات

خواجہ الطاف حسین حالی جن کی صد سالہ سالگرہ کا جشن پچھلے مہینہ اس قدر دھوم دھام سے منایا گیا۔ پانی پت ضلع کرنال کے رہنے والے تھے، وہیں سنہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو ستتر برس کی عمر میں وہیں انتقال فرمایا۔ آپ کے والد خواجہ ایزد بخش انصاری محکمہ نمک میں ملازم تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ خواجہ عبد اللہ انصاری سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے پانی پت کا محلہ انصاریاں انھیں کی نسل سے آباد ہے۔ خواجہ حالی کی ولادت کے بعد بدقسمتی سے اُن کی والدہ کا دماغ ماؤف ہوگیا جس کے بعد جلد ہی اُن کا انتقال ہوگیا، اور نو برس کی عمر میں باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ خواجہ الطاف حسین جب یتیم ہوگئے تو اُن کی پرورش کا بار اُن کے بڑے بھائیوں اور بہنوں پر پڑ گیا۔ عام رواج کے مطابق خواجہ حالی نے پہلے قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد آپ نے سید جعفر علی سے جو امیر ممنون دہلوی کے بھتیجے تھے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف و نحو پڑھی۔ سترہ سال کی عمر میں اُن کی شادی ہوگئی جس کے بعد انھیں تلاش معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور جب پانی پت میں کوئی سلسلہ نہ لگا تو آپ کسی کو اطلاع دیئے بغیر دہلی چلے گئے

اور وہاں ڈیڑھ سال تک مسلسل مشہور واعظ و مدرس مولوی نوازش علی سے صرف ونحو اور منطق کی بلند پایہ کتابیں پڑھتے رہے۔ یہ سلسلۂ تعلیم ابھی تکمیل تک نہ پہونچنے پایا تھا کہ آپ کو اپنے عزیزوں کے اصرار سے ۱۸۵۵ء میں پھر پانی پت واپس آنا پڑا۔ لیکن یہاں پہلے کی طرح اب بھی روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی آخر ۱۸۵۶ء میں آپ کو ضلع حصار کے دفتر کلکٹری میں ایک چھوٹی سی ملازمت مل گئی۔ لیکن سال بھر بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ غدر کا فتنہ برپا ہوا اور آپ کو ایکبار مرتبہ پھر پانی پت واپس آنا پڑا۔ اس مرتبہ چار سال تک مسلسل آپ بیکار رہے۔ لیکن چونکہ آپ کو شروع ہی سے تحصیل علم کا شوق تھا اس لئے اس عرصہ میں بھی آپ مقامی علما سے درس لیتے رہے جس کی بدولت آپ کو فلسفہ و منطق حدیث و فقہ اور تفسیر میں بہت کافی عبور حاصل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے ادق ادبی کتابوں کے مطالعہ کا شغل بھی لغت کی مدد سے جاری رکھا۔ اس زمانے میں آپ کبھی کبھی عربی زبان میں مضامین لکھا کرتے تھے اور شعر و سخن موزوں کیا کرتے تھے۔ جب آپ دہلی میں تھے تو اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے، جہاں آپ کو ذوق۔ غالب اور مومن جیسے سخنوران کامل کا کلام اور ان کے شاگردوں کی واہ واہ سننے کا موقعہ ملا۔ اِن دنوں دہلی کا قریب قریب ہر شخص شعر و شاعری کا دلدادہ تھا۔ خواجہ حالی کو بھی طبع آزمائی کا شوق ہوا تو آپ مرزا غالب سے اصلاح لینے لگے۔ غدر کا فتنہ فرو ہونے کے بعد جب کچھ عرصے تک آپ کو روزگار کی کوئی صورت پیدا ہوتی نظر نہ آئی تو آپ ایکبار پھر تلاشِ معاش کے لئے باہر نکلے۔ حسن اتفاق سے آپ کو ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفےٰ خاں رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا۔ نواب صاحب موصوف اپنے وقت کے مشہور اُردو۔ فارسی شاعر تھے، اور اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ آپ مولانا حالی کے ساتھ بڑی قدردانی سے پیش آئے۔ چنانچہ مولانا سات آٹھ سال تک نواب صاحب کی مصاحبت میں رہے۔ نواب صاحب کے یہاں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا اور مولانا حالی بھی باقاعدہ طور پر شعر کہنے لگے۔ آپ خود لکھتے ہیں:۔

"مرزا غالب کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے"

آپ کا شعر بھی ہے:۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں     غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا

مگر یہ صحبت چند ہی سال بعد نواب صاحب کی وفات پر درہم برہم ہوگئی اور آپ کو گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ آپ کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی کہ جن کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوتا تھا آپ اُن کی عبارت کو درست کر دیا کرتے تھے۔ چار سال تک آپ نے یہ خدمت انجام دی جس سے آپ کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ آپ انگریزی لٹریچر کی خوبیوں سے واقف ہوگئے جس سے آپ کی نظر بلند اور خیالات وسیع ہوگئے۔ اب آپ کی نظر میں اُردو فارسی کے قدیم لٹریچر کی کوئی وقعت باقی نہ رہی اور اُردو کی بے بضاعتی کا احساس ہوا چنانچہ آپ اس کی اصلاح اور ترقی کی طرف رجوع ہوئے۔

۱۸۷۴ء میں مولوی محمد حسین آزاد نے کرنل ہالیرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کے ایما سے لاہور میں ایک جدید طرز کا مشاعرہ قائم کیا جس میں مصرعۂ طرح کے بجائے مضمون کا عنوان قائم کرکے شاعروں سے اُس پر نظمیں لکھنے کی درخواست کی جاتی تھی۔ مولانا حالی بھی اس مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ اسی مشاعرے کی بدولت آپ نے اپنی چار مثنویاں برکھارت۔ امید۔ رحم و انصاف اور حُبِ وطن نامی لکھیں یہ نظمیں اُردو کی نیچرل شاعری کی اولین نظمیں ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مولانا حالی کا تبادلہ لاہور بکڈپو سے اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی پر ہوگیا، جو آپ کی ادبی زندگی کے حق میں بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ یہیں آپ کی سر سید احمد خاں سے ملاقات اور ملاقات کے بعد دوستی ہوگئی۔ چند ہی دنوں میں آپ سر سید کے دست راست اور اُن کی قومی تحریک کے ایک ممتاز رکن ہوگئے۔ اُنھیں کے ایما سے آپ نے ۱۸۷۹ء میں اپنا مشہور مسدس لکھا، جس نے مسلمانوں میں ایک تہلکہ برپا کرکے انھیں خواب غفلت سے چونکا دیا۔

ایک اور قابل ذکر واقعہ جس کا آپ کی ادبی زندگی پر بہت بڑا اثر پڑا یہ ہے کہ ۱۸۸۶ء میں آپ علیگڈھ میں سر سید کے مہمان تھے اور اُنھیں دنوں نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام حیدرآباد مدرسۃ العلوم کے معائنہ کے لئے علیگڈھ آئے تھے۔ اِس موقعہ پر سر سید نے نواب صاحب موصوف سے مولانا کی سفارش کرکے ان کے نام امداد مصنفین کے صیغے سے پچھتر روپیہ ماہوار کا وظیفہ جاری کرا دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد سرکار نظام نے اس وظیفے کو پورے سو روپیہ کر دیا۔ مولانا حالی بالطبع قانع واقع ہوئے تھے، چنانچہ اس وظیفے کی بدولت فکر معاش سے آزاد ہوتے ہی اینگلو عربک اسکول کی ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور اپنی بقیہ تمام عمر تصنیف و تالیف کے نذر کر دی۔ اس طرح آپ نے اس کوشش سے اُردو ادب کے خزانے کو مالا مال کر دیا گورنمنٹ نے بھی آپ کی ادبی خدمات کی قدر کرکے ۱۹۰۴ء میں آپ کو "شمس العلما" کا معزز خطاب عطا فرمایا جس کے بعد دس سال تک اور زندہ رہے۔ آخر ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۴ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

عادات و خصائل سے مولانا حالی ایک فرشتہ صفت انسان تھے، مزاج میں حد درجے کا تحمل و استغنا تھا

طبیعت متدین و منصف، اعتدال پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔ غرض کیا بلحاظ ذاتی اوصاف اور کیا بہ اعتبار ادبی خدمات آپ ہر حیثیت سے ملک کے ایک برگزیدہ بزرگ اور اُردو کے بہت بڑے محسن گزرے ہیں۔ اور جب تک صفحۂ دنیا پر ہندوستانی زبان کا نام و نشان باقی ہے، آپ کی ذات اور تصانیف اُردو لٹریچر کے لئے سرمایۂ ناز رہیں گی۔

## بہ حیثیت مصنّف

مولانا حالی کا شمار درحقیقت اُن چند مسیحا نفس بزرگوں میں ہے جنھوں نے اُردو زبان کے قالبِ بے جان میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اِن بزرگوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد، سرسید احمد خاں، شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد، شمس العلما منشی ذکاء اللہ اور شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ہیں، جن کو موجودہ لٹریچر کا بانی کہنا بجا نہ ہوگا۔

آزاد اور حالی کی بدولت تو نظم و نثر دونوں کے لئے ترقی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ دونوں صاحبوں نے قدیم و مقررہ راستوں سے ہٹ کر واقعہ نگاری اور تنقید کو اُردو ادب میں داخل کر کے طرزِ جدید کی بنیاد ڈالی۔ سرسید، مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ نے مختلف علوم و فنون اور متفرق مضامین و مسائل پر بڑے معرکے کی کتابیں لکھ ڈالیں جو اُردو کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگئیں، اور جن کی بدولت یہ لشکری زبان بالائی ہند کی تعلیم یافتہ جماعت اور شہری آبادی کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرنے لگی۔ مولانا حالی نیچرل شاعری کے بانی ہوئے۔ زمانۂ حال کا کوئی اور شاعر ایسا نہیں ہوا ہے جو مسدس مدوجزر اسلام اور اُن کی دوسری قومی نظموں سے متاثر نہ ہوا ہو۔ شاعری کے بہ نسبت مولانا حالی کے اُردو نثر پر کہیں زیادہ احسانات ہیں۔ کیونکہ ادبی حیثیت اور فن کے اعتبار سے آپ کی نظموں کے مقابلے میں آپ کے علمی مضامین اور تصنیف کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپ کی تصانیف نثر نے اُردو انشا پردازوں کے سامنے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔ جس کے لئے نہ صرف موجودہ زمانہ کے لوگ بلکہ آئندہ نسلیں بھی آپ کی زیر بارِ احسان رہیں گی۔

مولانا حالی ادنیٰ سے ادنیٰ واقعات سے اہم سے اہم معاملات تک جس صفائی و سادگی اور لطف کے ساتھ سلیس و عام فہم زبان میں بیان کر دیتے ہیں وہ اُن کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال ہے ان کی تحریر میں سلاست و روانی ہی کا لطف نہیں ہوتا بلکہ صداقت کا بھی زور و اثر رہتا ہے۔ دراصل وہ جو بات لکھتے ہیں پڑھنے والے کے دل پر نقش ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے حرف حرف سے اخلاص و ہمدردی معاملہ فہمی و نکتہ دانی مترشح ہوتی ہے، اور ہر لفظ اپنی جگہ پر موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اُردو میں سب سے پہلے آپ ہی نے نئے طرز کی سوانح عمریاں لکھیں۔ آپ کی حیاتِ سعدیؒ اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد غالبؔ اور سرسید کی سوانح عمریاں لکھکر آپ نے ملک پر احسان عظیم کیا۔ یہ کتابیں اُردو کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ ان میں حسنِ تفصیل اور مردم شناسی کے ساتھ فاضل مصنف نے اپنے ممدوحوں کے کل واقعات زندگی بلاکم و کاست قلمبند کر دیئے ہیں ان کی بدولت غالبؔ اور سرسید دونوں کی روزمرّہ زندگی، ان کے عادات و خصائل، بود و باش، مصائب و مشکلات اور خدمات و سیرت کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دونوں کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے ذاتی واقفیت اور صحیح معلومات کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ اس پر بھی کہیں ذاتی محبت اور دلی عقیدت واقعہ نگاری کے فرائض پر غالب نہیں آنے پائی اور تکمیل کی کوشش میں کسی جگہ حسنِ انتخاب کا اُصول نظر انداز نہیں ہوا۔

غالبؔ اور سرسید دونوں سے خواجہ حالیؔ کے بہت قریبی تعلقات تھے اور اسی سبب سے یہ سوانحعمریاں خاص وقعت کی مستحق ہیں، تاہم ان میں بیجا رعایت یا جنبہ داری سے کام نہیں لیا گیا ہے اور لطف یہ کہ ان ممدوحوں کی زندگی کا کوئی پہلو قلم انداز نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اُن کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور جزوی امور تک درج کر دیئے گئے ہیں، اور شروع سے آخر تک مصنف کی مورخانہ حیثیت میں فرق نہیں آنے پایا ہے۔

مولانا حالی کا طرزِ بیان جیسا اُن کی تصانیف سے بخوبی واضح ہے بہت صاف، سلیس اور شستہ ہوتا ہے، اسی لئے آپ کی کتابوں کا پڑھنا کسی کو گراں نہیں گزرتا۔ مبالغہ سے بھی آپ کو دلی نفرت ہے جو کچھ لکھتے ہیں صاف ستھری زبان، سنجیدہ و متین طرز اور دلنشین پیرائے میں لکھتے ہیں، اور تعریف ہو یا نکتہ چینی انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا ہے۔ اور مصنف کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اُن سے غافل نہیں ہوتے۔ ہر صفحے سے تلاش و تحقیق کا پتہ چلتا ہے اور سب کتابیں زمانۂ حال کے معیار کے مطابق پوری اُترتی ہیں۔

مولانا حالیؔ جیسا کہ اُن کے مقدمۂ شعر و شاعری سے بخوبی ثابت ہے فنِ تنقید کے جدید اُصولوں سے بھی پورے طور پر واقف اور ان پر عامل تھے۔ اُن کی سب سے پہلی کتاب "تریاقِ مسموم" ہے جو ۱۸۶۷ء میں ایک دیسی عیسائی کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد آپ نے طبقات الارض کے متعلق ایک عربی کتاب کا ترجمہ کیا جس کو پنجاب یونیورسٹی نے اپنی طرف سے شائع کیا۔ کچھ دنوں بعد آپ نے لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے "مجالس النسا" نامی ایک اور قابل قدر کتاب لکھی جو بہت مقبول ہوئی

اور اُس وقت کے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کو یہ کتاب اس قدر پسند آئی کہ اُنھوں نے لارڈ نارتھ بروک گورنر جنرل ہند سے سفارش کرکے مولانا حالی کو اس تصنیف کے صلے میں چار سو روپیے کا انعام دلایا پنجاب میں لڑکیوں کے مدرسوں میں یہ کتاب مدتوں پڑھائی جاتی رہی۔

آپ نے ایک فارسی قواعد بھی سررشتۂ تعلیم ہی کے ایما پر طالبعلموں کے لئے لکھی، اور رسالہ 'تہذیب اخلاق' (علیگڈھ) اور 'معارف' (پانی پت) وغیرہ رسالوں کے لئے تقریباً تیس۳۰ مضامین لکھے۔ اِن کے علاوہ آپ کی چار کتابیں 'حیات سعدی'، 'یادگار غالب'، 'حیاتِ جاوید' اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' خاص طور پر مشہور ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ ضخیم 'حیاتِ جاوید' ہے جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے اور سب سے مشہور 'یادگارِ غالب'، جس میں مولانا کی انشاپردازی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سلاست و روانی اور زور اور اثر بھی ہے۔ اس کے ہر صفحے سے سچی ہمدردی اور عقیدتمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا طرزِ بیان ہر جگہ سیدھا سادہ ہے جیسا کہ اُن کی تحریر کی عام خصوصیت ہے۔

درحقیقت مولانا حالی ضلع جگت کی بھول بھلیاں میں گھسنے یا شاعرانہ تخیل کی رفعتوں میں اُڑنے اور الفاظ سے کھیلنے کے عادی ہی نہ تھے۔ اور اُنھوں نے نامانوس الفاظ اور عربی فارسی ترکیبوں کے بیجا استعمال کو کبھی جائز نہیں رکھا۔ گو یہ درست ہے کہ سلاست و روانی میں سرسید کا درجہ آپ سے بھی بڑھکر ہے اور بیان کی رنگینی و دلکشی میں آزاد ان سے کہیں بالاتر ہیں لیکن جیسا کہ صاحب سیر المصنفین نے لکھا ہے "جو فلسفہ حالی کی تصانیف میں ہے آزاد میں اس کا پتہ نہیں، اور جن اَدَبی رموز پر حالی پہونچے ہیں وہاں سرسید کا گذر نہیں۔"

حالی کی عبارت میں ایک آہستہ بہنے والے صاف اور شفاف دریا کا لطف آتا ہے جو خس و خاشاک سے پاک اور گرد و غبار سے صاف ہے، اپنے مقررہ راستے پر معمولی چال سے بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کے یہاں کوئی مہمل یا مبہم فقرہ نہیں ملتا ہے، بلکہ موزوں اور مناسب الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے برابر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ شاذ و نادر ایک آدھ لفظ ایسا ملتا ہے جو عام استعمال میں نہیں ہے ورنہ حالی کی نثر زمانۂ حال کے مصنفین کے لئے بہترین نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ ربط و سلسلہ۔ زور و اثر سب باتیں اُن کی تحریر میں موجود ہوتے ہیں۔ بیجا تکلف اور تصنّع کا اُن کے یہاں کہیں پتہ نہیں ہے۔ خوش نصیبی سے حالی کو غالب جیسا یکتائے روزگار اُستاد ملا تھا۔ مولانا نے عرصۂ دراز تک اُن کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا جس سے اُن کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہوگئی اور سند کا کام دینے لگی۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب "مرزا کی بھی خوش نصیبی تھی کہ اُنھیں شاگرد بھی ایسا ملا جس نے اُن کا نام دنیا میں روشن کر دیا۔"

---

لہ ملاحظہ ہو مقدمہ مسدس حالی مطبوعہ انتظامی پریس کانپور۔

کوئی شک نہیں 'یادگار غالب' نے اِس یکتائے زمانہ استادِ فن کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اکثر لوگ مرزا غالب کے زمانہ میں اُن کی مشکل نویسی اور فارسی ترکیبوں کے استعمال پر پھبتیاں اُڑایا کرتے تھے جس سے جیتے جی اُن کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ ہر حیثیت سے مستحق تھے۔ لیکن لائق اور عقیدت گذار شاگرد نے ان کے مفصل حالات زندگی، ان کے کمال شاعری، اُن کی آزادروی اور اُلوالعزمی، خوش طبعی و بذلہ سنجی کی مکمل تصویر کھینچکر قدردانانِ سخن اور جوہریانِ ادب کو کلام و رقعاتِ غالب کی طرف مائل کر دیا۔ اسی کتاب کی بدولت عام لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ غالب کی قدردانی پر مائل ہوئے۔ چنانچہ اس وقت دیوانِ غالب کے جتنے اڈیشن اور جس قدر شرحیں موجود ہوگئی ہیں، کسی دوسرے اُردو شاعر کی نہیں۔ سب سے پہلے حالی نے اس بات کو ہمارے ذہن نشین کیا کہ اُن کا اُستاد اور ممدوح محض گل و بلبل، وصل و فراق، کاکل و عارض کا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ اُردو کا سب سے بڑا رمز شناس، حقیقت آشنا اور صاحبِ طرز شاعر ہے جس نے اپنے کلام میں نہ صرف حسن و عشق کے راز و نیاز ہی کھول کر رکھدئیے بلکہ تصوف و حق شناسی کے رموز اور حکمت و فلسفہ کے نکات بھی بیان کر دیے ہیں۔ غرض غالب کے ذاتی حالات اور خصوصیاتِ شاعری کا حال عوام کو یادگار غالب ہی سے معلوم ہوا اس لئے اس کتاب کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

نظم میں مولانا حالی کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کا مشہور و معروف مسدس "مدوجزر اسلام" ہے جو اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی نظم ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھیں۔ مثلاً برکھارُت۔ اُمید۔ حقوقِ اولاد۔ مناظرہ رحم و انصاف۔ حُبِّ وطن۔ حقوقِ نسواں۔ مرثیۂ غالب وغیرہ آپ کا دیوان بھی ہے جو طرزِ جدید کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ سبھی مستقل نظموں میں آپ کا طرزِ خاص نمایاں ہے، لیکن جو سوز و گداز مرثیۂ غالب میں ہے وہ بہت کم نظموں میں ہے، اور جو عالمگیر ہردلعزیزی مسدس مدوجزرِ اسلام کو حاصل ہوئی ہے وہ شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری قومی نظم کو نصیب ہوئی ہو۔ یہ مسدس اُن کی اسلامی ہمدردی کا آئینہ ہے۔ اس کا ہر بند مصنف کی قومی دلسوزی کا شاہد ہے۔ آپ کی دوسری نظمیں بھی مقبولِ عام ہوئیں، لیکن آپ کی اَدبی شہرت کا دارومدار نظم کی بہ نسبت نثر ہی پر ہوگا اور نثر کی کتابوں میں یادگار غالب آپ کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔



# خواجہ حالی

(از حضرت ابوالفاضل راز چاند پوری)

محفل ہندوستاں بے نور تھی
پردۂ ظلمت میں شمع طور تھی
بے اثر تھا نغمۂ سازِ سخن
بے خبر تھا محرم رازِ سخن
بادۂ مہر و وفا بے کیف تھا
رنگِ محفل لائقِ صد حیف تھا
شاعر و صوفی و رندِ پاکباز
حق پرستی سے تھے یکسر بے نیاز
دورِ جامِ خود پرستی عام تھا
جذبۂ حبِ وطن بدنام تھا
خود نمائی، خود فروشی، خود سری
بس انھیں پر تھا مدارِ زندگی
ناگہاں فطرت کو آیا کچھ خیال
صبحِ عشرت بن گئی شامِ ملال
حالیِ شیوا بیاں پیدا ہوا
شاعرِ ہندوستاں پیدا ہوا

مرحبا اے عندلیبِ خوش نوا
کس قدر دلدوز ہے نغمہ ترا
سوز خوانی کا عجب انداز ہے
سوز کے پردے میں پنہاں ساز ہے
اللہ اللہ یہ پیامِ جاں فزا
زیست کا احساس پیدا ہوگیا
انقلاب آور ہوئی تیری فغاں
چونک اٹھا خوابِ غفلت سے جہاں
اک صدائے درد میں اتنا اثر!
رہ گئی دنیا کلیجہ تھام کر
یادِ ماضی ہمت افزا ہوگئی
فکرِ حال و فکرِ فردا ہوگئی
بڑھ گیا جوشِ بہارِ زندگی
مٹ گیا کسل و خمارِ بے حسی
کھل گیا رازِ حیاتِ جاوداں
مرحبا اے شاعرِ ہندوستاں

# حالیؔ[1] ایک اِنسان کی حیثیت سے

از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ بی۔اے، ایل ایل۔بی

اِس عالمِ آب وگل میں ابتک بہت سی ہستیاں گذر چکی ہیں جن کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں اور جن کے ناموں کو ہم اپنے صفحۂ دل سے کبھی محو نہیں کر سکتے۔ آج سے سو برس پہلے اِسی خطّہ میں جہاں ہم رہتے ہیں اُس انسان کا ظہور ہوا جس نے اپنے آپ کو کبھی معمولی آدمی سے بڑھکر نہیں سمجھا حالانکہ وہ حقیقتاً نہایت غیر معمولی شخص تھا۔ وہ دن نہ صرف پانی پت کے لئے بلکہ تمام ہندوستان کے لئے روزِ سعید تھا جب خواجہ ایزد بخش کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا۔ اور جو بعد میں حالیؔ کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔

پانی پت کی سرزمین کئی مرتبہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اسی طرح پانی پت کا یہ فرزندِ رشید بھی کئی مرتبہ ہندوستان کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر چکا ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۷۴ء میں جب لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد پڑی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری اُمید پر، تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حبِّ وطن پر لکھکر یہ بتلایا کہ اب مسلمانوں کو اپنی قدیم اور فرسودہ شاعری سے دست بردار ہو جانا چاہیئے اور اس کی جگہ نئے خیالات کو نظم کرنا چاہیئے تاکہ اُن کے مردہ دلوں میں زندگی اور بیداری کے آثار پیدا ہوں اور وہ دُور از کار باتوں میں وقت صرف کرنے کے بجائے کارآمد اور مفید امور انجام دیں اور قوم کی قوم جو لغو اور بیکار مشغلہ شاعری میں مبتلا ہے راہ راست پر آکر تنزل کے بجائے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو۔ پھر ۱۸۷۹ء میں مدّ وجزرِ اسلام لکھا جو مسدسِ حالیؔ کے نام سے شہرت پذیر ہے اور اُس میں قوم کی تباہی کا حال اس تفصیل سے بیان کیا کہ کوئی بات باقی نہیں رہی اور سب کو نظر آنے لگا کہ واقعی ہم لوگ پستی میں ہیں اگرچہ اس احساس سے ہم نے کوئی معتد بہ فائدہ حاصل نہیں کیا تاہم ہم میں ایسے شاعر کا پیدا ہونا خود حیاتِ قومی کا بیّن ثبوت ہے۔ بعد ازاں ۱۸۹۳ء میں جب مقدمہ شعر و شاعری مع دیوانِ حالیؔ شائع ہوا تو وہ قوم جو حد سے زیادہ قدیم شاعری کی دلدادہ تھی اور جس کو قدیم شاعری نے دراصل تباہ کر دیا تھا حقیقی

---

[1] یہ مضمون مولانا حالیؔ کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر جو پانی پت میں ۲۶۔۲۷۔۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو منائی گئی تھی پڑھا گیا تھا۔

اور اصلی شاعری کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اگرچہ اس میدان میں اُس کی رفتار تیز نہیں ہے مگر رفتہ رفتہ آخر کار یہی منزلِ مقصود قرار پائیگی۔

خبرم نیست کہ منزل گہِ مقصود کجاست ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

لیکن ہم کو یہاں نہ یہ ثابت کرنا ہے کہ حالی کا درجہ بلحاظ شاعری کیا تھا اور نہ ہم کو یہ دکھلانا ہے کہ وہ کیسے نثار اور انشاپرداز تھے۔ اِس وقت ہم کو یہ دکھلانا ہے کہ جو انسانی صفات حالی میں پائی جاتی ہیں وہ دوسرے شعرا اور مصنفین میں نہیں پائی جاتیں۔ خوبیاں اوروں میں بھی جلوہ گر ہیں یہ بھی سچ ہے کہ صرف خدائے واحد و لاشریک لہٗ کی ذات بے عیب ہے لیکن کم از کم ہم کو حالی کی کوئی برائی معلوم نہیں اور ہمارے سامنے اُن کی زندگی آئینہ کی طرح صاف و مجلّٰی ہے اور اُس کا کوئی تاریک پہلو ہم کو نظر نہیں آتا ہے شاعروں کا کمال اُن کے کلیات کے صفحات پر روشن و ہویدا ہوتا ہے اور مصنفوں کے جواہر پارے اُن کی کتابوں میں بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ مگر جو خوبیاں اور نیکیاں کسی انسان کے وجود سے وابستہ ہوتی ہیں وہ اُس کے بعد ناپید ہوجاتی ہیں اور اُن کا نمونہ آنکھوں کے سامنے باقی نہیں رہتا۔ اس لئے حالی کے بعد ہم کو اُن کی خوبیوں کی جستجو بے سود ہے کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے، اور خود غرضی، خودرائی، انانیت رشک وحسد، تعصب و تنگ نظری، تنگدلی اور جاہ پرستی کا دور دورہ ہے ایسی حالت میں کیا اُمید کیجائے کہ اب پھر ایسے انسان دنیا میں آئینگے جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

جس طرح سعدی کو شیراز اور اُس کے قرب وجوار میں علما اور مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر دیکھکر تحصیل علم کا شوق ہوا، اُسی طرح حالی کو بھی پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی وغیرہ کو دیکھکر اکتسابِ علم کا مشغلہ پسند آیا۔ جس طرح وطن کے مکروہات اور موانع نے شیخ کو ترکِ وطن پر مجبور کیا اور اُس نے مدرسۂ نظامیہ بغداد میں جاکر تحصیل علم شروع کی، اُسی طرح عنفوانِ شباب کے تأہل اور دیگر وجوہ نے خواجہ کو پانی پت سے دارالعلم دہلی میں پہنچا دیا۔ بقول خواجۂ مرحوم "قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکرِ خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے" لہٰذا یہی جذبہ تھا جو حالی کو مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں کشاں کشاں لے گیا، اور جب ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھکر اُن کو دکھائی تو اُنھوں نے فرمایا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔" بعدازاں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی مصاحبت بھی اُن کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر کرنے میں

کامیاب ہوئی اور شیفتہ کی صحبت میں حالی کا طبعی میلان بھی جو مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔

اگرچہ مختلف باکمال اصحاب کی زندگی کے مطالعہ سے ایک صحیح الدماغ شخص اپنے لئے شاہراہِ عمل تیار کر لیتا ہے لیکن اخلاق و عاداتِ حسنہ زیادہ تر وہبی ہوتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ جب آپ دہلی میں زیرِ تعلیم تھے اور اندازاً بیس سال کی عمر تھی تو آپ نے ایک عربی رسالہ تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تھا۔ آپ کے اُستاد نے پڑھ کر بہت خفگی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ اُس کو چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن اُستاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ گو رسالہ لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا اس لئے چاک کر دیا گیا۔ اس مثال سے جہاں مولانا کی بے تعصبی کا اظہار ہوتا ہے وہاں اپنے اُستاد کا ادب اور صبر و تحمل بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا کی انصاف پسندی اور دوسرے لوگوں کی کوتاہی کی نرم تاویل اس مثال سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں جو مولانا کے معتقد ہیں اور کسی زمانہ میں رسالہ افسر کے ایڈیٹر تھے :۔

"جن لوگوں کو آپ نے اِس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ اُن کے کلام پر کرٹکل ایسے" لکھے جائیں اُن میں سے ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد میرے نہایت دوست ہیں اور اُردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال اُنھوں نے دکھلایا ہے اُس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں، اُن کی ڈکشنری پر ۱۸۸۸ء میں ایک لمبا ریویو میں خود لکھ چکا ہوں مگر ماڈرن اُردو لٹریچر کا ہیرو میں اُن کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت اُن کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔"

مولانائے مرحوم ایک صاحبِ باطن بزرگ تھے، اُن کے پاس بیٹھنے اور باتیں سُننے سے بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زبان سے کبھی کسی شخص کی بُرائی نہیں کی۔ مخالفین نے آپ کی شاعری کے متعلق بیحد نکتہ چینی کی اور اودھ پنچ لکھنؤ نے عیب جوئی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا لیکن

آپ نے ایک لفظ بھی کسی کے خلاف نہ کہا اور کہا تو یہ کہا:-

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ سب کچھ کہا اُنھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

یا یہ ارشاد فرمایا:-

گو کہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

آپ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے اور اس لحاظ سے "ظن المومنین خیرا" کے مصداق تھے۔ مکتوباتِ حالی میں اس قسم کی مثالیں بہت ملیں گی۔

آپ کو اپنے عزیزوں سے بےحد محبت تھی۔ ایک خط خواجہ غلام الثقلین کی بیوی کے نام لکھا ہے جو مولانا کی پوتی تھیں۔ اُس کے چند فقرے نقل کرتا ہوں جن سے محبت ٹپکی پڑتی ہے اور جن میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک نہیں:-

"تمھارا خط عین انتظار میں پہنچا، اُس کو پڑھکر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمھاری پھپّی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دُور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھادی ہے۔ تمھاری دادی ہر وقت تمھاری صحت و سلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمھاری صحت اچھی ہوجائیگی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کے یقین دلاؤ کہ میں وہی ...... ہوں"

اسی خط میں مکتوب الیہا سے جو فروگذاشت ہوگئی تھی، کس عمدگی کے ساتھ اُسکی تلافی کے لئے توجہ دلاتے ہیں:-

"ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے، دادی ہو کے نام بھی بھیجنا اور اُس میں یہ لکھنا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا نہایت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔"

اِس خط کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

"تمھاری دادی کے سوا اس وقت گھر میں کوئی نہیں، تمھیں بہت بہت دعا دیتی ہیں اور پیار کرتی ہیں اور بلائیں لیتی ہیں۔"

عبدالوالی کو جو مولانا کا نواسہ ہے اور مرض صرع میں مبتلا ہے بہت عزیز رکھتے تھے اور وہ اکثر اُن کے پاس آ رہتا تھا اور ایسے سوالات کرتا تھا اور بار بار پوچھتا تھا کہ بے اختیار غصہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ فرہنگ آصفیہ کی ایک جلد مولانا حالی کے پاس ریویو کی غرض سے آئی تھی۔ یہاں عبدالولی اس کو پڑھتے تھے اور کہیں کہیں مولانا سے

---

ؔ رسالہ جامعہ بابتہ ماہ دسمبر ۳۳ء صفحہ ۵۴۴

سوالات کرتے جاتے تھے اور ہندی کی چندی نکالتے تھے۔ مولانا نہایت تحمل سے جواب دیتے تھے اور نہایت عمدہ طریقے سے سمجھاتے تھے۔ ایک آدھ جگہ مولانا نے فرہنگ آصفیہ سے اختلاف بھی کیا۔

خواجہ سجاد حسین صاحب سے بھی بیحد محبت تھی، اُن کے نام جو خطوط چھپے ہیں اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی صحت کا خیال خود حضرت حالی کو کس قدر تھا۔

مولانا حالی غریبوں کی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ آپ کا ایک پرانا ملازم تھا جو بہرا بھی تھا اور لنگڑا بھی اور بقول سلیم مرحوم مولانا حالی کے نقطۂ نظر سے اگر وہ اندھا بھی ہوتا تو ایک اور خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔ بہرحال آپ نے کبھی اُس کو علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ظاہر ہے کہ اُس سے بہتر ملازم اُن کو مل سکتا تھا اور وہ خدمت کے لایق بھی نہ تھا، چنانچہ ایک اور نوکر رہتا بھی تھا۔

آپ علماء کی بیحد قدر و منزلت کرتے تھے اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اگرچہ اس پاسداری میں اُن کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ چنانچہ خاکسار کی شادی میں شرکت کی غرض سے جب غازی آباد تشریف لے گئے اور وہاں پہونچے جہاں برات مقیم تھی تو مولانا ہانپ رہے تھے اور سانس پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ ہرچند کہا گیا کہ وہ مسند پر آرام سے بیٹھیں لیکن اُنھوں نے منظور نہ کیا۔ پھر حضرات علما، جو شریک شادی ہوئے ایک ایک کرکے داخل ہونے لگے اِن حضرات میں جن کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ ہوگی شیخ الہند مولوی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور دیگر علمائے دیو بند بھی تھے مولانا حالی نے تعظیماً اُٹھنا چاہا تو خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے کہا کہ آپ بیٹھے رہیئے آپ تھکے ہوئے ہیں۔ لیکن مولانا نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور ہر ایک کی کھڑے ہو کر تعظیم کی۔

مولانا کسی کی دل آزاری پسند نہ کرتے تھے اور جہاں تک اُن کے امکان میں ہوتا تھا کسی شخص کی استدعا کو رد نہ کرتے تھے۔ پیرانہ سالی کی وجہ سے وہ خود پانی پت میں بھی اپنے عزیزوں کی شادیوں میں شریک نہ ہو سکتے تھے لیکن میری درخواست کو اُنھوں نے محض اس وجہ سے شرف قبولیت بخشا کہ مجھکو اُن کی عدم شرکت سے رنج ہوگا۔ سُنا ہے کہ خواجہ تصدق حسین نے جو مولانا کے حقیقی بھتیجے تھے اور اُس وقت دہلی میں سب جج کے عہدہ پر ممتاز تھے دہلی اسٹیشن پر غازی آباد جانے سے روکنا چاہا اور کہا کہ آپ کی عمر اس قابل نہیں کہ آپ سفر کی زحمت برداشت کریں اور لوگوں کی شادیوں میں شرکت کریں، آپ کو سخت تکلیف ہوگی، لیکن اُنھوں نے نہ مانا اور اپنا وعدہ پورا کیا۔

جب انسان کو غصہ آتا ہے تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا لیکن خواجۂ حالی پر آتش غضب کا

کم اثر ہوتا تھا۔ ایک صاحب جو علم دوست بھی کہے جا سکتے ہیں اور سرسید کے بھی معتقدین میں سے ہیں حیات جاوید کے متعلق باربار دریافت فرماتے رہتے تھے کہ کب تک شائع ہوگی، لیکن اس قدر اظہارِ شوق کے بعد بھی حیات جاوید کو انھوں نے علیگڈھ ڈیوٹی شاپ سے خریدنے کی تکلیف گوارا نہ کی، اور غالباً اُن کا منشا تھا کہ مولانا حیات جاوید اُن کی نذر کریں، چنانچہ اُن کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ حیاتِ جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی ڈیوٹی شاپ میں پہنچ گئیں مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے کتاب منگوالی ہوگی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلا شبہ ایسا تھا کہ اُس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاصکر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہیے مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹادی ہے جن لوگوں سے یہ اُمید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرینگے اُن کی طرف سے سرد مہری کے سوا میں نے ابتک کچھ نہیں دیکھا۔

اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہئیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی نا قابلیت کے اس بارگراں کو اپنے ذمہ لیکر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہے اور اسی لئے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سرسید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے مگر آجتک کسی نے اس کی بات نہیں پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ اُن کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃً پیش کیجائے"

مذہب کے لحاظ سے مولانا نہایت بے تعصب تھے، اُن کے والدین شیعہ تھے اور مرحوم کو یتیم چھوڑکر والد ماجد انتقال کر گئے تھے۔ بچپن میں مذہب اہل سنت میں تعلیم پائی تھی کیونکہ اُن کے برادر بزرگ خواجہ امداد حسین سُنّی ہوگئے تھے اس لئے آپ سُنّی المذہب رہے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محب اہل بیت اور صوفی مشرب سُنّی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلاف کو وہ نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقۂ نماز کے علاوہ اور کسی طرح اس اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے عموماً پسری اولاد سُنّی ہیں اور دختری اولاد شیعہ۔

آپ میں عدل و میانہ روی اور رحم و مرّوت کی صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اخلاق میں؛

عادات میں، برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ آخر زمانہ میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ یورپ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا جب بہت سے آدمیوں کے مقتول اور زخمی ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سُنی ہے۔ انتقال کے وقت خدمتگار اُن کو الگ روتے تھے کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا اور یہی حالت رشتہ داروں اور اہل شہر کی تھی۔

آجکل لوگوں میں استغنا اور قناعت کی صفات عنقا کا حکم رکھتی ہیں، مگر مولانا ان سے متصف تھے۔ جب حیدر آباد سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو آپ نے عربک اسکول دہلی کی ملازمت ترک کر دی اور حالی سکّے کے سو روپے جو اسّی روپیہ ماہوار کے قریب ہوتے ہیں اپنی گزر اوقات کے لئے کافی سمجھے حالانکہ یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی۔

اُن کے اکثر رشتہ دار کہا کرتے تھے کہ مولانا کے ہاتھ میں برکت ہے۔ وہ اس قلیل آمدنی میں نہایت عمدہ طور پر گزر کرتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تھوڑی سی آمدنی میں ایسی عمدگی کے ساتھ کس طرح رہتے ہیں۔

مولانا نے کبھی اپنے لئے سفارش نہیں کرائی۔ حالانکہ سر سالار جنگ اول مدارالمہام حیدر آباد (دکن) جن پر سرسید کا پورا اثر تھا مولانا حالی کو ذرا سے اشارہ پر اعلیٰ درجہ کا عہدہ دیدیتے۔ لیکن مولانا کی غیور طبیعت نے اِسے جائز نہ سمجھا۔ علاوہ ازیں وہ اگر تحریک کرتے تو علی گڑھ کالج میں فارسی کی پروفیسری بھی ملنا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ مگر انھوں نے اس کو بھی پسند نہیں کیا بلکہ اپنی ذات کو قوم کے لئے زیادہ مفید بنانے کی غرض سے آزاد رہ کر قومی خدمت کو زیادہ مناسب سمجھا۔

مولانا کے حلم و کرم کا ہر شخص پر وجد انگیز اثر ہوتا تھا اور ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی جس قدر جلد اُن کی خدمت میں بے تکلف ہو جاتے تھے اور انھیں اپنا محرم راز بنا لیتے تھے۔ اس کی مثال میں یہ لطیفہ پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا بغرض تبدیل آب وہوا فرید آباد گئے تھے، وہاں آپ کا ناواقف نوکر خط بنانے کے لئے ایسے نائی کو لے آیا جو خاندانی حجام تھا لیکن حقیقت میں ایک نشہ باز آوارہ مزاج سا آدمی تھا۔ خط بناتے بناتے کہنے لگا "اجی مولوی صاحب ایک کام تو آپ ہمارا بھی کر دیجئے" اور کام یہ بتایا کہ "حضور! میرا ایک عورت پر دل آگیا ہے مگر اُس کے بھائی بندوں نے بہکا دیا، شادی نہیں کرتی۔۔۔۔ حضور کوئی ایسا تعویذ لکھ دیں کہ اپنے آپ میری خوشامد کرتی پھرے۔" مولانا کو بہت ہنسی آئی مگر ضبط کیا اور نام پتہ وغیرہ دریافت کر کے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں تمھارے لئے ہم کوئی تدبیر کریں گے۔

پھر جب محلے کے ذی وجاہت اشخاص مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مرحوم نے بہت شدومد سے چھٹو نائی کی سفارش کی اور جب تک اُنھیں یہ یقین نہ دلایا گیا کہ اُس کے ساتھ شادی کرنا بیچاری عورت کو مصیبت میں پھنسانا ہے وہ چھٹو کی وکالت کرتے رہے۔

مولانا میں کسی قدر مزاح بھی تھا۔ ایک بار میں اُن کی خدمت میں پانی پت حاضر ہوا تو اُنھوں نے خاص طور پر ایک کنوئیں سے پانی منگوایا تھا جس کا مجھ کو علم نہ تھا۔ میں نے پانی پیا تو مولانا سے عرض کیا کہ یہ پانی تو کھاری ہے۔ مولانا ہنس پڑے اور فرمایا کہ ناحق آپ کو ایک گلاس پانی دیکر ضائع کیا ہمارے نزدیک تو یہ شیریں اور عمدہ پانی ہے اور خاص طور پر ایک میل سے منگایا جاتا ہے۔ ہم نے ناحق تکلیف کی۔ قریب ہی کے کنوئیں سے پانی منگا کر پلا دیتے، آپ اسے بھی کھاری کہتے ہیں اور اُسے بھی کھاری کہتے۔

مولانا حالی مجھ سے عزیزانہ اور بزرگانہ برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کتاب یا کسی چیز کے بھیجنے کے لئے اُنھوں نے مجھے لکھا تو میں نے چاہا کہ اُن سے قیمت نہ لوں لیکن وہ ناخوش ہوئے اور مجبوراً مجھ کو قیمت لینی پڑی۔ جب وہ میری شادی میں تشریف لائے تو میں نے ہرچند چاہا کہ کرایہ آمد و رفت قبول فرمالیں لیکن اُنھوں نے منظور نہ کیا۔ ایک خط میں جو میرے نام ہے تحریر فرماتے ہیں:-

"عزیزی! دیوانِ دلگیر کی تلاش میں جو تکلیف آپ نے اُٹھائی اُس کا میں شکریہ دل سے ادا کرتا ہوں مگر اسی کے ساتھ یہ شکایت بھی کرتا ہوں کہ آپ نے دیوان کی قیمت اور قرضۂ سابق کی مقدار سے مطلع نہیں فرمایا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو پھر کبھی اس قسم کی تکلیف نہ دوں۔ ایسی باتوں سے بجائے اس کے کہ محبت زیادہ ہو اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مہربانی فرما کر صاف صاف لکھ بھیجئے کہ مجھے کیا دینا چاہیئے"

ایک بات مجھے ہمیشہ عجیب معلوم ہوئی کہ میں جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اطمینانِ قلب میسر ہو جاتا تھا اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہتی تھی۔ غرض ایک عجیب سماں ہوتا تھا۔ یہ بات آجکل کے صوفی مشرب بزرگوں کے یہاں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ جب ۱۹۲۵ء میں پانی پت آیا تو مولانا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی غرض سے پہنچا، چنانچہ قبر پر بھی مجھے وہی سکونِ قلب حاصل ہوا جو اُن کی خدمت بابرکت میں حاصل ہوتا تھا۔

آتا ہوں پیرِ دیر کی خدمت سے مست میں ــــ اے زاہدو تمھارے لئے کیا دعا کروں



# شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

(نتیجۂ فکر مولوی محمد عبد الشافع صدیقی)

ہر زمانہ میں ہوئی ہیں وہ مبارک ہستیاں
زندۂ جاوید جن کا ہوگیا نام و نشاں

دے گئے تہذیب اور اخلاق کے لاکھوں سبق
کارنامے اُن کے ہیں تاریخ کا روشن ورق

خود مٹے اور مٹ کے مردہ قوم کو زندہ کیا
ذرۂ ناچیز کو اِک نیّرِ تابندہ کیا

تیرہ سو برس گزرے کہ پیدا ایک مردِ حق ہوا
درد سے قوم و وطن کے جس کا سینہ شق ہوا

تھا وہ دیوانہ مگر عشقِ حجازِ پاک میں
ڈھونڈھتا تھا ذرۂ خاکِ عرب ہر خاک میں

آرزو تھی قوم میں پیدا ہوں خالد سے جواں
آشکارا قرنِ اول کی ہو جن سے عز و شاں

نام ہو دربار میں اور ساکھ ہو بازار میں
کار فرما ہوں یہی دنیا کے کاروبار میں

صنعت و حرفت تجارت کی طرف مائل ہوں یہ
قانعِ تقدیر ہیں تدبیر کے قائل ہوں یہ

دہر میں عالم نہیں، فاضل نہیں، کامل نہیں
ہر طرح لائق بنیں یہ ہر طرح قابل بنیں

میکدے جائیں نہ یہ بنکر فقیرِ میکدہ
ہوں یہ پیرِ میکدہ یا ہوں امیرِ میکدہ

کچھ نہ کچھ اِن پر اثر پڑ جائے میرے نام کا
یہ بنادیں پھر زمانے کو زمانہ کام کا

الغرض ہر رنگ میں دلسوز اور ہمدرد تھا
پیکرِ الطاف تھا مہر و وفا میں فرد تھا

وہ نہیں محفل میں لیکن تذکرہ محفل میں ہے
لب پر اُس کا نام ہے تصویر اُسکی دل میں ہے

ہم نے یہ مانا نہیں ہے آج حالی سامنے
کیوں نہ کہدیں رکھ کے تصویرِ خیالی سامنے

اے حقائق آشنا اے فارغ از یاس و اُمید
ماہرِ رنگِ کہن اے موجدِ طرزِ جدید

ناخدائے کشتیٔ طوفاں نصیبِ اہلِ فن
خاتمِ پیغمبرانِ نظم۔ خلّاقِ سخن

اے طبیبِ قوم، نبّاضِ رگِ جانِ وطن
مرثیہ خوانِ عروج و شوکتِ شانِ وطن

شہدِ غیرت بھی دیا جامِ شرابِ جوش بھی
ہوش جاتے دیکھکر بخشی دوائے ہوش بھی

کرکے نالے خوابِ غفلت سے جگایا قوم کو
دیکے طعنے ہر جگہ آگے بڑھایا قوم کو

پندگو کے بھیس میں کردار سے واقف کیا
محتسب کے رنگ میں اطوار سے واقف کیا

صورتِ ماضی دکھا کر آئینہ میں حال کے
نقش روشن کردیئے سب نکبت و اقبال کے

جبکہ اقبال و زوالِ قوم پر نظریں پڑیں
جزر و مد دونوں کی تصویریں برابر کھنچ گئیں

سخت باتیں بھی سُنائیں نرم جملے بھی کہے
اِس لئے، ان کا شمار اقوامِ زندہ میں رہے

تو نے جو کہا ہے خدا مقبول [illegible]
[illegible]

# مسدس حالی

(از سید مقبول حسین صاحب احمد پوری، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

میتھیو آرنلڈ[1] نے نظم کو زندگی کی تنقید قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کے دو پہلو ہیں:۔

اول یہ کہ نظم اپنے عام انداز کے اعتبار سے زندگی یا معاشرت کی صورت حال کا ریکارڈ ہوتی ہے یعنی زمانے کے دلی جذبات نظم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً اُردو زبان میں عہد متوسط کے یاس آمیز جذبات شعرائے وقت کی مایوس کن ذہنیت کا ثبوت ہیں۔

دوم یہ کہ نظم کسی خاص وقت کی معاشرت کے حسن وقبح کو ظاہر کرنے کے لئے ارادتاً لکھی جاتی ہے۔

اول الذکر پہلو کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اگر شاعری کسی نوجوان دل کے جذبات کا اثر لئے ہوئے ہے تو نظم میں بھی شباب کی خوبو ہوگی اور اگر دوسرے قسم کے ہیجان انگیز جذبات ہیں تو وفور جوش کے اعتبار سے نظم بھی شعلہ فشاں ہوگی۔ درحقیقت جب شاعر اپنے طوفان انگیز جذبات نہیں روک سکتا ہے تو وہ نظم نہیں بلکہ ایک سیلاب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُردو میں اس قسم کی نظمیں بہت کم ہیں۔ مرزا رفیع سودا کے ہجو آمیز قصائد میں اُس زمانہ کی معاشرت کی کوئی خاص تنقید نہیں ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے ہجو ملیح سے بریاں کئے ہوئے اشعار کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کیونکہ اُن میں تضحیک وتمسخر کی اس قدر زیادہ آمیزش ہے کہ اُس زمانے کی تاریخ کا اُن پر کسی طرح اطلاق نہیں ہوسکتا۔ البتہ مسدس حالی اپنے زمانہ کی منظوم تاریخ ہے۔ اسی طرح کچھ کچھ اقبال کا "شکوہ اور جواب شکوہ"۔ ان کا مقابلہ ملٹن کے "فراق فردوس"[2] اور بائرن کے "چائلڈ ہرولڈ پلگریمیج"[3] سے کیا جائے تو یہ اُن سے کسی حالت میں کم نہیں ٹھہرے گی۔

کسی محقق کا قول ہے کہ نظم لکھنے والے کو بذات خود ایک سچی نظم ہونا چاہیئے۔ واقعی اس کا دل ایسا ترازو ہونا چاہیئے جو زمانے کی بلندی وپستی کا موازنہ کرے اور معاشرت کے حُسن وقبح کو بخوبی تول سکے۔ وہ عدل وانصاف، راستبازی اور صداقت کی شگفتگی سے ہر قسم کی رکیک بیہودہ اور خارج از قیاس باتوں کا قلع قمع کرسکے۔ غالباً اسی قسم کی شاعری کو حالی نے نیچرل شاعری کہا ہے۔ اس طرح ایک شاعر کے فرائض بہت کچھ

---

۱؎ Essay on Wordsworth

۲؎ Milton's "Paradise Last"

۳؎ Byron's Child Herold Pilgrimage"

ہو سکتے ہیں۔ اور اگر شعر گوئی کا مادہ یا طبع موزوں ایک عطیۂ الٰہی ہے تو شاعر کو خدا کا پیغامبر بھی کہا جا سکتا ہے بشرطیکہ اُس کا رُجحان خدائے برحق اور اس کے بندوں کی خدمت کی طرف ہو۔ ایسا ہی شاعر "تلمیذ الرحمٰن" کہلانے کا مستحق ہے۔ ورنہ بصورت دیگر شاعر شیطان کا جانشین یا صحیح معنیٰ کر کے آیۂ "الشعراء یتبعھم الغاوٗن"[1] کے مفہوم کا مصداق ہے۔

یہ تو شاعر کے دلی رُجحان کا ذکر ہوا، لیکن نظم کی کامیابی و ناکامی کا بہت کچھ دار و مدار سامعین کی ذہنیت پر ہے۔ مسدس حالی نے قوم میں ایک انقلاب ضرور پیدا کر دیا ہے مگر یہ انقلاب ایسا نہیں جیسا کہ خود بقول حالیؔ بائرن کی نظم نے انگلستان اور یورپ میں پیدا کیا تھا اور جس کی وجہ سے اہل یورپ آخری "کروسیڈ"[2] کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں اب تک لوگ شاعری کو محض "دل بہلاوا" یا "ذریعۂ نشاط" سمجھے ہوئے ہیں۔ انیسؔ نے اس "شاہدِ عشرت" کو تقدیس کا جامہ پہنایا اور حالیؔ نے اس کو غفلت زدہ قوم کے بیدار کرنے کا آلۂ کار بنایا۔

بعض اوقات گو شاعر کسی خاص موضوع کا موجد نہیں ہوتا پھر بھی اس کے اشعار پیکر رعنائی اور نمونۂ کمال معلوم ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے مسدس حالیؔ کی خوبی اس کے موضوع میں نہیں بلکہ اندازِ بیان کی نوعیت میں ہے، ورنہ کسی سعدی منش مولوی شاعر کی دو بسیط مثنویاں[3] بھی ہیں جو ادبی حیثیت سے کچھ زیادہ مشہور نہیں ہوئیں لیکن تاریخی اعتبار سے انھیں اردو زبان میں "شاہنامۂ اسلام" کہنا بیجا نہ ہو گا۔ کیونکہ ان میں عربوں کی معرکہ آرائیاں مسدس حالیؔ کی بہ نسبت کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مگر ان میں کہیں وہ جذبہ نہیں جو اقبالؔ کے اس ایک مصرعہ میں ہے:-

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

یا مسدس حالی کے اس بند میں:-

گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی
پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور چمک دُور دُور اُس کی پہونچی
جو ٹیگس[4] پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

---

[1] شعرا شیاطین کا تتبع کرتے ہیں۔ [2] "Crusade" اس نظم کے ایک حصہ میں بائرن نے فرانس انگلستان اور روس کو غیرت دلائی ہے اور یونان کو ترکوں کی اطاعت سے آزاد کرانے پر برانگیختہ کیا ہے۔۔۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دفعتہً یونان نے ٹرکی سے بغاوت اختیار کی تو ۱۸۲۷ء میں یورپ کے متفقہ جہاز کے بیڑے نے ٹرکی کو شکست دی اور یونان کو آزاد کرنے پر مجبور کیا۔" (مقدمۂ شعر و شاعری)

[3] صمصام الاسلام اور قمقام الاسلام اردو زبان میں دو مثنویاں ہیں۔ [4] ٹیگس اسپین کے ایک دریا کا نام ہے۔ ۱۲

یا آثار صنادید اسلام پر مسدس کا یہ بند:۔

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا — دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جا بجا میل و فرسنگ کے برپا — سرِ رہ کنوئیں اور سرائیں مہیّا
اُنھیں کے ہیں سب نے یہ چربے اُتارے
اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

نہیں اس طبق پر کوئی برِّ اعظم — نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب۔ ہند۔ مصر۔ اُندلس۔ شام و دیلم — بناؤں سے ہے ان کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
ملے گا جہاں جاؤ گے کھوج اُن کا

یہ حُسنِ بیان دراصل ایک قسم کی جدّت ہے جو مسدس کی جان ہے ورنہ جو خیالات شاعر کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں عموماً نئے نہیں ہوتے۔ اصل شئے تو جذبات کی رَو ہے جو خیالات کو اپنے ساتھ بہا لیجاتی ہے جس طرح ایک مقرر کو اپنے سامعین کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے بلندی و روانی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نظم میں کوئی اکتسابی خوبی پیدا نہیں ہوسکتی جبتک کہ شاعر کے دل میں اس قسم کے جذبات کی اہلیت نہ ہو۔ اسی لئے شاعر کو ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کے دل میں ہمدردی اور ترحم کے جذبات پیدا کرنے کا باعث ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے احساس میں اتنی قوت بھی ہو جس سے امید و بیم سے اثر پذیر ہونے والی کیفیت پیدا ہو سکے۔ مسدس حالی میں اول الذکر خصوصیات اور ضمیمہ مسدس میں مؤخر الذکر احساسات کا پُورا عکس موجود ہے۔ ان دونوں نظموں کا موضوع کسی ایک جذبے کے ماتحت نہیں ہے، اس میں حُزنیہ اور طربیہ دونوں پہلو نمایاں ہیں، ان میں تاریخی واقعات بھی ہیں اور تہذیب و اخلاق کا درس بھی، مرثیہ کا بھی رنگ ہے اور رجز کا بھی۔ شاعر کا امید افزا پیام بھی ہے اور قوم کے غفلت کی فردِ جرم بھی۔ غرض مسدس بہت سی نادر صفات کا مجموعہ ہے

ملٹن نے جو کتاب "فراق فردوس" (Paradise Lost) کے نام سے لکھی ہے اس کا مقصد بظاہر تفسیر مذہب ہے لیکن دراصل وہ پیام آزادی ہے۔ اس کی دونوں نظمیں اس مصرعہ کی تفسیر ہیں:۔

"دوزخ کی حکومت جنت کی غلامی سے بہتر ہے"

---

Land-strip South of the Caspian Sea — And l'usia in Spain
"Mark Pattison the English Critic" — Siera Albeda in Spain
"Better to reign in hell thantoserve in heaven" Paradise lost (i) 263

کسی فارسی شاعر نے ایک دوسرے پہلو سے اس کی تفسیر ذیل کے شعر میں خوب کی ہے :۔

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

مسدس حالی کا ماخذ بھی اسی قسم کا ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

اس دنیا کے ڈھنگ نرالے دُکھ بن سُکھ نہ ہوئے
کام کرے جو وہ پھل پائے کاٹے وہ، جو بوئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے
جاگے دنیا والے اور تو نینوں نیند سموئے
جیتے دنیا والے اور تو اپنے آپ کو کھوئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے
ڈھیل ڈھال کا سمے نہیں اب چھوڑ یہ آنا کانی
اپنے پیروں آپ کھڑا ہو اٹھ جلدی اے گیانی
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے
قدم بڑھا اب آگے پیارے مار نہ ٹامک ٹوئے
تیری اس غفلت اور ڈھیل پہ بھارت بھومی روئے
جاگ جاگ رے سونے والے ایسا کوئی نہ سوئے[1]

خواجہ صاحب چاہتے تو اپنے مسدس کا موضوع تمام و کمال کسی "شاہنامۂ اسلام" وغیرہ کے مطابق رکھتے مگر اُن کی نظم میں عملی افادیت کا پہلو نمایاں ہے، اور اس لحاظ سے وہ کامیاب بھی ہوئے۔ مولانا حالی مذہبی لٹریچر سے کوئی واقعہ لیکر مسدس کی صورت میں نظم کر سکتے تھے اور جو ملٹن کے "فراق فردوس" کی آواز بازگشت ہوتا۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ الف لیلہ میں اور اس میں کوئی زیادہ فرق نہ ہوتا۔ غالباً اسی خیال کو مدنظر رکھکر انھوں نے اس کے متعلق دیباچہ میں معذرت بھی کی ہے[2]۔

حالی کا پیام عوام کے نام ہے جن میں اہل فن بھی شامل ہیں جو قدرتاً فنی باریکیوں کی جانب جلد رجوع

---

[1] نظم کا سندیس (رہنمایوں)

[2] اس نظم میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ، یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے، نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی نہ مبالغہ کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی...... اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے کی گئی ہے۔ (حالی)

ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کی توجہ معمولی باتوں کی طرف ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کا خیال کرکے مسدس میں بلا کی سادگی برتی گئی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے الفاظ کو انسان تصور کیا جائے تو یہ استعارہ بیجا نہ ہوگا کہ حالی نے اُنھیں جبہ و عمامہ پہنا کر واعظِ خشک کی صورت میں پیش نہیں کیا اور نہ کسی خانقاہ کا رند بنایا، نہ زرق برق پوشاک و زیور سے مرقع کرکے حسن و ادا کاری کا پیکر بنایا بلکہ مسدس کا ہر لفظ ایک سفید پوش سادہ گفتار، متین و سنجیدہ ریفارمر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اُس زمانے کی کیفیت دردناک و عبرت انگیز لہجے میں بیان کی گئی ہے۔ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے  اسلام کا گرکر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کوئی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد  دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

حقیقی شاعر وہی ہے جو تخئیل اور الفاظ کے ساتھ اپنے دلی احساسات کو ہم آہنگ کرکے اہلِ دل اور خیال دونوں کی دنیا میں ایک ایک انقلاب عظیم پیدا کر سکے۔ جو اُنھیں پستی سے کھینچکر بلندی کی طرف لیجانے کی کوشش کرے۔ یعنی شاعر اپنے جن حقائق کو بیان کرنا چاہتا ہے اُن کو اس طرح بیان کرے گویا سب سے پہلے یہ بات اُسی کو معلوم ہوئی ہے اور دنیا کے لئے وہ ایک پیامِ حیات کے بمنزلہ ہے۔ غالباً اسی پہلو کو مدِ نظر رکھکر مولانا حالی نے مسدس حالی میں لکھا ہے کہ اس نظم میں

"قوم کے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں وہ آکر اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہوگئے۔"

مسدس کے بعد جو ضمیمہ مولانا حالی نے اضافہ کیا ہے اس میں مسدس کا سا جوش و خروش تو نہیں ہے، لیکن وہ بھی ایک حد تک کامیاب ضرور ہے۔ اقبال کا "جواب شکوہ" "شکوہ" کے مقابلہ میں اہم نہیں ہے یہی کیفیت ملٹن کے نظم "وصالِ فردوس" کی ہے۔ مسدس حالی کا ضمیمہ ان سے کہیں زیادہ زوردار اور مؤثر ہے تاہم اس میں مسدس کا ابتدائی جوش و خروش قائم نہیں رہ سکا۔ اس ضمیمے کی غرض و غایت مصنف نے یوں بیان کی ہے:۔

"مصنف کو اس بات کا فخر ہے.... کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی.... (بلکہ) ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں..... ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلا سے نمودار ہو سکتے ہیں.... ان کے خاکستر میں چنگاریاں ہیں مگر دبی ہوئی ہیں۔"

۵ اسی وجہ سے شاعر اس فنِ لطیف کو منجملہ اور علوم کے ضروری سمجھتا ہے۔ اور دل میں خوش ہے کہ "اگر اس کام کو سلسلہ تمدن میں دخل ہوتا تو صانع حکیم انسان کی طبیعت میں اس کا مذاق ہرگز پیدا نہ کرتا۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

مولانا حالیؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو زبان میں اس مہم کو اہمیت کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پر مسدس حالی پر پھر ایک سرسری نظر ڈالنا بےموقعہ نہ ہوگا۔ غالباً ابھی تک یہ قصہ پارینہ نہیں ہوا ہے۔ بہرنوع اس کا خلاصہ بصورت تبصرہ یہ ہے:-

حکیم بقراط کا قول ہے کہ سب سے مہلک مرض کسی مرض کی اہمیت کو نہ سمجھ کر اس کو ٹال جانا ہے اس طرح مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ؎

نہ افسوس انھیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ　　نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

گویا اب اُن کی حالت وہی ہے جو کبھی عرب جاہلیت کے باشندوں کی تھی یعنی ؎

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

بہت اس طرح ان کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

مگر خدا کا شکر کہ اُن کی اصلاح کے لئے ؎

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا　　دعائے خلیل اور نوید مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوے
یتیموں کا والی غلاموں کا مولےٰ

مس خام کو اس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

اور ہوا کا رُخ تعلیم توحید کے ایک ہی جھونکے نے پھیر دیا۔ تعلیم جس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی ہادی

---

[1] لکھنؤ کے دو نوخیز شاعروں نے "شیون" اور "جواب شیون" کے عنوان سے دو مختصر نظمیں شائع کی ہیں جو واقعی اپنے موضوع کے اعتبار سے لکھنؤ میں پہلی چیز ہیں۔

[2] اس لحاظ سے اردو زبان کے شعرا کی حالت قابل افسوس ہے۔ ہم نے کوئی شاعر ایسا نہ دیکھا جو اپنے دائرے کی دوسرے کو بھی کچھ گرداتا ہو اسی سبب سے زیادہ نفاق طبقۂ شعرا میں ہے۔

نے اِس انکساری سے دی ہو۔ سبحان اللہ کیا تاکید ہے ؎

تم اَوروں کے مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رُتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھکو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح میں بھی ہوں ایک اس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تُم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے بس حق نے اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

اخلاق، علم، ہمدردی اور تعلیم معاشں کے ساتھ ساتھ

جتائی اُنھیں وقت کی قدر و قیمت دلائی اُنھیں کام کی حرص و رغبت
کہا چھوڑ دیں گے سب آخر رفاقت ہوں فرزند و زن اس میں یا مال و دولت
نہ چھوڑے گا پر ساتھ ہرگز تمھارا
بھلائی میں جو وقت تم نے گذارا

ڈرایا تعصب سے اُن کو یہ کہکر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یاور

لیکن باوجود اس تعلیم کے اِس دَور میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو ایسا ناکارہ ثابت کر دکھایا کہ گویا اُن کے اسلاف ان کے اسلاف ہی نہ تھے، وہ عرب کی فتوحات، علوم و فنون کے دریا کا موجزن ہونا، عرب کی عام فیض رسانی کی بدولت اقوام عالم کا قعرِ مذلت سے نکلنا سب یک لخت فراموش ہو گئے، اور ہماری محکوم ذہنیت نے ہماری حالت یہاں تک پہونچا دی کہ:۔

گڈریے کا وہ حکم بردار کتّا کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوال کرتا
جو ریوڑ میں ہوتا ہے چیتے کا کھڑکا تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بپھرا
گر انصاف کیجئے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

اور اس ضمن میں اہل یورپ کی اُولوالعزمی، اُن کے ضبط و برداشت، ان کی محنت اور پابندی اوقات کا

ذکر کرتے ہوئے ہنود کی معزز قوم کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:-

طبیعت میں اک اک کی ہے خاکساری　　　بُرا سُن کے کرتے ہیں وہ بُردباری
تواضع ہے سب کی رگ و پے میں ساری　　　دماغ اُن کے ہیں کبر و نخوت سے عاری
نہ باتوں میں اُن کی حقارت کسی کی
نہ جلسوں میں اُن کے مذمت کسی کی

جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ　　　پڑے زد تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچے میں جا کے ڈھل جاتے ہیں وہ　　　جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضا جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

کاش اِن اشعار میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہو اور خدا کرے حالی کا یہ شعر اگر اب نہیں تو کسی وقت تو ضرور سچ ثابت ہو:-

نہ رسوا ہیں عادات و اطوار میں وہ　　　نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ

ہماری اقتصادی حالت اور افلاس پر مسدس میں جو تبصرہ ہے وہ انگریزی محققین سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، مثلاً:-

فلاکت جسے کہئے اُمّ الخبائث[ـہ]　　　نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم　　　مصلّی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم
وہ یوں اہلِ اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

لیکن فلاکت کی دوا ہر قوم میں امیر لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ اُس وقت کے ہندوستانی اُمرا کی بابت خواجہ صاحب کا خیال ایسا کچھ ہے:-

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر　　　تو ہوتے ہیں مسخ اُن میں پہلے تونگر
کمال اُن میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر　　　نہ عقل ان کی ہادی نہ دین اُن کا رہبر
نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا　　　نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا　　　تعیش میں جینا نمایش پہ مرنا

---

ـہ Mother of crimes

لیکن مسلمان اُمرا میں اب یہ بات نہیں رہی۔ وجہ یہ ہے کہ بمقتضائے زمانہ اب اس قسم کے جو امیر ہوتے ہیں وہ امیر رہتے ہی نہیں پاتے۔ چنانچہ اس عہدِ تجارت میں "بگڑے امیر" یا تو فنا ہو جاتے ہیں، یعنی چٹ پٹ غریب ہو کر متوّل کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں" یا رو بہ اصلاح ہو کر اپنی دونوں آنکھیں اچھی طرح کھول لیتے ہیں۔ اس لئے اب مسلمان اُمرا فضول خرچ نہیں رہے بلکہ زیادہ تر لوگ فیاضی اور سخاوت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

اللہ کرے دستِ کرم اور زیادہ

امیروں پر رائے زنی کرنے کے بعد خواجہ صاحب اہلِ یورپ کی ہمدردی پر رطب اللسان ہیں جو غالباً اُس زمانے میں ہمدرد رہے ہوں اب تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ عظمیٰ نے اپنے تدبّر اور خداداد فراست کی بدولت بنی نوع انسان کے بیڑے کو بہت کچھ سنبھال رکھا ہے۔ اگر اس زبردست سلطنت کو اس کرۂ زمین پر اس قدر اقتدار حاصل نہ ہوتا تو آج دنیا کے چپّہ چپّہ پر جوتی پیزار کے سوائے کوئی اور بات سننے میں نہ آتی!

علمائے اسلام پر خواجہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اُس وقت بالکل بجا و درست تھا لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ ہمارے علما بھی رو بہ اصلاح ہیں اور آج کل کے تعلیم یافتہ طبقہ سے اخلاق میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ البتہ مسلمانوں میں کی فرقہ بندیوں پر خواجہ حالی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ اہلِ تعلیم کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کچھ فرق نہیں۔

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل ۔۔۔ نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل ۔۔۔ نہ بازار میں بوجھ اُٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

گویا علم کے اعتبار سے اُن کی مثل اُن بندروں کی سی ہے جو جگنو کو چنگاری سمجھ کر اُس سے لکڑیاں جلانے کی فکر کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہوئے۔

نہ مطلب نگاری کا اُن کو سلیقہ ۔۔۔ نہ دربارداری کا اُن کو سلیقہ
نہ امیدواری کا اُن کو سلیقہ ۔۔۔ نہ خدمت گذاری کا اُن کو سلیقہ
قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
مگر اِن کو کس مد میں کوئی کھپائے

اس کے بعد "شعرائے طوطی مقال" کا بھی کچھ حال ملاحظہ ہو، ان کی بابت خواجہ صاحب کا یہ خیال ہے کہ ؎ "جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے"
اور اُن کے کلام کے وہ اس طرح شاکی ہیں :-

مجسم ہو اُن کا اگر جھوٹ سارا
بنے ہند میں اُس سے ایک اور ہمالا
ہمالہ سے ہو جس کی چوٹی دو بالا

اسی اعتبار سے انھوں نے شعر اور قصائد کے دفتر کو بہت سخت سُست کہا ہے۔

عام معاشرت کے علاوہ سیاست پر بھی ان کا تبصرہ سنیئے۔ آجکل ہمارے ملک میں قومی خدمت کا تمغہ گورنمنٹ کی مخالفت ہے، اور اس مخالفت پر سزائے قید بھگت لینا گویا معراج قومیت ہے، اگر کسی عقلی دلیل کو مدّ نظر رکھکر مخالفت کی جائے تو مقامِ شکوہ نہیں[1] مگر وہ مخالفت جو صرف لیڈر بننے کے لئے یا فرضی حب وطن کا تمغہ حاصل کر کے خواہ مخواہ مشہور ہو جانے کے لئے کی جائے، وہ کسی حالت میں قابل معافی نہیں۔ خواجہ صاحب کا پیام ایسے لوگوں کے لئے یہ ہے ؎

نہ بدخواہ سمجھو بس اب یاوروں کو　　لیٹرے نہ ٹھراؤ تم رہبروں کو
دو الزام پیچھے نصیحت گروں کو　　ٹٹولو ذرا پہلے اپنے گھروں کو
کہ خالی ہیں یا پُر ذخیرے تمھارے
بُرے ہیں کہ اچھے وطیرے تمھارے

مسدس اس جگہ ختم ہوتا ہے۔ ضمیمۂ مسدس[2] پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، اس میں قوم سے عتاب آمیز

[1] کیونکہ عقل میں آنے والی مخالفت کا کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔
[2] ضمیمۂ مسدس کے علاوہ خواجہ صاحب کی دعائیہ نظم "عرض حال" کی بھی یہی شان ہے، اس کو بھی مدوجزر اسلام کا ریکارڈ سمجھنا چاہیئے۔ شکوۂ ہند۔ کلمۃ الحق۔ مناجات بیوہ وغیرہ بھی ریفارمیشن ہی پر مبنی ہیں۔ ایک دوسری جگہ مسدس میں (جو بحر دیگر ہے) لکھتے ہیں۔

بھرتے ہیں پیٹ کی یاں دیتے دُہائی لاکھوں　　گر نہیں آپ تو ہیں آپ کے بھائی لاکھوں

---

کام ہوتا کوئی اب ان سے سرانجام نہیں　　جس طرح بیل کو جُتنے کے سوا کام نہیں

---

مٹتے مٹتے اثرِ صدق و صفا کچھ نہ رہا　　آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

لہجہ میں نہیں بلکہ ہمدردی کے لہجہ میں خطاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی دلیری نہیں، پر حمیت ہے باقی
فقیری میں بھی بوئے ثروت ہے باقی تہیدست ہیں، پر مروت ہے باقی

مٹے پر بھی پندار ہستی وہی ہے
مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر فقیری کو ذلت کی شہرت سے بہتر
گلیم قناعت کو ثروت سے بہتر انھیں موت ہے بار منت سے بہتر

سر اُن کا نہیں در بدر جھکنے والا
وہ خود پست ہیں پر نگاہیں ہیں بالا

اس میں شک نہیں کہ خود زمانے کی رفتار بھی معاشرت کا شعار سکھلا لیا کرتی ہے اسی وجہ سے ۵

حوادث نے ان کو ڈرایا ہے کچھ کچھ مصائب نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ بتایا ہے کچھ کچھ زمانے کے غل نے جگایا ہے کچھ کچھ

ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے میں کچھ کلبلانے لگے ہیں

۱ بقول شیکسپیئر انسان کو کامیابی کا خیال کئے بغیر کوشش کرنا چاہیئے کیونکہ:۔

"سعی کرنا اور ناکام رہنا مطلقاً سعی نہ کرنے سے بہتر ہے"

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو "سعی" کبھی بیکار نہیں جاتی۔ کچھ نہ سہی تو جدوجہد کی مشق ہی ہو جاتی ہے۔ اس لئے مبارک ہیں وہ لوگ جو:۔

پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر لگاتے ہیں غوطہ اُچھلنے کی خاطر
ٹھہرتے ہیں دم لیکے چلنے کی خاطر وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر

نہ ہو تاب پرواز اگر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

بہر حال کچھ نہ کچھ کریں ضرور کیونکہ یاس و بیم خارج طور پر باہر سے نہیں آتے۔ انسان انھیں خود پیدا کرتا ہے اور اس اعتبار سے نا امیدی کا دوسرا نام ٹال مٹول ہے۔ جو مایوس کن الفاظ کے ساتھ وجود پذیر

'Tis better to have tried and failed,
Than not to have tried at all."

ہو کر جرأت و ہمت اور ہر قسم کی اُولوالعزمی کے لئے سمِ قاتل ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ "دنیا ہیچ ہے" "ہم چند روزہ مہمان ہیں" نیز یہ کہ "تقدیر کوشش سے بدل نہیں سکتی"۔ اِس قسم کی باتوں کو خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ:-

نکموں کے ہیں سب یہ دلکش ترانے    سُلانے کو قسمت کے، رنگیں فسانے
اسی طرح کر کرکے حیلے بہانے    نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

لیکن کاروباری لوگ باوجود اس قحط المآلی کے کچھ نہ کچھ دنیا میں پیدا ہی کر لیتے ہیں، کیونکہ اُن کو خیال رہتا ہے کہ:-

رہیں جیتے جی تاکہ خوش شاد و خُرّم    مریں جب تو دل پر نہ لے جائیں یہ غم
کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند و زن کیا    لباس اُن کا اور اپنا ہوگا کفن کیا

یہ وہ لوگ نہیں جو نام نہاد شہرت کے شائق ہوں، اسی طبقے میں سے قومی لیڈر بھی پیدا ہوا کرتے ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ:

یہ ہیں حشر تک بات پر اَڑنے والے    یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ نوعِ حوادث سے ہیں لڑنے والے    یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے
اُمنڈتا ہے رُکنے سے اور اُن کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ اُن کا سودا

اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہی بنیئے بقال اور دوسرے مختلف پیشہ وروں نے دنیا میں زیادہ تر رہنمائی کا کام انجام دیا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ:-

حکومت ملی ان کو صفّار[1] تھے جو    امامت کو پہنچے وہ قصّار[2] تھے جو
وہ قطبِ زماں ٹھہرے عطّار تھے جو    بنے مرجعِ خلق نجّار[3] تھے جو
درخت اِس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

---

[1] ٹھٹھیرے۔ خراسان میں صفاریوں کی حکومت کی طرف اشارہ ہے۔
[2] دھوبی۔ [3] بڑھئی۔

اس اعتبار سے قوم کے نوجوانوں کو جو کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہیں اگر تھوڑی بھی ہمت دلائی جائے تو وہ کہیں سے کہیں جا نکلیں، کیونکہ:۔

ہزاروں انھیں میں ہیں طوسی[1] و رازی[2]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمت کون دلائے۔ حکومت سے ہر بات کی امید رکھنا تحصیل حاصل ہے، حکومت کیا کیا کرے، ایک سر ہزار سودا۔ حفاظت۔ عدالت، تعلیم، صنعت و حرفت وغیرہ سب کچھ حکومت کے ذمہ ہے۔ اس نے محکوم کو ایسا معطل نہیں کر دیا ہے کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکیں، اس لئے:۔

تمھیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے  تمھیں درد کا اپنے درماں کرو گے
تمھیں اپنی منزل کا ساماں کروگے  کروگے تمھیں کچھ اگر یاں کرو گے

چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

اگر کوئی قوم حکومت ہی پر ہمہ تن تکیہ کرے اور خود کچھ نہ کرے تو اس حکومت کی مثال ایسی ہے کہ:۔

ہو اس طرح ہاتھوں میں اس کے رعیّت  کہ قبضے میں غسّال کے جیسے میّت

اس لئے زیادہ سے زیادہ حکومت بھی اب یہی کہے گی کہ:۔

بس اب اپنی گردن پہ رکھو جُوا تم  کرو جا جیتیں آپ اپنی رَوا تم

بہر حال حضرت خواجہ الطاف حسین حالی اپنے پیام کو ختم کر کے دعا کرتے ہیں کہ بارالہٰا قوم کے نوجوانوں کو راہِ راست پر لا۔ اور:۔

اُنھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے  ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کمینگاہِ بازیٔ دوراں دکھا دے  جو ہونا ہے کل آج اُن کو سُجھا دے

جھپٹیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے



[1] خواجہ نصیر الدین محقق طوسی۔ [2] امام فخر الدین رازی۔

# مولانا حالی کا فارسی کلام

(از حضرت مائل صدر انجمن اُردو بھوپال)

مولانا حالی مرحوم جس پایہ کے شاعر، جس رتبہ کے انشا پرداز اور جس شان کے مصلح تھے اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ملک و قوم پر انھوں نے جو احسانات کئے اُردو ادب کو اُنھوں نے جس طرح سنوارا اس کا سب کو اعتراف ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی قوم نے اُن کی بہت کچھ قدر کی، اُن کی آواز پر لبیک کہا، اُن کی نصائح پر عمل کیا۔ اُن کی تصانیف کو سر آنکھوں پر رکھا۔ مصنفین اُردو میں یہ امتیاز صرف مولانا حالی کو حاصل ہے کہ باوجود اس قدر امتداد زمانہ کے اُن کی تصنیفات کو اہتمام بلیغ کے ساتھ بہتر سے بہتر صورتوں میں بار بار شائع کیا جا رہا ہے، اور قدردان ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں۔ مستقل تصنیفات کے علاوہ اُن کے پرائیویٹ خطوط، نجی تحریریں، کتابوں پر تبصرہ، لکچر وغیرہ کی طباعت کا سلسلہ اب تک برابر جاری ہے۔ ان کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ، اُن کے لکھے ہوئے ایک ایک حرف کو جہاں کہیں مل جاتا ہے شائقین ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں اور عقیدتمند آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ لیکن اس تلاش و تجسس کی موجودگی میں یہ دیکھکر سخت تعجب ہوتا ہے کہ مولانا حالی کا فارسی کلام اب تک کہیں سے اشاعت پذیر نہیں ہوا۔ اپنا کلام یکجا کر کے جو دیوان اُنھوں نے خود مرتب کیا تھا اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا تھا اور اُن کی زندگی میں بار بار شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی فارسی کلام نہیں ہے بجز اُس مرثیہ کے جو مصلح اعظم سر سید کے حادثۂ انتقال پر اُنھوں نے تصنیف کیا تھا۔ اور جو اسی زمانہ میں شائع ہو گیا تھا۔ ان کا فارسی کلام کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔ جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے فارسی کی طرف کبھی توجہ نہیں کیا

لیکن نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جن کی علم پرور سرکار سے وابستہ ہو کر مولانا حالی کی شاعری نے پر پرزے نکالے، ان کی ذاتِ ستودہ صفات امارت، علم و فضل اور فقر کی جامع تھی۔ ان کی مجلسوں میں علما، فضلا، اور شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ بڑے بڑے قادر الکلام شاعر اُن کے سامنے بہت سنبھل کر لب کشائی کرتے تھے۔ نواب مغفور اگرچہ اُردو کے مستند شاعر تھے لیکن فارسی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ مولانا حالی کے استاد غالب مرحوم کو فارسی سے صرف فطری مناسبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ اگرچہ زمانہ کی رفتار سے مجبور

ہوکر اُردو میں بھی کہتے تھے ، لیکن ان کی طبیعت کے اصلی جوہر فارسی میں ہی زیادہ کھلتے تھے ۔ چنانچہ خود کہتے ہیں :-

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ  بگذر از مجموعۂ اُردو کہ آں نہ رنگِ من است

ممکن نہیں کہ ایسے فارسی نوانہ استاد کے مذاق سخن سے مولانا حالی متاثر ہوئے بغیر رہے ہوں ۔ چنانچہ کہن سال بزرگوں سے معلوم ہوا کہ مولانا فارسی کہتے تھے اور ایسی کہتے تھے کہ ارباب محفل سے دادِ سخن لیکر اُٹھتے تھے ۔ اس زمانے میں ان کا تمام کلام عاشقانہ ہوتا تھا ۔ فارسی کلام اُردو سے کہیں زیادہ شوخ ہوتا تھا جس کا سبب یہ ہے کہ فارسی کا اکثر و بیشتر حصۂ کلام غدر سے قبل کا ہے اور اُردو کلام زیادہ تر غدر سے بعد کا ۔ غدر سے قریب ماضی میں گو مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے بالکل رخصت ہو چکی تھی اور اس کی بربادی کی حالت بعینہٖ یہ ہو گئی تھی کہ :-

نسب نامۂ دولتِ کیقباد  ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

لیکن لال قلعہ آباد تھا ، بہادر شاہ محض نام کے بادشاہ تھے ، مگر بزرگوں کی یادگار قائم رکھنے کے لئے جشن ۔ دربار اور شاہی رسومات و تقریبات کا سلسلہ جاری تھا ۔ قلعہ کی اس چہل پہل سے دہلی کے رہنے والے بھی سمجھتے تھے کہ ہم پر کوئی دوسری قوم حکمراں نہیں ہے ۔ اس لئے خیالات و جذبات میں زیادہ افسردگی نہیں آنے پائی تھی لیکن غدر کے روح فرسا حوادث نے بزم شاہانہ کی آخری شمع کے ساتھ پروانوں کے دلوں کو بھی بجھا دیا اور مولانا حالی نے نہیں بلکہ اس مست و رند شاعری نے خود ان کو خیرباد کہہ دیا ۔

اب ان کی شاعری کا رنگ بالکل بدل گیا ، گل و بلبل ، شمع و شاہد کے بجائے اب قوم اُن کی مخاطب تھی ۔ اپنے دیوان کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں

" جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے ۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمّی باتوں پر ۔ آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے ۔ اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضروری ہیں ۔ "

اسی خیال کو اُنھوں نے ایک نظم میں بھی ظاہر کیا ہے ۔

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں  جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب نہ الفت ہے نہ چاہت ہے نہ جوانی نہ اُمنگ  سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی

مولانا حالی قوم کو وعظ سنانا چاہتے تھے اور ملک سے فارسی کا رواج بھی اُٹھتا جاتا تھا اس لئے اب اُن کی تمام و کمال شاعری اُردو میں ہونے لگی، اور شاید فارسی کی اسی کس مپرسی اور ناقدری کی وجہ سے دیوان میں بھی فارسی کلام داخل نہیں کیا، نیز اکثر کلام تلف ہو جانے کی وجہ سے علیحدہ بھی شائع نہ کر سکے جیسا کہ دیوان کے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر کیا ہے:-

"یہ کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔"

نواب صدیق حسن خاں صاحب مغفور نے جن کے فضل و کمال کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ صرف اُردو میں مختلف علوم و فنون میں سو سے زیادہ مستند رسائل ان کی یادگار ہیں (اور فارسی و عربی تصنیفات کی تعداد ان کے علاوہ ہے) فارسی شعراء کا کلام حاصل کر کے مکمل تذکرہ لکھنا چاہا تو معاصر شعراء سے فارسی کلام بھیجنے کی فرمایش کی۔ نواب صاحب کے علمی ذوق اور وسیع وسائل نے تمام شعراء کا کلام حاصل کر کے ایک ضخیم کتاب "شمع انجمن" نامی میں شائع کر دیا، مگر کلام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور اکثر اساتذۂ متقدمین اور شعرائے معاصر کا کلام دیر سے موصول ہوا۔ نواب صاحب کا ارادہ تھا کہ بعد ترمیم و اصلاح جب "شمع انجمن" کو دوبارہ شائع کیا جائے تو اس کلام کا اضافہ کر دیا جائے لیکن اس کا موقع نہ مل سکا اور دیر سے وصول شدہ کلام کے لئے ایک دوسرا تذکرہ "نگارستانِ سخن" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اس کے بعد تیسرا تذکرہ "بہارِ گلشن" نامی شائع ہوا۔ یہ دونوں تذکرے درحقیقت "شمع انجمن" کے ضمیمے ہیں لیکن اس قدر ضخیم ہیں کہ بجائے خود مستقل تالیف کی شان رکھتے ہیں۔ "نگارستانِ سخن" نواب صاحب مغفور کے فرزند اصغر نواب علی حسن خاں صاحب کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

بہارِ گلشن کے لئے مولانا حالی نے اپنا فارسی کلام خود لکھکر ارسال کیا تھا۔ یہ کتاب بھوپال کے مطبع فیض شاہجہانی میں طبع ہوئی تھی لیکن اب ناپید ہے۔ نہ اس کے چھاپنے والے ہی رہے اور نہ کتاب ہی بازار میں ملتی ہے۔

نواب صاحب مرحوم کا قاعدہ تھا کہ اپنی ہر تصنیف مطبع سے نکلنے کے بعد ہی علم دوست احباب کو تحفتاً عنایت فرماتے تھے۔ جن بزرگوں کو یہ کتابیں ملی تھیں وہ قبر میں آرام کر رہے ہیں اور کتابیں کیڑوں کی نذر ہو گئیں۔ اب یہ حالت ہے کہ نواب صاحب کی کتابیں کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔

بہارِ گلشن میں مولانا حالی کا جس قدر کلام درج ہے وہ اُن کے مرسلہ کلام کا اقتباس ہے۔ میں نے نہایت کوشش و کاہش کے بعد پوری پوری غزلیں مہیا کی ہیں، اس کے علاوہ جو کلام متفرق صاحبان کے پاس

محفوظ ہے اس کی نقلیں بھی عنقریب میرے پاس آنے والی ہیں۔

اب مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر جب پرانی باتوں کی یاد تازہ کی جارہی ہے اور مولانا کے ہر شعبۂ حیات اور ہر خصوصیت پر روشنی ڈالی جارہی ہے میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا کا فارسی کلام بھی جس سے فارسی زبان پر اُن کی قدرت تامہ کا اندازہ ہوتا ہے اور جو اُن کے عہد شباب اور فارغ البالی کے زمانہ کی یادگار ہے، مگر ان کے قدردانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے منظرِ عام پر لایا جائے وقت کی تنگی کی وجہ سے فی الحال صرف اقتباس پیش کیا جارہا ہے، مکمل غزلیں کسی آئندہ موقع پر شائع کی جائیں گی۔

چوں شد گوشش بر ترانۂ ما — زدہ از یادِ ما فسانۂ ما

در سراب آبِ خضر می جوئی — اے وقاحت در زمانۂ ما

گوہرے کز دو کون بیرون است — می تواں یافت در خزانۂ ما

یار با تست اگر جذبۂ گیرائے ہست — یوسف آخر رود آنجا کہ زلیخائے ہست

من و از مے دو سہ پیمانۂ دریا ولبِ کشت — نہ ز دوزخ بہ دلم بیم نہ پروائے بہشت

اسی مضمون اور قافیوں میں عمر خیام کی دو رباعیاں بہت خوب ہیں:۔

(۱)

در وقتِ بہار اگر بتے خوب سرشت — گرچہ بر ہر کس ایں سخن باشد زشت

پُر ے قدحے دہد مرا بر لبِ کشت — سگ بہ از من اربرم نام بہشت

(۲)

یک شیشۂ شراب و یار و لبِ کشت — ایں جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

قومی بہ بہشت و دوزخ اندر گروند — کہ رفت بہ دوزخ کہ آمد بہ بہشت؟

عام خیال ہے کہ شاہد ہو، شراب ہو، بہار ہو، نہر کا کنارہ ہو، سامنے لالہ وگل کے انبار ہوں تو ملاقات کا کہیں لطف زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن حالی کا حقیقت پرست خیال اس کے بالکل برعکس ہے اور کس قدر صحیح ہے:۔

ہر کجا دل بخیال تو چمن آراید — گل و نسریں ز ارم آید و طوبیٰ ز بہشت

بود در ظرفِ مغاں آبِ بقا — منتِ خضر کشیدیم عبث

حافظ شیرازی بھی حالی کے ہمنوا ہیں۔

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد | آنچہ خود داشت عبث از غیر تقاضا میکرد

خود پرستی، غلط توکل اور رہبانیت کے خلاف کیا اچھی تعلیم فرمائی ہے:۔

عشق از خویشتن بریدن میخواست | حالی از خلق بریدیم عبث

شوقے بدست و راہنما داشتم چہ شد | دردے بہ از ہزار دوا داشتم چہ شد

کارم ز سعیِ خضر بجائے نمی رسد | در ظرف خویش آب بقا داشتم چہ شد

بگذر از وسوسۂ عقل کہ منزل طلباں | راہ از غول رہ چارہ ز رہزن پرسند

دل ربایند ز ما، صبر و شکیب آموزند | جاں ستانند و ز ما باعث شیون پرسند

در غریبی طرح الفت افگنم با ہر کسے | در دل گبر و مسلمانم وطن خواہد شدن

معشوقوں کے دست و بازو کے معاملہ میں شعراء نے عجیب عجیب جدت آفرینیاں کی ہیں اور ایک ایک مضمون کو کئی کئی طریقوں سے باندھا ہے۔ اردو کا ایک شعر ہے:۔

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے | یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

نظیری نے ایک نہایت دلکش اندازِ بیان اختیار کیا ہے:۔

از کف تہی دہد دلِ آساں ربودہ را | دیدیم زورِ بازوے نا آزمودہ را

لیکن مولانا حالی کا جو اسلوبِ بیان ہے وہ سب سے علحدہ ہے اور نہایت ہی دلچسپ دلنشین:۔

صید نا افگندہ محو دست و بازوے خود است | ایں جواں روزے تنکا بخویشتن خواہد شدن

---

# رباعیات حالی

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا | آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے | انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں | شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ "ہے جہنم دنیا" | وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت | ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص | نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

---

# یادِ حالی

(از مولانا محوی صدیقی لکھنوی)

حالیِ رنگیں نوا! اے شاعرِ شیوا بیاں
تھی تری ذاتِ گرامی نازشِ ہندوستاں

بھول سکتے ہیں ترے نغموں کو کیونکر ہمصفیر
آہ وہ دن جبکہ تھا تو اس چمن میں گلفشاں

وہ ترا طرزِ نگارش لاجواب و بے نظیر
جس پہ سر دھنتی ہے دنیا جسکے سب ہیں قدرداں

تھی تری تحریر کی ہر سطر میں اک دلکشی
تھا تری تقریر کے ہر لفظ میں جادو نہاں

تجھکو آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں اربابِ کمال
اہلِ دل سے کوئی پوچھے تیرا اعجازِ بیاں

اللہ اللہ کیا ترے اوصاف اور اخلاق تھے
یاد آتے ہیں تو گر پڑتی ہیں دل پر بجلیاں

ختم تجھ پر ہو گیا افسوس وہ طرزِ سخن
جس نے بخشی ہے مسدس کو حیاتِ جاوداں

چٹکیاں لیتا ہے دل میں تیرا اندازِ کلام
ہے زباں کی شستگی ہر شعر سے تیرے عیاں

جھومتے ہیں پڑھکے یوں اشعار تیرے اہلِ دل
جھومتی ہیں جس طرح پھولوں کی رنگیں ڈالیاں

قلب کی گہرائیوں میں فکر جب پہنچی تری
راز جو سینوں میں مخفی تھے کئے سب عیاں

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے حالیِ جادو طراز
آج کیا کچھ ہو گئی ہے حالتِ ہندوستاں

بزمِ اردو میں ہے ہر سو مُردنی چھائی ہوئی
تو چمکتا تھا جہاں اب خاک اڑتی ہے وہاں

تھی منور تجھ سے ہی محفل جہاں آباد کی
تھا تو فخرِ قوم، فخرِ ہند، فخرِ خانداں

گو نہیں تو آج زینت بخشِ ایوانِ ادب
غیر فانی ہیں مگر چھوڑے ہیں تم نے جو نشاں

تیری نظم و نثر دونوں کا عجب انداز ہے
روح جن کے حسنِ معنی سے ہے مستِ جاوداں



# مولانا حالی اور تصوّف

(از حضرت مائل، صدر انجمن اُردو بھوپال)

مولانا حالی کے بعض وصف ایسے ہیں جن کی طرف آج تک کسی نے مطلق توجہ نہیں کی، انھیں میں ایک "متصوفانہ شاعری" ہے۔ اِس مضمون کے ذریعہ اربابِ ذوق کو اُن کی شاعری کے اس خاص وصف سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُردو میں صوفیانہ شاعری پر ایک سرسری نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان میں ایسے شعراء کی کافی تعداد ہی ہے جو مذاقِ تصوّف سے آشنا تھے اور جنھوں نے اپنے کلام میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شاہ تراب کاکوروی، اور حضرت نیاز بریلوی کا تمام کلام انھیں خیالات سے مملو ہے، لیکن مستند شعرا میں جس نے مسائلِ تصوّف پر سب سے زیادہ روشنی ڈالی وہ خواجہ میر درد ہیں۔ اگرچہ اور اساتذہ کے یہاں بھی خال خال صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں لیکن وہ بمنزلۂ الشاذ کالمعدوم کے ہیں۔ درد کے بعد مرزا غالب بیشک ایسے ہیں جنھوں نے نکات تصوف کی بیشتر موشگافیاں کی ہیں، چنانچہ اپنی مشہور غزل کے مقطع میں جس کا مطلع یہ ہے:۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے:۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن مولانا حالی اِس خصوصیتِ خاص میں اپنے اُستاد سے بھی پیش پیش ہیں، اُنھوں نے تصوف میں اس قدر زیادہ کہا ہے کہ اگر مسدس جیسی بے مثال نظم نہ چھوڑ جاتے تو اُنھیں "صوفی شاعر" کا لقب دیا جاتا۔ تصوف سے اُن کی شیفتگی اور صوفیانہ کلام کی اس قدر کثرت ایک قصہ طلب امر ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے عمر سے اُنھیں جن مقدس نفوس کی صحبتیں نصیب ہوئیں وہ کامل صوفی تھے یا تصوف کا رنگ اُن پر حد درجہ غالب تھا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ جن کے دامنِ تربیت میں حالی کی شاعری

نے نشو ونما پائی صاحب علم وامارت ہونے کے ساتھ بہت بڑے صوفی منش بزرگ تھے، اُن کا ایوانِ امارت علما، وشعرا کے علاوہ صوفیائے کرام کا بھی مرکز تھا۔ نواب موصوف پر تصوف کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ اُنکی ہر بات اور ہر ادا میں وہ جھلکتا تھا، حالی پر اِن صحبتوں کا بہت تیز اثر ہوا۔ نواب موصوف کے بعد حالی کو مرزا غالب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا جو خود اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس صحبت نے شرابِ شوق کو دو آتشہ کر دیا اور حالی ایک رندِ شاہد باز ہونے کے بجائے صوفی وضع، صوفی طبع شاعر بن گئے۔ اب ہم اُن کے کلام سے مسائلِ تصوف کی تشریح پیش کرتے ہیں:۔

تخلیقِ عالم سے پیشتر کیا تھا؟ اس سوال کے جواب میں عقلا، اور فلاسفۂ دہر نے عجیب و غریب خیال آرائیاں کی ہیں، ہر ملک ہر قوم، ہر عصر کے مدعیانِ علم و دانش نے اپنے اپنے نظریئے قائم کر رکھے ہیں، ہر ایک اپنے خیال و قیاس کے مطابق کسی شئے خاص کو مبدا کل تصور کرتا ہے۔ ان میں اس قدر اختلافات رونما ہوئے کہ یہ مسئلہ ایک چیستان بنکر رہ گیا، اور جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی اُسی قدر اُلجھتا گیا، ہونا بھی یہی چاہیئے تھا، کیونکہ بقول شیرازی عارف کے "چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند" اور اسی لئے اِن دعویدارانِ عقل و حکمت کو یہ کہکر خاموش ہو جانے کی نصیحت کی ہے:۔

حدیث از مطرب و مے گوی و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

لیکن عارف کی حقیقت شناس نگاہ کو فلسفہ کے مسلّمات سے سروکار نہیں، وہ محبت کی فضا میں سانس لیتا ہے، حسن و عشق کی اصطلاحات میں معمۂ کائنات کو حل کرتا ہے۔ مولانا حالی اسی عالم میں آکر ہستیِ واجب الوجود کو حسنِ مطلق اور کونین کو عشق سے تعبیر کر کے اس مشکل سوال کا کس آسانی سے جواب دیتے ہیں:۔

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

ذات واجب الوجود کو تخلیقِ عالم کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب دینے سے عقل عاجز ہے، فلسفہ خاموش ہے، ادراک معذور ہے، علم مجبور ہے، لیکن عارف پر یہ راز منکشف ہے، اس مصرع میں کہ

"تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا"

سببِ تخلیق کی توضیح کی گئی ہے، یعنی "حسنِ ازل" میں تمام اوصافِ حسنہ کامل موجود تھے لیکن اُنکا مشاہدہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے لئے عشق سے زیادہ موزوں و مستحق کونسی کیفیت ہو سکتی تھی، حسن نے

عشق کی تخلیق کی، اور عشق نے تجلیِ حسن سے اثر پذیر ہو کر فتنۂ کونین برپا کر ڈالا۔ اس خیال کو ذیل کے شعر میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

خالقِ حقیقی کی ہستی کا اقرار ہر مخلوق کی فطرت میں مضمر ہے، عام اس سے کہ ذی روح ہو یا غیر ذی روح جاندار ہو یا بیجان، تمام مذاہب کا اس پر اتفاق ہے۔ ہر ایک اپنی فہم و استعداد کے مطابق اس کی جستجو اور عبادت میں محو ہے۔ بعض ناقص ذہن ایسے بھی تھے جو خالقِ حقیقی کی جستجو میں روح و مادہ کی سرحد سے آگے بڑھنے سے عاجز رہے، اور خالق کے اوصاف مخلوق کو دے بیٹھے۔ مگر در حقیقت یہ بھی اُسی کے متلاشی ہیں۔ مولانا حالی نے کس خوبی سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے:-

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

بعض ناسمجھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اُس کی لامحدود ہستی کو اپنے علم و عقل کے تنگ حدود میں گھیرنا چاہا اور جو بقول اکبر الہ آبادی اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ:-

گھر گیا جو عقل میں لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

آخر اپنی کوشش میں ناکام رہ کر ذات واجب الوجود کا انکار کر دیا۔ مولانا حالی اُن کے انکار کو اللہ تعالےٰ کی شان و عظمت کے اقرار سے تعبیر کرتے ہیں:-

سمجھا ہے پرے تجھکو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

ازل کے روز جب حسنِ حقیقت نے "بارِ امانت" سپرد کرنا چاہا اور تمام مخلوقات نے اُس کے اُٹھانے سے عجز کا اعتراف کیا، لیکن حضرت انسان نے بڑھکر اُٹھالیا، عارفوں کو اس سے ہزار نکتے ہاتھ آئے حافظ فرماتے ہیں

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

حالی نے اس بیان کو اور ہی رنگ دے دیا:-

گو مے ہے تند و تیز پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کہے بغیر

تصوف کا یہ عظیم الشان مسئلہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے "حسن مستور" کی غائبانہ عاشق ہے اور اُسی کی طلب و جستجو میں شب و روز سرگردان ہے۔ صوفی کا قدم اس منزل میں سب سے آگے ہے۔ جامؔ کا صوفی کہتا ہے:-

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اصطلاحِ مذہب میں اسی کو "ایمان بالغیب" کہتے ہیں، حالیؔ بھی اسی منزل کے سالک ہیں:-

وصل کا اُس کے دلِ زار تمنائی ہے نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

یہی تمنا عاشق کو راہِ طلب میں کھینچ لاتی ہے، زبانِ تصوف میں اسے "راہِ سلوک" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سلوک کی راہ جس قدر مشکل، ہمت طلب ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی" اِس منزل کا اولین ادب ترکِ علائق ہے کیونکہ

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

حالیؔ نے اِن آداب کو خوب سمجھا یا ہے:-

رہیں نا آشنا زمانے سے حق تراہے یہ آشناؤں پر

---

در گزرے دوا سے تو بھروسہ ہے دعا کا در گزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

---

رخِ جہاں سوز تیرا دیکھا، نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا

یہ بھی ظاہر ہے کہ نفس کی فرعونیت درگاہ باری میں مردود ہے۔ سالک راہِ سلوک میں قدم رکھکر جب عقل و خرد کے زور سے ذات باری تعالیٰ کو اپنے قریب لانا چاہتا ہے تو یہ تمام طاقتیں اُس پر غلبہ پانے سے عاجز رہتی ہیں، اُس وقت اپنی مجبوری و عاجزی سے ہراسان ہو جاتا ہے، اس عجز پر رحم کیا جاتا ہے توفیق رفیقِ راہ ہو جاتی ہے، اپنے علم و دانش کی ناتوانی، زور اور توانائی کی بے بضاعتی کا اُسے اندازہ ہو جاتا ہے اور اعترافِ عجز کے کلمات اُس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

اُس سے ناوان ہی بنکر ملیئے کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
پیرِ مغاں سے ہو کر تب سُرخرو ملیں گے فضل و ہنر کا ہو گا جب چاک محضر اپنا

کچھ پتہ منزلِ مقصود کا پایا ہم نے جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

---

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ وقف ہے یاں شکستہ پاؤں پر

---

اُس کے کوچے میں ہیں وہ بے پر و بال اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر

معشوق حقیقی کی راہ میں ہر منزل دلآویزیوں اور رعنائیوں کے اس درجہ سامان اپنے اندر فراہم رکھتی ہے کہ سالک کے تمام تر توجہات اپنی طرف جذب کرلے محض تائید غیبی اُس کے ذوقِ طلب کو فنا نہیں ہونے دیتی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ راہ کی کسی کیفیت میں محو ہوکر ٹھہر جائے گھبرا کر کہتا ہے۔

دلکش ہر ایک قطعہ ہے صحرائے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم

سالک جس قدر بڑھتا جاتا ہے تجلیات کے پردے اُٹھتے جاتے ہیں، ہر قدم پر وہ تازہ بتازہ واردات پیشِ نظر ہوتے ہیں جو اُس سے پیشتر اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ انھیں تازہ تر واردات کی بابت ایک دوسرا صوفی کہتا ہے:۔

عشق کے بھی خوب دیکھے ساز و سوز دل پہ کھلتا ہے نیا اک راز روز

ہر منزل پر وہ اُن کیفیات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ گذشتہ منزل کی تمام کیفیتیں اُس کے دل سے فراموش ہوجاتی ہیں اور طے منازل کا ایک والہانہ ذوق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی تڑپ کسی منزل پر اُسے ٹھہرنے نہیں دیتی بلکہ ایک منزل پر پہونچتے ہی دوسری منزل کی سیر کے لئے بیقرار ہوجاتا ہے۔ شیراز کا مشہور سالک اسی عالمِ شوق کا نقشہ کھینچتا ہے۔

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

اس کیفیت کو حالی کس خوبی سے بیان کرتے ہیں:۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

سالک اگرچہ برابر منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے اور انوار الٰہی اُس پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں لیکن منزلِ مقصود کا کہیں پتہ نہیں چلتا، مگر دل کی بیتابی اُسے بددل نہیں ہونے دیتی، طلب کی جو آگ اُس کے سینے میں مشتعل ہوگئی تھی مشتعل تر ہوتی جاتی ہے، اسی میں ایک لذت محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

چھوٹے ہوئے ہیں گو جی، پر دل بندھے ہوئے ہیں ملنے سے بھی سوا ہے ملنا محال تیرا

نہ جی اُکھائی سے تیری چھوٹے، نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جویاں، اُنھیں کو اُمیدوار دیکھا

ذوق و شوق کا اُس پر اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ جس قدر دیر ہوتی جاتی ہے اُسی قدر عشق میں ترقی ہوتی ہے۔ کاہشِ طلب ہی میں روح کی تازگی محسوس کرتا ہے اور اسی عالمِ بیخودی میں پکار اُٹھتا ہے۔

وہ ہے دیر آشنا تو عیب نہیں
مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر

آخر اس تمام طلب و جستجو کو درگاہ باری میں شرف قبول عطا فرمایا جاتا ہے۔ سالک قُرب کے درجہ میں پہونچایا جاتا ہے۔ لیکن پردۂ جلال کے سامنے پہونچتے ہی اس قدر متحیر ہو کر رہ جاتا ہے کہ دنیا و مافیہا ایک طرف اپنی خبر نہیں رہتی "آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد" یہاں تمام کیفیتیں فنا ہو جاتی ہیں حیرت و سکوت کے سوا کوئی کیفیت باقی نہیں رہتی۔

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کُھلا بھی قسمت سے راز تیرا
ملا نہ کھوج اُس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈھا ہزار دیکھا

---

محتسب عذر بہت ہیں لیکن اذن ہم کو نہیں گویائی کا

---

کچھ راز حقیقت کی گر تجھکو خبر ہوتی میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

اگرچہ عارف کے لب پر مہر خاموشی لگ جاتی ہے لیکن باری تعالیٰ کے اعتراف احسان سے اُس کا دل لبریز ہوتا ہے، اپنی سعیِ مسلسل کو مشکور اور ہمت شکن ریاضت و مجاہدات کے بعد باری تعالیٰ کے فضلِ عظیم کو دیکھکر ناز کے لہجہ میں کہہ اُٹھتا ہے کہ:۔

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت دیکھ لیتے ہیں، دیتے ہیں جب کچھ

بزم قدسی میں اُس کی کامیابی کے چرچے ہوتے ہیں، اربابِ حال میں اُس کی ترقی مدارج کے تذکرے چھڑ جاتے ہیں، اُس کی طرف اُنگلیاں اُٹھنے لگتی ہیں، رشک کی نگاہیں پڑنے لگتی ہیں، محسودِ کونین بنجاتا ہے، جو کنزِ مخفی اُس کے سینے میں نہاں ہے اُس کی قدر و عظمت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور زمین و آسمان کی بدلی ہوئی نگاہیں دیکھکر کہتا ہے:۔

سرمایۂ خلاف دو عالم ہے رازِ دل    باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

آخر انوار و تجلیات کی اُس پر اس کثرت سے بارش ہوتی ہے کہ سینے میں دریائے حقیقت موجیں مارنے لگتا ہے، تجلی ہر رگ و ریشہ سے پھوٹ نکلتی ہے، عشق مظہرِ حُسن بن جاتا ہے، افشائے راز کے عواقب کا خیال، حتیٰ کہ تمام احساسات و مُدرکات اُس کے قبضہ سے باہر ہو جاتے ہیں، بجز حق کے وہ کچھ نہیں سنتا، بجز حق کے وہ کچھ نہیں دیکھتا، اور "من نمی گویم انا الحق یار میگوید بگو" سے مجبور ہو کر بے اختیار چیخ اُٹھتا ہے:۔

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خون اپنا ہدر کرتے ہیں

آپ نے دیکھا! مولانا حالی نے مقاماتِ سلوک کی کیفیات کو کس تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، کوئی سالکِ طریقت یا عارفِ کامل اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ دکھائیں گے کہ مولانا نے مسائلِ تصوف کی ترجمانی کس خوبی سے کی ہے، یہاں تک کہ اُنھوں نے دنیائے تصوف کا کوئی مسئلہ بغیر کافی توجہ کے نہیں چھوڑا۔

"ہمہ اوست" کا مسئلہ صوفیوں کے یہاں جیسا عام رہا ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں، مولوی رومی، عطار، سنائی۔ عراقی، مغربی سب اسی کے منادو نقیب ہیں۔ ہندوستان کے صوفیا بھی اسی کا دم بھرتے ہیں۔ میر درد۔ جانِ جاناں مظہر، نیاز، تراب اِن سب کا کلام اسی خیال کا ترجمان ہے۔ حالی بھی اس میدان میں انھیں کے دوش بدوش ہیں۔

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں    ہر خارِ نخلِ ایمن و ہر کوہ طور تھا

---

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر    تم میں رُوپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

---

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید    دیکھ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

"ہمہ اوست" نے جب بہت زیادہ پردے اُٹھائے تو "ہمہ از وست" کی طرف خیال منتقل ہوا۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس مسئلہ کو خوب سمجھایا ہے:۔

از خدا داں خلاف دشمن دوست    کہ دلِ ہر دو در تصرفِ اوست

حالی نے "ہمہ اوست" ہی سے "ہمہ از وست" کا مضمون پیدا کیا

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور　　عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

---

اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتہ　　ورنہ ہم اور کسی شئے کے طلبگار نہیں

یونان و ایران کے فلسفہ نے اسلام کی سادہ تعلیم سے ملکر جو نئے گل کھلائے اُن میں "جبر و قدر" کے مسائل بھی ہیں۔ صوفیا "قدر" کو تو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے کیونکہ یہ اُن کے مسلک کے بالکل خلاف تھا "جبر" کی طرف بیشک متوجہ ہوئے، لیکن اس مسئلہ کو لیکر ایک نیا رنگ دیدیا، خشک مسائل کے بجائے "رضا و تسلیم" کی دلنشین اصطلاحیں وضع ہوئیں، اس کی تشریح کے لئے شعرائے متصوفین نے خوب خوب موشگافیاں کیں۔ لیکن حالی نے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہاں تک کوئی نہیں پہونچا۔

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کماندار ی
ہم بچکے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

تمام مذاہب میں امور خیر اور روحانی ترقیات کا مدار اصلاح اخلاق پر ہے، اور اصلاح اخلاق کی بنیاد تزکیۂ نفس پر، علمائے اخلاق کی تمام تعلیم اسی عزتِ نفس پر مبنی ہے، انسان جس قدر نفس کی حالت سے بے خبر رہیگا اُسی قدر درجۂ انسانیت سے گرتا جائیگا، اور جتنا نفس کے حالات میں غور و اصلاح سے کام لیگا اتنا ہی درجات علوی کی طرف ترقی کریگا۔ مولانا حالی اسی نظریئے کو پیش کرتے ہیں:-

خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ　　ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس

---

حالِ دل انساں میں ہے گمُ دولت کونین　　شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

ذات باری تعالیٰ قادرِ مطلق ہونے کے علاوہ حکیم مطلق بھی ہے، اُس کا ہر حکم جہاں بغیر چون و چرا کے واجب التسلیم ہے، اُسی طرح اُس کے ہر حکم میں حکمت و مصلحت کے خزانے بھی پوشیدہ ہیں۔ انسان پر اکثر ایسے واقعات گزرتے ہیں جنھیں وہ ہرگز پسند نہیں کرتا لیکن نتائج مفید برآمد ہوتے ہیں، اسی بنا پر تلخ و ناگوار واقعات پیش آنے پر صبر و استقلال کی تعلیم دیگئی ہے۔ صوفی اس طویل بحث کو ان مختصر الفاظ میں سمجھا دیتا ہے:-

اُن کے غصہ میں ہے دلسوزی، ملامت میں پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

اصطلاحاتِ مذہب میں ایک اصطلاح "ابتلا" ہے یعنی مقربان بارگاہِ الٰہی پر نزولِ بلا کسی جرم کی سزا

یا عذاب کے طور پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ امتحان محبت ہوتا ہے اور ترقی درجات کا عظیم الشان سبب، صوفی اسے "ناز معشوق" اور "توجہات حسن" سمجھتا ہے، اسی لئے ہر مصیبت اُس کے لئے عیش اور ہر تکلیف کا دن عیش کا دن ہو جاتا ہے، وہ ہر رنج پر فخریہ کہتا ہے:۔

غمزدو! رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی، جس میں گزر کرتے ہیں

ہر قوم اور ہر ملت و مذہب نے باری تعالیٰ کو جس طرح سمجھا ہے اُسی مناسبت سے اُس کے لئے نام مخصوص کرتے ہیں۔ لیکن عارف کی نگاہ میں اُس کی صفات لاتحصٰی ہیں جو کسی حد و شمار میں نہیں آسکتیں وہ ہر صفت سے متصف ہے، اُس کا ہر ڈھونڈھنے والا جس صفت کے ساتھ اُسے ڈھونڈھتا اور پکارتا ہے اُسی شان سے وہ اُس پر ظاہر ہوتا ہے۔ فارسی کا ایک مشہور شعر اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے:۔

بنامِ آنکہ او نامے ندارد
بہر نامے کہ خوانی سر برآرد

حالی بھی اسی باب میں کہتے ہیں

نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دنیا کا ہر ذرہ صانع حقیقی کی بینظیر صناعی کا کامل نمونہ ہے، چونکہ مصنوع کی خوبی سے صانع کے کمال کا اظہار ہوتا ہے اِسی لئے اشیاء عالم میں نظر کرنے سے معرفتِ الٰہی میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو دنیا کو حد درجہ ہیچ سمجھکر دنیا سے دُور رہ کر خالق کو تلاش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کن جامع الفاظ میں نصیحت کی ہے:۔

جانتا دنیا کو ہے اِک کھیل تو کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

اِسی طرح کائنات کی عظیم الشان ہستیوں کو دیکھکر اپنی اور اپنی دنیا کی بے حقیقتی اور قادر و توانا کی عظمت و شان کا پتہ چلتا ہے

شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکہ دُور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم

اربابِ ظاہر کی تمام عبادت و طاعت کا مقصود بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ عذاب بعد الموت سے مامون رہکر نجاتِ ابدی حاصل کریں۔ لیکن صوفی کا مسلک اس کے بالکل خلاف ہے، وہ جنت و دوزخ سے

بالاتر رہکر مجاہدات و ریاضت کے ذریعہ صرف محبوب کی خوشنودی چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک بہت بڑے عارف کی یہ دعا بہت مشہور ہے کہ "الٰہی! اگر میں نے جنت کی حرص سے عبادت کی ہو تو جنت مجھ پر حرام رکھیو اور اگر جہنم کا خوف طاعت کا سبب ہوا ہو تو جہنم کے سخت ترین عذاب میں مبتلا کیجیو۔" صوفی کو اگر جنت کی تلاش ہے تو محض اس لئے کہ وہاں دیدارِ محبوب سے شاد کام ہونے کی اُمید ہے ورنہ ہزار راحتوں کو مصائبِ عشق کی زندگی پر قربان کرنے کو تیار ہے۔ مولانا حالی اسی شوقِ دیدار پہ کہتے ہیں۔

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

روح کو شاہدِ اصلی کا وصالِ ابدی حاصل کرنے کے لئے بہت سی سخت منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں، کہیں تناسخ کا لاتناہی سلسلہ دل کو پریشان رکھتا ہے، کہیں دنیا، لحد، برزخ اور قیامت کی منزلیں دل کی تکلیف کا باعث ہوتی ہیں۔ صوفی پر یہ انتظار سخت بار ہے۔

بہت دن چاہئیں یوسف کو تا پہونچے زلیخا تک
نکلکر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

ہر مذہب کی تعلیم ابتدا میں نہایت سادہ ہوتی ہے، کچھ زمانہ گزر جانے پر اس سادہ تعلیم کی تشریحیں اور تفسیریں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان تفسیروں پر حاشیہ آرائی کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پیچیدہ فلسفیانہ دماغ ہر مسئلہ کو لاینحل اور ہر عبادت کو مصیبت بنا دیتے ہیں۔ حالی اس طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے اُلجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

اولیاء اللہ ہجوم خلائق میں رہکر بھی چھپ نہیں سکتے، اُن کی شانِ جلال ایک ایسی خوشبو ہے کہ بند ہونے پر بھی مہک اُٹھتی ہے۔ اس کے لئے کس قدر دلکش پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمھارے شہید کا

اولیاء کرام کی صحبت صفائے قلب اور اصلاح اخلاق کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے، صدہا نصیحتیں اور ہزاروں مواعظ وہ کام نہیں کرتے جو اِن بزرگوں کی ایک نگاہ کر جاتی ہے۔ حافظ علیہ الرحمۃ اسی نگاہ کی قدر و قیمت کی بابت فرماتے ہیں:۔

بجضورِ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے بہ ازاں کہ چتر برسر ہمہ روز ہائے و ہوئے

# مسدسِ حالی کی ہر دلعزیزی

(۱)

(از مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے۔ معتمد انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد)

پچاس برس سے زیادہ ہوتے ہیں، میرا لڑکپن کا زمانہ تھا، میرے ایک ماموں فیروز پور (پنجاب) میں ملازم تھے اور فیروز پور سے قریب ایک گاؤں میں بس گئے تھے، یہ گاؤں انھیں کا تھا اور وہاں کے سب سے بڑے آدمی یہی تھے۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے کے ختنے کئے اور اس رسم میں اپنے عزیزو اقارب اور دوست احباب کو مدعو کیا۔ یہ جشن بڑی دھوم دھام سے دو تین روز تک رہا۔ دوسرے دن کا ذکر ہے، صبح کا وقت تھا، میدان میں بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا اور اُس میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ مجمع شامیانے سے باہر دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر اُس گاؤں اور آس پاس کے گاؤوں کے کسان اور مزدور تھے۔ اتنے میں ایک طوائف اُٹھی، یہ لاہور سے بُلائی گئی تھی، نام میں اس وقت بھول گیا ہوں۔ یہ اچھی پڑھی لکھی عورت تھی، شعر بھی کہتی تھی اور اُس کی غزلیں لاہور کے اخباروں میں چھپا کرتی تھیں، اُس نے کھڑے ہو کر مجمع پر ایک نظر ڈالی اور ایکبارگی مسدس (حالی) گانا شروع کیا:-

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

جب تک وہ گاتی رہی، سناٹے کا عالم رہا۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ آبدیدہ تھے۔ وہ سماں اب تک میری نظروں کے سامنے ہے، اور گانا اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

اب بھی جب کبھی میں مسدس حالی پڑھتا ہوں تو یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اِن اَن پڑھ اُجڈ گنواروں پر اس قدر اثر کیا کہ وہ آبدیدہ ہوگئے؟

ہندوستان میں ہر چیز آکر ذات بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری کی بھی خاص ذات تھی۔ وہ مخصوص طبقے اور خاص لوگوں کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور وہی اُس کے نکات سمجھ سکتے اور اُس کا لطف اُٹھا سکتے تھے۔ جو ذات باہر تھے وہ اکثر اس سے محروم رہتے تھے۔ حالی نے ذات پات کا یہ جھگڑا بالکل اُٹھا دیا اور اُس نے اپنا دردِ دل اُس زبان میں سنایا جسے اکثر لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ برادری سے خارج کر دیا گیا۔

شعر یا موسیقی ہے کیا؟ یہی نہ کہ ہم الفاظ یا آواز کے ذریعہ سے اپنے جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں

اور لوگ اُسے پڑھکر یا سُن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ دُکھ سے دُکھی اور سُکھ سے سُکھی ہوتے ہیں۔ کیا کسانوں اور گنواروں کے دل نہیں ہوتا؟ کیا اُن میں عشق و محبت کا مادّہ نہیں؟ کیا وہ دُکھ درد کا احساس نہیں رکھتے؟ کیا اُن میں ہمدردی اور ایثار نہیں ہوتا؟ رستم کی داستان یا حاتم طائی کا قصہ پڑھکر سُنائیے اور پھر اُن کے جوش اور ہمدردی کو دیکھیئے۔ لیلیٰ مجنوں کا ڈراما کیجئے اور پھر دیکھیئے کہ اُن کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اُن کے گیت سُنے ہیں؟ کیا چیز ہے جو اُن میں نہیں ہے۔ شجاعت عشق و محبت۔ ہمدردی عصمت و عفت۔ غیرت ظرافت سبھی کچھ ہے۔ پھر کیا وجہ کہ آپ یہی چیزیں بیان کریں اور وہ نہ سمجھیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کی زبان تکلفاتِ لایعنی سے پاک ہو۔ اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں۔

مسدس اس کسوٹی پر پورا اُترا۔ ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ بار بار چھپا اور اتنی بار چھپا کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہوا ور ہر طبقے میں مقبول ہوا۔

اس کی روانی حیرت انگیز ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحہ کے لئے بھی رُکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اُس پر ہزار صنائع بدائع قربان ہیں اور ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اُس کی بنیاد صداقت پر ہے، ادب میں حسن و خوبی کا معیار صداقت یا حقیقت ہے۔

ہماری شاعری میں مسدس نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس کا نبھانا آسان نہیں ہے۔ اچھے اچھے مشاق شاعر بھی رہ جاتے ہیں اور بھرتی کے مصرعوں سے چول بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیس سا باکمال شاعر بھی مسدس جن کی ملک ہوگئی ہے، بھرتی کے بے ربط مصرعے داخل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن حالی کا یہ کمال ہے کہ سارے مسدس میں مصرع تو کیا ایک لفظ بھی بھرتی کا نظر نہیں آتا۔ اور ہر مصرع دوسرے سے ایسا گتھا ہوا ہے کہ چھیوں مصرعے ایک جان اور ایک ذات ہوگئے ہیں۔

ظاہر سے قطع نظر کرکے باطن کو دیکھیئے تو ایسی پُر جوش، ایسی عبرت انگیز اور سبق آموز اور دلوں کو اُبھارنے اور غیرت دلانے والی نظم ہماری زبان میں نہیں۔ مدوجزر اس کا نہت ہی صحیح نام ہے۔ شعر کی نسبت جو یہ کہا گیا ہے کہ اُسے حقیقت یعنی زندگی اور واقعات زندگی سے وابستہ ہونا چاہیئے وہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے جس میں ہمارے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ پھر حُسنِ بیان نے اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جہاں اس میں اخوت، ہمدردی، اتفاق، خودداری

حبِ وطن، جفاکشی، بے تعصبی وغیرہ سبق دیتے ہیں، وہاں تیرونشتر بھی ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں لیکن یہ نشتر غمگسار سرجن کے ہیں نہ کہ بیدرد و بد اندیش کے۔

مسدس حالی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہیگی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کئے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔

(ماخوذ از صدی ایڈیشن مسدس حالی)

(۲)

(از نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس حبیب گنج)

مجھ کو وہ وقت خوب یاد ہے جب مولانا حالی کا مشہور مسدس پہلی بار شائع ہوا تھا، مدح و ذم کا ایک طوفان اُٹھا، مداحین میں مرحوم سرسید بھی تھے۔ اُنھوں نے مدح اس بلند آہنگی سے کی "قیامت میں جب خدا تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہمارے واسطے کیا لایا تو میں کہونگا "مسدس حالی"۔ مخالف دو گروہ تھے، ایک قدامت کے شیدائی جن میں مذہبی خیال والے بھی شامل تھے۔ دوسرے لکیر کے فقیر شعراء۔ مسدس میں جس بیباکی سے ہمعصر مذہبی و معاشرتی طبقات پر جرح کی گئی تھی اُس نے احساس مخالفت کو مشتعل کر دیا تھا خصوصاً مذہبی احساس کو۔ شعراء کو شکوہ تھا کہ مسدس کے قوافی وغیرہ میں ناموس شاعری کی اہانت کی گئی ہے مخالفت کے لئے جب نثر کا میدان تنگ ہو گیا تو نظم کی باری آئی۔ مسدس کے جواب میں متعدد مسدس لکھے گئے جن میں ایک "مسدس خالی" بھی تھا۔

جہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا وہاں حالی کا اخلاص بھی اپنا کام کرتا رہا، بہت سے بند دلوں پر نقش ہو گئے زبانوں پر چڑھ گئے۔ لوگ ان بندوں کو پڑھتے تھے اور سر دُھنتے تھے، خصوصاً عروج و زوالِ اسلام کے بند یا وہ بند جن میں اُندلس کا نوحہ ہے۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اندلس سے یہاں کے مسلمان اسی جادو اثر کلام کی بدولت واقف ہوئے۔

ایک جنٹلمین جو شاید ہی کبھی شعر پڑھتے ہوں مسدس کے یہ بند ترنم سے پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے

کچھ ہی زمانہ گزرا کہ مخالفت کی آندھی چھٹ گئی، اہل نظر نے دیکھا کہ مسدس اپنی جگہ پر ہے۔ ہوا صاف ہونے پر اُس کی مقبولیت بڑھی ان دلوں پر حاوی ہوئی جو حالی کا تصور بھی شاید داخل معصیت سمجھتے ہوں۔ خوبیوں کے ساتھ مسدس میں کمزوریاں بھی ہیں اس پر بھی اُس کی جگہ بزم ادب میں محفوظ ہے۔

# خواجہ حالی کی دو تصویریں

(از نواب مسعود جنگ بہادر سید راس مسعود، وزیر بھوپال)

خواجہ الطاف حسین حالی اُن چند بزرگوں میں سے ہیں جن کا اثر میرے قلب و دماغ کے ہر رگ و ریشے نے قبول کیا ہے۔ جب کبھی اُن کا خیال آتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے دو تصویریں پھر جاتی ہیں جن کا تعلق میرے بچپن کے زمانے سے ہے۔

ایک تصویر جو دکھائی دیتی ہے یہ ہے کہ علی گڑھ میں جون کا مہینہ ہے اور ہمارے غریب خانے میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں اور اس نیم تاریکی میں جہاں خس کی خوشبو کے ساتھ تمباکو کی خوشبو بھی ملی ہوئی ہے مولانا مرحوم اور میرے والد ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور شعر و شاعری پر گھنٹوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ مولانا شرافت کی مجسم تصویر بنے ہوئے ہیں، ہر ادا سے بلند خیالی اور میرے والد کے ساتھ سچی محبت ٹپکتی ہے۔ دونوں گفتگو میں اس قدر غرق ہیں گویا اس دنیا کو چھوڑ کر کسی اور دنیا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رات کا وقت ہے، کھانے کی میز لگی ہوئی ہے۔ ایک سرے پر میرے دادا مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن کی داہنی جانب مولانا الطاف حسین مرحوم اور بائیں طرف میرے والد، قومی معاملات پر پُرجوش گفتگو ہو رہی ہے۔ چند لمحوں کے لئے باتیں بند ہوتی ہیں اور میرے والد کے منہ سے یہ فقرہ نکلتا ہے "ابا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، اُن میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لئے تیرا دل تیار ہو جائے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے"۔ میں دُور کھڑا ہوا اس فقرے کو سنتا ہوں اور مجھ کو اکیلا کھڑا ہوا دیکھکر میرے والد اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے قریب آؤں اور پھر حکم دیتے ہیں "جا الطاف حسین صاحب کے پاس کھڑا ہو جا"۔ میں اس حکم کو بجا لاتا ہوں، الطاف حسین صاحب کمال شفقت سے مجھے سینے سے لگاتے اور پیار کرتے ہیں، اُس وقت میری عمر سات سال کی ہے۔ اس کے بعد میں زنانے میں اپنی والدہ کے پاس جاتا ہوں اور اُن سے پوچھتا ہوں کہ "یہ کون صاحب ہیں جن کی پرستش کرنے کے لئے میرے والد صاحب تیار ہیں اور جنھوں نے مجھے پیار کیا ہے"۔ اس سوال کا جو مجھے جواب ملتا ہے اُس سے پہلی دفعہ مولانا مرحوم کی عظمت کا بیج میرے دل میں بویا جاتا ہے اور جب کبھی میں اُن کو دیکھتا ہوں تو اپنے دل میں کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہیں، باوجود اس کے اب میری عمر تقریباً پچاس سال ہو گئی ہے میرے دل میں وہی عظمت اُن کی ہے اور وہی محبت اُن سے قائم ہے جو بچپن میں تھی۔

# مولانا حالی کے خطوط

## ایڈیٹر "زمانہ" کے نام

"زمانہ" کو جاری ہوئے تینتیس سال سے زیادہ ہو چکے، اس عرصے میں اس کو ملک کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں، اور متقدر لیڈروں کے مضامین شائع کرنے کی عزت نصیب ہوئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بڑے بڑے ناموران ملک سے تبادلۂ خیالات کے مواقع حاصل ہوئے اور عظیم القدر بزرگوں سے خط و کتابت رہی افسوس یہ خط و کتابت اب محفوظ نہیں ہے تاہم حسن اتفاق سے چند خطوط اب بھی باقی رہ گئے ہیں جنکو ہم علمی تبرکات سمجھتے ہیں۔ اس مختصر مگر قابل قدر سرمایہ میں چار خطوط شمس العلماء مولانا حالی کے بھی ہیں جو انکی صد سالہ سالگرہ کی یادگار میں تبرکاً ہدیۂ ناظرین ہیں: (ایڈیٹر)

(۱)

پانی پت ۳۱- جولائی ۱۹۰۵ء

جناب منشی صاحب مخدوم مکرم،

عنایت نامہ پہنچا، مجھ سے زیادہ کوئی ناشکرا اور نامنفعل نہ ہوگا کہ ایک عرصے سے آپ کے بے نظیر رسالہ کے مطالعہ سے مستفید ہوتا ہوں، مگر باوجود اس کے آج تک نہ کبھی رسالے کی رسید لکھی اور نہ شکریہ کا ایک حرف لکھا۔ مگر حال یہ ہے کہ میں تقریباً ایک سال سے ایسی پریشانیوں میں اُلجھا ہوا ہوں کہ لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہوگیا ہے اور جمعیت خاطر اور اطمینان نے کلیتہً جواب دیدیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ پہلے ہی خط میں ان پریشانیوں کی تفصیل سے آپ کو بے لطف کروں، لہذا اس موقع پر صرف یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل اس وقت ناممکن ہے، لیکن اگر زندگی باقی ہے تو میں ضرور اپنی شرمندگی رفع کرنے میں کوشش کرونگا۔ اور جیسا بُرا بھلا لکھنا مجھے آتا ہے "زمانہ" کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔

اُمید ہے کہ آپ میرے اس عذر کو کسی حیلہ یا بہانہ پر محمول نہ فرمائیں گے۔

"زمانہ" کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو اُن مستثنےٰ رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ "زمانہ" نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی اور تہذیب میں بھی روز افزوں ترقی کرے۔ اور جو صلح کل مسلک اُس نے اختیار کیا ہے اُس سے سرمو تجاوز نہ کرے۔

زیادہ نیاز

آپکا نیازمند: الطاف حسین حالی



حیدرآباد دکن

نظام کلب ۸-۱اپریل ۱۹۰۶ء

جناب منشی صاحب

کل ٹیلیگرام اور آج عنایت نامہ پہنچا۔ جو نظم میں نے جلسہ ینگ مینس ڈبیٹنگ فورم میں پڑھی تھی، وہ کوئی جدید نظم نہ تھی، اس کو لکھے ہوئے بائیس تیئیس برس سے کم عرصہ نہ ہوا ہوگا اور مجموعۂ نظم حالی جو ڈیوٹی شاپ علیگڈھ فروخت کرتی ہے وہاں سے مل سکتا ہے، یہاں بڑی مشکل سے ایک کاپی لوگ تلاش کرکے کہیں سے لائے تھے۔ اگر آپ اس پرانی دقیانوسی نظم کو اپنے رسالہ میں چھاپنا چاہیں تو ڈیوٹی سے ایک کاپی منگوا لیں، اس میں اور بہت سی میری نظمیں شامل ہیں۔

جو لکچر سرسید مرحوم کی برسی کے موقع پر دیا گیا تھا، وہ اُن کی لائف موسومہ بہ "حیات جاوید" کا خلاصہ ہے مگر بالکل نامکمل اور ادھورا ہے۔ میں آج اتوار کے سبب اُس کو روانہ نہیں کرسکا انشاء اللہ کل ضرور روانہ کردونگا۔

جس روز میں نے نظم "تعصب اور انصاف" پڑھی تھی اُس روز میرے دوست مولوی عبدالحق بی۔اے نے اکبر کی برسی کے موقع پر اس کی لائف اور اُس کی پالیسی پر لکچر دیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ابتک اکبر پر کسی صاحب نے ایسا عمدہ مضمون نہیں لکھا۔ میں نے سکرٹری فورم مذکور سے "زمانہ" کے لئے اُس کو مانگ لیا ہے، وہ بھی عنقریب (جبکہ مولوی عبدالحق اُس پر نظرثانی کرلیں گے) آپ کی خدمت میں بھیجدونگا۔ مگر سکرٹری نے اس کو اس شرط پر دینا منظور کیا ہے کہ اس کی سو پچاس جلدیں جو وہ آپ سے طلب کریں وہ اصل لاگت پر آپ اُن کو دیدیں۔

اس لحاظ سے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کا جواب متضمن بہ منظوری شرط مذکور آجائے اُس وقت اُس لکچر کو آپ کی خدمت میں بھیجا جائے اور اُسی وقت مطلوبہ جلدوں کی تعداد مسٹر موصوف سکرٹری فورم مذکور سے پوچھکر آپ کو اطلاع دیجائیگی۔ چونکہ یہ سب مطالب تار کے ذریعہ ادا ہونے مشکل تھے اس لئے تار نہیں دیا گیا۔ اُمید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ زیادہ نیاز

خاکسار

الطاف حسین حالی

## (۳)

## کارڈ

مولوی عبدالحق بی۔اے کا لکچر آج بک پیکٹ کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں ارسال کیا گیا ہے۔ مہربانی کرکے اُس کی رسید سے خلد مطلع کریں۔ انشاء اللہ ۲۴ مئی کو یہاں سے روانہ پانی پت ہو جاؤں گا۔

اِس لکچر کو آپ خواہ الگ چھاپیں یا اپنے رسالہ کے ضمن میں بشمول دیگر مضامین طبع فرمائیں بہرصورت اپنی ضرورت سے پچاس جلدیں زیادہ چھاپنی چاہئیں اور اصل لاگت کے حساب سے پچاس جلدوں کی قیمت لگا کر ویلیو پے ایبل پارسل بنام مولوی عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر و پرنسپل مدرسۂ آصفیہ سرکار عالی بمقام حیدرآباد بھیجدیجئے گا۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی۔ از حیدرآباد دکن۔ نظام کلب ۱۴ مئی ۱۹۰۶ء

## (۴)

جناب من۔ مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون آپ جب چاہیں "زمانہ" میں شائع کریں۔ اگر ڈیڑھ سو سے کم جلدیں چھاپنی مناسب نہیں ہیں تو آپ کو اجازت ہے ڈیڑھ سو جلدیں زائد چھپوالیں میں انشاء اللہ تین چار دن میں وطن روانہ ہو جاؤنگا۔ آپ اگر کچھ مجھے لکھنا چاہیں تو ایک ہفتے کے بعد پانی پت خط ارسال فرمائیں۔ اور اگر مضمون مذکور کے متعلق کچھ پوچھنا گچھنا ہوں تو مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل مدرسۂ آصفیہ سرکار عالی کے نام بمقام حیدرآباد، ملک بیسٹ خط تحریر کریں۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

از حیدرآباد دکن۔ نظام کلب۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۶ء

---

# آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا، حاصل ہے آزادی جنھیں — قدرداں ان سے بہت بڑھکر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں — قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہواتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا — بینوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
تعرف الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم — دیگا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سُن کے اِک آزاد نے یہ لاف جھپکے سے کہا — ہے سقر موری کے کیڑے کیلئے باغِ ارم

(کلیات نظم حالی)

حالی

# فہرست تصانیف شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی

## تصانیف نظم

۱ خمسۂ نعتیہ (۱۸۵۶ء)
۲ مسدس مدوجزر اسلام
۳ مثنوی مناجات بیوہ
۴ قصیدۂ غیاثیہ یا عرض حال
۵ مثنوی حقوق اولاد
۶ ترکیب بند شکوۂ ہند
۷ مجموعہ نظم حالی (۱۴ نظمیں) ۱۸۹۰ء
۸ دیوان حالی
۹ گدایان قوم
۱۰ صدائے گدایان قوم
۱۱ نظم رامپور
۱۲ مرثیہ ملکہ معظمہ مع ترجمہ انگریزی
۱۳ تحفۃ الاخوان
۱۴ فلسفۂ ترقی (ترکیب بند) ۱۹۰۳ء
۱۵ مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت
۱۶ انجمن حمایت اسلام اور اُس کے کام
۱۷ چُپ کی داد
۱۸ قطعہ ترغیب امداد یتیماں
۱۹ نظم ایک چھوٹی بچی کے خصائل
۲۰ شکریہ حضور لفٹنٹ گورنر بہادر از طرف طلبا عربی اسکول دہلی
۲۱ مرثیہ محسن الملک
۲۲ سر سید کے دو رفیق
۲۳ قصیدۂ تہنیت بحضور نظام دکن بموقع جشن چہل سالہ
۲۴ علیگڈھ کالج کیا سکھاتا ہے؟
۲۵ تہنیت مسند نشینی حضور نظام
۲۶ نظم در تعریف حیدر آباد
۲۷ حاضرین کانفرنس سے خطاب
۲۸ شکریہ حضور نظام بموقع امداد علیگڈھ کالج
۲۹ شکریہ مسٹر برود
۳۰ مسٹر مارلین کی روانگی ولایت
۳۱ خطاب بہ حاذق الملک
۳۲ شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خاں
۳۳ افتتاح ندوۃ العلماء
۳۴ تاریخ وفات مولانا آزاد
۳۵ وشکریہ تشریف آوری سر چارلس ایچیسن
۳۶ کُلّیات نظم ونثر فارسی وعربی

علاوہ ازیں متعدد قطعے۔ سات آٹھ غزلیں اور بہت سی رباعیات بھی ہیں جو قطعاً نایاب اور غیر مطبوعہ ہیں

## نثر تصانیف

۱ تریاق مسموم
۲ تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے
۳ طبقات الارض
۴ شواہد الالہام
۵ اصول فارسی
۶ سوانحعمری حکیم ناصر خسرو
۷ مجالس النسا ہر دو حصہ
۸ مولود شریف
۹ حیات سعدی
۱۰ مقدمہ دیوان حالی
۱۱ یادگار غالب
۱۲ حیات جاوید
۱۳ سر سید پر ایک مختصر مقالہ
۱۴ اپنے اُستاد مولانا عبدالرحمٰن کی سوانحعمری
۱۵ مکتوبات حالی دو جلد
۱۶ مضامین حالی
۱۷ ملفوظات حالی (غیر مطبوعہ و غیر مرتبہ)

———*———

# منتخباتِ حالی

خواجہ حالی کی تصانیف اِس دورِ انقلاب میں ادبی تبرکات ہیں اُنکی جس قدر بھی عظمت و عزت کی جائے کم ہے۔اِسی خیال کے بہ نظر صفحاتِ ذیل میں مرحوم کی مختلف تصانیف کے بعض اہم منتخبات نذرِ ناظرین کیے جاتے ہیں

## ہماری شاعری

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے بف نظر علمِ انشا ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے میں جتنے قلی اور نفر ہیں کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویّے امیروں کے نورِ نظر ہیں ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اِس تپِ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقّے نہ ہوں جی سے جائیں گذر سب ہو میلا جہاں گُم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم بہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو تھڑ جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
یہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

عرب جو تھے دنیا میں اِس فن کے بانی نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی

سب اُن کے ہنر اور کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر

ادب میں پڑی جان اُن کی زباں سے
جِلا دین نے پائی اُن کے بیاں سے
سناں کے لئے کام اُنھوں نے لِساں سے
زبانوں کے کوچے تھے بڑھکر سناں سے
ہوئے اُن کے شعروں سے اخلاق صیقل
پڑی اُن کے خطبوں سے دنیا میں ہلچل

خلف اُن کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں
فصاحت میں مقبولِ پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہورِ ہندوستاں ہیں
وہ کچھ ہیں تو لے دے کے اس گوں یہاں ہیں
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں

طوائف کو از بر ہیں دیوان اُن کے
گو تیوں پہ بیحد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے
ثناخواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے
کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال اُنھوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال اُنھوں نے

(مسدس مدوجزر اسلام)

## قوم کے نوجوان

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے
تبہ اُن کی حالت بُری اُنکی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے
کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

سدا گرم انفار سے اُن کی صحبت
ہر اک رند و اوباش سے اُنکی ملت
پڑھے لکھوں کے سائے سے اُنکو وحشت
مدارس سے تعلیم سے اُن کو نفرت
کمینوں کے جرگے میں عمریں گنوانی
اُنھیں گالیاں دینی اور آپ کھانی

نہ علمی مدارس میں ہیں اُن کو پاتے
نہ شائستہ جلسوں میں ہیں آتے جاتے

وہ تکیوں کی رونق ہیں جا کر بڑھاتے پڑے پھرتے ہیں دیکھیے [illegible]
کتاب اور معلّم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچ گانے میں ہیں سب سے آگے

اگر کیجے اِن پاک شہدوں کی گنتی ہوا جن کے پہلو سے بچکر ہے چلتی
ملی خاک میں جن سے عزت بڑوں کی مٹی خاندانوں کی جس سے بزرگی
تو یہ جس قدر خانہ برباد ہوں گے
وہ سب اِن شریفوں کی اولاد ہوں گے

ہوئی ان کی بچپن میں یوں پاسبانی کہ قیدی کی جیسے کٹے زندگانی
لگی ہونے جب کچھ سمجھ بوجھ سیانی چڑھی بھوت کی طرح سر پہ جوانی
بس اب گھر میں دشوار تھمنا ہے اُن کا
اکھاڑوں میں تکیوں میں رہنا ہے اُن کا

نشے میں مئے عشق کے چُور ہیں وہ صفِ فوجِ مژگاں میں محصور ہیں وہ
غمِ چشم و ابرو میں رنجور ہیں وہ بہت ہاتھ سے دل کے مجبور ہیں وہ
کریں کیا کہ ہے عشق طینت میں اُن کی
حرارت بھری ہے طبیعت میں اُن کی

سپوتوں کو اپنے اگر بیاہ دیجئے تو بہوؤں کا بوجھ اپنی گردن پہ لیجئے
جو بیٹی کے پیوند کی فکر کیجئے تو بد راہ ہیں بھانجے اور بھتیجے
یہی جھینکنا کو بہ کو گھر بہ گھر ہے
بہو کو ٹھکانا نہ بیٹی کو بر ہے

نہ مطلب نگاری کا ان کو سلیقہ نہ دربار داری کا ان کو سلیقہ
نہ امیدواری کا ان کو سلیقہ نہ خدمت گزاری کا ان کو سلیقہ
قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
مگر ان کو کس مد میں کوئی کھپائے

(مسدس حالی)

# بیوہ کی فریاد

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑی پکاریں

بہت پڑے باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے

گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں۔ کھلیں بہت برساتیں

پر نہ کھلی، ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

آس ہی کا یہاں نام ہے دنیا
جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا

ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ
جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ

رونا اُن بن باسیوں کا ہے
دیس نکالا جن کو ملا ہے

حکم سے تیرے پر نہیں چارا
کڑوی میٹھی سب ہے گوارا

زور ہے کیا تنکے کا ہوا پر
چاہے جدھر لے جائے بہا کر

تنکا ایک اور سات سمندر
جائے کہاں موجوں سے نکلکر

قسمت ہی میں جب تھی جدائی
پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی

تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا
بندے کا یاں بس نہیں چلتا

مارے اور نہ دے تو رونے
تھپکے اور نہ دے تو سونے

اب تو مارے، خواہ نوازے
پڑی ہوں میں تیرے دروازے

تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں
تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

ماں ہی سدا بچے کو مارے
اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

(مناجات بیوہ)

# عورت ذات

اے ماؤ! بہنو!! بیٹیو!!! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو، ست بیٹھے اپنا کبکا کھو
دنیا میں اے ستونتیو! لے دے کے اب ست تم سے ہے

(مناجات بیوہ)

# اُمید

اے مری امید! میری جاں نواز — اے مری دل سوز! میری کارساز

کاٹنے والی غمِ ایام کی — تھامنے والی دلِ ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دُکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سُکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اُٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس
خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو — عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب — مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

عزم کو جب دیتی ہے تو میلِ جست — گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست
تو نے دیا آ کے اُبھارا جہاں — سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

(مثنوی نشاطِ اُمید)

# ہماری لڑکیوں کی شادیاں

جاہلیت کے زمانے میں تھی یہ رسمِ عرب — کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اسے گود سے لیکر ماں کی — گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن — جو کہ اندھے ہیں ہیئے کے نہیں کچھ اُن کو خبر
لوگ بیٹی کے لئے ڈھونڈتے ہیں جب پیوند — سب سے اول اُنھیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
ایسے گھر بیاہئے بیٹی کو جو ہو آسودہ — اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانے کے سارے زن و مرد — اُن کے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر
ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد — دونوں نزدیک قرابت میں ہوں باہم دیگر
جیتے جی مر گئی بس اُنکی طرف سے گویا — جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر
چھان بین اسکی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو — پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر

بد مزاجی ہو، جہالت ہو، کہ ہو بد چلنی
کچھ بُرائی نہیں، ذ تو نہ تا ہو داماد اگر

وہ بھی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

جاہلیت میں تو تھی ایک ہی آفت کہ جہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر

ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ در گور سدا رہتے ہیں او خستہ جگر

اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

(دیوان حالی)

## غدر کے بعد کی دِلّی

تذکرہ دلّی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

## سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو

موجود سخنگو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخنگو

دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دو نو

## قوم کی حالت

ہو نہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یارو جہاں
واں ترقی کے لئے سب کوششیں ہیں رائیگاں

راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہَوا
جوشِ ہمدردی سے ہوتا ہے جہاز اسکا رواں

قوم تھی یونان کی دنیا میں اک محدود قوم
ہو گئی حبِ وطن سے فخرِ اقوامِ جہاں

ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں
ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں

قوم کس گنتی میں ہے وہ دل نہ ہوں جس کے ملے
گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں

ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا
ہے وہ اک مقتل لہو روتا ہے جس پر آسماں

یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ
ہیں وہ اس مہمانسرا میں کوئی دن کے میہماں

غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودھی اور غلام
رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں

دن بُرے جب آگئے اور باہم لگے سر پھوڑنے
صفحۂ ہستی سے اُن کا مٹ گیا نام و نشاں

(کلیاتِ نظمِ حالی)

## ترقی کی رَو

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر بنی نوعِ بشر
غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر

کر رہا ہے خاک کا پُتلا وہ جوہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر

رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں
طائرِ وہم و تصوّر کے جہاں جلتے ہیں پَر

اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخّر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و بَرّ و دشت و در

حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر

تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویمِ پارینہ وہ سب علم و ہنر

کل کی تحقیقات نظروں سے اُتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دمبدم یوں آجکل علمِ بشر

قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ در بدر

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر

دوستو! شاید وہ نازک وقت آ پہونچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اِک اُٹھتی نظر

رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر

دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پُرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

(کلیاتِ نظمِ حالی)

## فلسفۂ ترقی

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں
خود تنزّل میں ہے سرچشمہ ترقّی کا نہاں

ایک کا ہے جو تنزّل دوسرے کا ہے عروج
اس کا بکتا ہے مکاں تب اس کی چلتی ہے دکاں

کوئی یاں بنتا نہیں جب تک نہ بگڑے دوسرا
گھاس کھُد جاتی ہے جب پڑتی ہے تب کھیتی میں جاں

ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اُڑنے لگی
تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرتِ باغِ جناں

چھچھے مرغِ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب
کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوشِ جاں

جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب ۔۔۔ جب سنو یارو! بگڑتا کوئی گھر یا خانداں
آسماں سے بن کے خوان آتا نہیں اقبال کا ۔۔۔ ہے وہی اک چیز، کل مہماں وہاں تھی آج واں
میزباں کی دیکھتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی ۔۔۔ واں سے اُٹھکر دوسرا جا ڈھونڈھتی ہے میزباں
جانے والا ہے مقرر ان کا گھر غیروں کے پاس ۔۔۔ جو کمر باندھے ہوئے بیٹھے ہیں گھر کھونے کو یاں
قصر و ایواں ہو مبارک تم کو اے محنت کشو ۔۔۔ عیش کے بندے بہت ہو نیکو ہیں بے خانماں
یاد رکھو ہوں گے اب حقدار ان کے جانشیں ۔۔۔ ہاتھ سے حق کھو دئیے اپنے جنھوں نے رائیگاں
ہونگے مزدور اور کمیرے ان کے اب قائم مقام ۔۔۔ پھرتے ہیں بیکار جن کے کودک و پیر و جواں
قوم والو! اے فلک کی گردشوں سے غافلو! ۔۔۔ تم کو رخصت ہی لٹاؤ وقت و دولت رائیگاں
دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے یہ ناز ۔۔۔ ہیں تمھارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں
مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں ۔۔۔ بلکہ ظالم ہیں تمھاری اپنی بداعمالیاں
ہے یہ قانونِ الٰہی، جو کبھی مٹتا نہیں ۔۔۔ گو جگہ سے اپنی ٹل جائے زمین و آسماں

چھٹتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائینگی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی جھڑتی جائینگی

## غزلیں

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا ۔۔۔ رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا
تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں ۔۔۔ ہر خارِ نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا
دروا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز ۔۔۔ چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا
جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ ۔۔۔ ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا
دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال ۔۔۔ اک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا
اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں ۔۔۔ وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا
روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا ۔۔۔ کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا
بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر ۔۔۔ بہرِ نمازِ نعش پہ آنا ضرور تھا
حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں ۔۔۔ تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

## دیگر

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب ۔۔۔ کیمیا کو طلا سے کیا مطلب

# علمی نوٹ اور خبریں

رسالہ "زمانہ" کو مولانا حالی کے دو خاص مضامین شائع کرنے کی عزت نصیب ہو چکی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب آپ سے مضامین کی درخواست کی گئی تو آپ نے جواب میں لکھا کہ تقریباً ایک سال سے پریشانیوں میں اُلجھا ہوا ہوں...... لہٰذا آپ کے حکم کی تعمیل اس وقت ناممکن ہے، لیکن اگر زندگی باقی ہے...... تو "زمانہ" کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھونگا...... "زمانہ" کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان مستثنیٰ رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اُردو لٹریچر کو ناشایستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ "زمانہ" نہ صرف اشاعت میں بلکہ شایستگی اور تہذیب میں بھی روز افزوں ترقی کرے اور جو صلح کُل مسلک اُس نے اختیار کیا ہے اُس سے سرمو تجاوز نہ کرے۔"

---

۱۹۰۶ء کے اوائل میں ایڈیٹر "زمانہ" نے تمام مسلم مشاہیر ہند سے سودیشی تحریک کے متعلق تین سوالات پوچھے تھے اور ان کے جوابات رسالہ "زمانہ" میں شائع کئے تھے۔ سوالات یہ تھے۔

(۱) سودیشی تحریک بذات خود ملک کی ترقی کے لئے کہاں تک مفید ہے، اس کے نشیب و فراز۔ نفع نقصان، اور عملدرآمد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(۲) سودیشی تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے۔ خاص مسلمانوں کے لئے اس سے کہانتک نفع یا نقصان پہونچنے کی اُمید ہے۔

(۳) اس کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، اور اس کامیابی کا ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر ہوگا؟

ان سوالات کے جو جوابات مولانا حالی نے بھیجے تھے رسالہ "زمانہ" جلد نمبر ۲ بابت اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہم یہاں پر مولانا کی صائب اور معقول رائے کا صرف خلاصہ پیش کرتے ہیں، پورا مضمون مقالاتِ حالی حصہ اول مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن اُردو اورنگ آباد میں شائع ہوا ہے۔

**پہلے سوال کا جواب** پہلے سوال کے جواب میں مولانا مرحوم نے یہ لکھا تھا کہ جس قدر تحریکیں ابتک ہندوستان کی بھلائی کے لئے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں میرے نزدیک اُن میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہونچنے کی امید ہو سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی ہے..............

مولانا مرحوم نے یہ بھی رائے دی تھی کہ اس تحریک کا تقسیم بنگالہ یا کسی اور سیاسی مسئلہ سے تعلق نہ ہونا چاہیئے، بلکہ مستقل حیثیت سے بطور خود اس کو جاری کرنا اور ترقی دینا چاہیئے۔

**دوسرے سوال کا جواب** | ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلق رکھتا ہو اشد ضرورت ہے، اور جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ویسی ہی مسلمانوں کے حق میں مفید ہے۔

**تیسرے سوال کا جواب** | اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا رہیگا۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہوگیا ہے جس راستہ سے ملک کی دولت غیر ملکوں کو کھنچی چلی جاتی ہے۔ مگر اس راستے کا بند کرنا کوئی معمولی کھیل نہیں۔ اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اُس کو بہت جلد کامیابی ہوئی۔

---

اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء ہی میں مولانا مرحوم نے سر سید احمد خاں پر اپنا ایک بسیط مضمون "زمانہ" کو مرحمت فرمایا تھا جو اسی سال جون یا جولائی نمبر میں شائع ہوا۔

---

"زمانہ" پر مولانا حالی کا ایک اور احسان عظیم یہ ہے کہ ملک کے نامور ادیب و محقق مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی سے اسکا تعارف کرا دیا، چنانچہ آپ نے شاہنشاہ اکبر پر اُن کا محققانہ مضمون اس کے لئے حاصل کرکے بھیجا۔ یہ مضمون بھی سنہ ۱۹۱ کے زمانہ میں شکریہ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

---

مولانا حالی کے صد سالہ یادگاری جشن کے سلسلہ میں سب سے بڑا جلسہ اعلیحضرت ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی صدارت میں آخر ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مولانا کے خاص مولد و منشا پانی پت میں منعقد ہوا جس میں ملک کے بڑے بڑے معززین موجود تھے۔ اعلیحضرت نواب صاحب نے بیس ہزار کی گراں قدر امداد حالی میموریل اسکول کے لئے منظور فرمائی اور وزرائے بھوپال اور گورنمنٹ پنجاب نے بھی ایک ایک ہزار کی رقم اس موقعہ پر اس اسکول کو دی۔

پانی پت کے علاوہ اورنگ آباد دکن، کلکتہ، مدراس اور بریلی وغیرہ میں بھی مولانا کی یادگار میں جلسے منعقد ہوئے۔

اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج کے استادوں اور طالبعلموں نے عالیجناب رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نائب صدر اعظم و صدر المہام فینانس دولت آصفیہ کی زیر صدارت یوم حالی کا جشن منایا جس میں مولانا کے متعلق کئی قابل قدر مضامین پڑھے گئے اور ان کا ایک دلچسپ مجموعہ بھی "یادِ حالی" کے نام سے جامعہ پریس دہلی سے شائع ہوا ہے۔

---

کلکتہ میں مولانا حالی کے یوم ولادت کا صد سالہ جشن ۱۵ دسمبر ۱۹۳۵ء کو ینگ انڈیا ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام مسٹر فضل الدین کی صدارت میں منایا گیا۔ ڈاکٹر ایس۔ کمار چٹرجی پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی نے مولانا مرحوم کے ذاتی اوصاف بیان کرتے ہوئے انھیں انسانیت کو بلند پایہ پر لانیوالا شاعر اور وطن پرستی کے جذبات ابھارنے والا ادیب قرار دیا۔ پروفیسر نظر علی نے فرمایا کہ مولانا حالی کی رہنمائی ہندوستان کے مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کا موجب بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر کالیداس ناگ نے بھی مولانا مرحوم کے ذاتی اوصاف بیان کئے۔ مدراس اور دہلی کے یادگاری جلسوں میں مولانا محوی لکھنوی اور مولوی محمد عبدالشافع صدیقی نے جو نظمیں پڑھیں وہ اس رسالہ میں ہدیۂ ناظرین ہیں۔

---

اُردو رسالوں میں معصر جامعہ دہلی، اور پیام تعلیم نے مولانا حالی پر کئی خاص مضامین اور تصویریں شائع کیں۔ معصر "الناظر" لکھنؤ نے اس جشن کی یادگار میں مولانا حالی کی جملہ اُردو تصانیف کے خاص ایڈیشن کی اشاعت پر زور دیا ہے۔ یہ تجویز بہت ضروری اور اہم ہے۔ اور سچ پوچھیئے تو اس جشن کی اصلی یادگار یہی ہے کہ مولانا موصوف کی تمام تصانیف کے مختلف اچھے اچھے ایڈیشن شائع کئے جائیں۔ بڑی بڑی کتابوں کے خلاصے اور چھوٹی چھوٹی تصانیف کے سستے ایڈیشن طبع ہوں تاکہ ہر اُردو خواں شخص آپ کے ادبی احسانات سے لطف اور نفع اٹھا سکے۔

---

مسدس حالی کے بہت سے متفرق نسخے نہایت اہتمام و انتظام کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ رباعیات کے بھی کئی اعلیٰ ایڈیشن نکل چکے ہیں سب سے پہلے کانپور کے منشی رحمت اللہ صاحب رعد مرحوم نے اپنے مشہور نامی پریس میں مسدس اور رباعیات کو خاص انتظام سے شائع کیا تھا۔ کئی سال ہوئے انتظامی پریس کانپور نے بھی مسدس حالی کو خاص انتظام سے آرٹ پیپر پر پاکٹ سائز میں چھاپا تھا اور مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے لئے ایک مفصل تمہید لکھی تھی۔ اس جشن کے سلسلے میں بھی قابل قدر ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے جو غالباً مولانا حالی کی صد سالہ جشن ولادت کی یادگار میں قائم ہوا ہے صدی ایڈیشن کے نام سے مسدس کا ایک نہایت شاندار ودلآویز ایڈیشن شائع کیا ہے۔ جس میں مولانا حالی اور سرسید احمد خاں کی تصویروں کے علاوہ سرسید اعظم کے تاریخی خط کا فوٹو اور مولانا حالی کی تحریر کا عکس، فرہنگ الفاظ وغیرہ سبھی کچھ ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت دلکش ہے۔ جلد بھی انگریزی وضع کی نہایت خوبصورت ہے۔ قیمت بہترین جلد کی دو روپیہ اور معمولی جلد کی صرف ایک روپیہ ہے۔ حجم ۲۴۰ صفحات ہے۔ شائقین اسے حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی یا زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرما سکتے ہیں۔"

---

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کلام حالی کے پرانے عاشق ہیں۔ چنانچہ حالی بک ڈپو پانی پت کی طرف

سے آپ نے جشن صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ رباعیات حالی کا ایک مکمل مجموعہ پاکٹ سائز میں آرٹ پیپر پر شائع کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ میں بہت مدت سے ان رباعیوں کی تلاش میں مصروف تھا۔ نہ معلوم کتنے پرانے اخبارات کے اوراق اور قدیم رسالوں کے فائل مجھے دیکھنا پڑے۔ لیکن میں نے استقلال وصبر کے ساتھ تلاش جاری رکھی اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔"

آپ نے شائع شدہ رُباعیات کے علاوہ اس خوبصورت مجموعہ میں وہ تمام رُباعیاں بھی شامل کردی ہیں جو مولانا حالی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اُن کے قلمی مسودات میں ملی ہیں۔ یہ رباعیاں پہلی دفعہ اس ایڈیشن میں چھپی ہیں۔ اِس مجموعے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ تمام رُباعیاں دیوانِ حالی کے اُس نسخہ کے مطابق لکھی گئی ہیں جو مولانا کے استعمال میں رہتا تھا۔ اور جسمیں وہ اپنی وفات کے وقت تک ترمیم وتنسیخ کرتے رہے آمیں مولانا مرحوم کی فارسی رُباعیاں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ ایڈیشن عام قدردانی کا مستحق ہے قیمت دو روپیہ ہے، جو اس کی خوبصورت لکھائی چھپائی اور مضبوط و نفیس جلد کے دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں ہے۔

---

شیخ محمد اسماعیل صاحب نے "تذکرہ حالی" کے نام سے شمس العلما مولانا حالی کی سوانحعمری بھی شائع کی ہے جسمیں مولانا موصوف کی لائف، تصنیفات اور عادات و اخلاق کا مختصر بیان ہے اور اُن کی تصویر بھی ہے۔ یہ تذکرہ بھی پاکٹ سائز پر آرٹ پیپر پر نہایت تزک و اہتمام کے ساتھ ۷۶ صفحات پر شائع کیا گیا ہے لکھائی چھپائی بھی بہت صاف اور خوبصورت ہے ۔ کاغذ آرٹ پیپر استعمال ہوا ہے اور کتاب مجلد ہے قیمت دو روپیہ یہ تذکرہ بھی شایقین ادب کی قدردانی کا مستحق ہے۔

---

مولانا حالی کی تصانیف میں "حیات جاوید" یعنی حیات سرسید کو ایک خاص درجہ حاصل ہے، مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آجکل یہ کتاب ناپید ہوگئی ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ حالی پبلشنگ ہاؤس یا حالی بکڈپو اس کو جلد سے جلد شائع کرنے کی کوشش کریگا، ورنہ انجمن ترقی اُردو کو اس کی اشاعت اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔

مولانا کے خطوط کا ایک مختصر ایڈیشن بھی نکلنا چاہیئے۔ ان کے صاحبزادہ خواجہ سجاد حسین صاحب نے مکتوبات حالی کی جو دو جلدیں ۱۹۲۵ء میں شائع کی تھیں اُن کی لکھائی چھپائی اور کاغذ وغیرہ بہت معمولی ہے، ابضرورت ہے کہ عنقریب ہی مکتوبات حالی کا ایک عمدہ اور مختصر ایڈیشن شائع ہو۔ طالبعلموں کیلئے مضامین حالی، حیات جاوید، خطوط حالی وغیرہ کے خاص ایڈیشن علحدہ مرتب ہونا چاہیئے۔ اس میں پہل الہ آباد کے مشہور پبلشر رائیصاحب لالہ رام دیال اگروال نے کی ہے جنھوں نے اُردو طالبعلموں کے لئے "یادگار غالب" کا مختصر ایڈیشن شائع کیا ہے جس کی ترتیب، خلاصہ، فرہنگ وغیرہ کا کام ایڈیٹر "زمانہ" نے کیا ہے۔

---

**بیوہ** (مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی تازہ تصنیف)
اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور ان کی ترغیبات پر بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں، انکے ساتھ ہی اس مسئلہ کے حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ عمر

**حیات بیوہ** جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور ان کی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۵ر

**طریق دولتمندی** دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتلائے گئے ہیں قیمت ۸ر

**گرگرہستی** (مصنفہ مولوی سید شبیر حسن صاحب مرزا پوری مولوی فاضل) اس کتاب کے اندر قصہ اور مکالمہ کے پیرایہ میں عورتوں کو اچھی بیبیاں، اچھی مائیں اور رفیقۂ حیات بننے کی تعلیم دی گئی ہے، ہر عمر کی عورتوں کو دلچسپ قصوں اور دلنشین مثالوں کے ذریعہ سے جملہ امور خانہ داری، اخلاق معاشرت سکھائے گئے ہیں، یہ بےنظیر کتاب اس قابل ہے کہ لڑکیوں کو جہیز میں دیجائے کوئی شریف بی بی اور کوئی شریف گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ ہز ہائینس نواب بیگم صاحبہ کی سرپرستی میں یہ کتاب تیار کیگئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ۔ عہ

**مرقع ادب** حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعراء کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انہوں نے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں۔ حصہ اول کی قیمت ۱۲ر حصہ دوم ۱۲ر

**اردو مضمون نویسی** مضمون لکھنے کے متعلق جناب بابو نانک پرشاد بی اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع

خوبیت وسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ قیمت ۱۰ر

**تاریخ ہند (عہد اسلامی)** غلام محمد اے شیخ نے ہندوستان کے عہد اسلامی کی یہ مختصر تاریخ طلبائے سکول و کالج کے نفع رسانی کے لئے انگریزی زبان میں تحریر فرمائی ہے ضخامت اندازاً دو سو صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ..... عمر

**اثرستان** مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخانصاحب اثر لکھنوی کا دیوان جسکا ہر مصرعہ پرتاثیر و نشتر ہے۔ قیمت ایکروپیہ عہ

**انتخاب حسرت** مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا انتخاب دو ہسپر جلیل کے قلم کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے قیمت عمر

**مثنوی سحر** یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ سحر ہتگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز دوسرا ایڈیشن جسکی مصنف نے نظر ثانی کی ہے قیمت آٹھ آنے ۸ر

**نقش و نگار** جلیل قدوائی صاحب کی دل آویز پرلطف نظموں و غزلوں کا مجموعہ جلیل صاحب کی نظم میں بھی وہی شان ہے جو انکی پاکیزہ و پرسحر نثر میں ہے قیمت عمر

**دنیائے راز** ابوالفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ نظم لحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز مع تصویر مصنف قیمت

**لسان الغیب** جلد اول و دوم حضرت حافظ شیرازی کے دیوان کی مکمل شرح ہے جسکو نہایت صاف سلیس زبان میں میر ولی اللہ نے مرتب کیا ہے حافظ کے کلام کے شائقین کیواسطے عجیب تحفہ ہے حصہ اول تین روپے ہے، دوم دو روپیہ - عللہ

**بہار سخن** بابو شیام سندر لال صاحب برق ایڈوکیٹ سیتاپور کا لاجواب اور تاریخی تذکرہ جسمیں نہایت تلاش اور تجسس سے ۸۶۶ ہندو شعراء کے حالات مع سوانح حیات و منتخب کلام درج ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے جس سے فہرست دیکھتے ہی فوراً شاعر کا حال معلوم ہوجاتا ہے پرائیویٹ کتبخانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کی چیز ہے عگ

## چند قابل دید کتابیں

**جرمنی کی قومی بیداری** یہ کتاب ایک غیر جرمن نے جرمنی میں مدتوں رہکر جرمن قوم و ملک کے حالات و واقعات بچشم خود معائنہ کرکے جنیوا سے فرانسیسی زبان میں شایع کی تھی بعد ازاں انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے شایع کی گئی ہٹلر کے مفصل حالات اور جرمنی کی داخلی خارجی پالیسی معلوم کرنیکے لئے یہ ایک لاجواب کتاب ہے چند فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔ قیمت صرف بارہ آنے ۱۲/

**خیالات مہاتما گاندھی** (حصہ اول و دوم) یہ لاجواب کتاب ہے کہ جس میں مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے موجودہ دنیا کے انسان اعظم مہاتما گاندھی کے مذہبی سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کرکے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ۔

**ملنے کا پتہ منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور**

## آزاد

**کیا آپ نے** اردو کا ہفتہ وار اخبار **آزاد** ملاحظہ فرمایا ہے؟ جو ہفتہ کانپور سے ایڈیٹر صاحب "زمانہ" کی نگرانی میں شایع ہوتا ہے؟ صرف تین روپے میں آپ ضروری خبروں اور واقعات کے بہترین مجموعہ کو سال بھر تک دیکھ سکتے ہیں!۔
اس قیمت پر اسقدر دلچسپ مفید اور کہیں آپ نہ پائینگے۔

**منیجر آزاد کانپور سے طلب فرمائیے**

## اردو ادب میں انقلاب

**خاتم السلاطین مرزا سراج الدین**

**محمد بہادر شاہ ظفر**

**کے**

**سوانح حیات اور شاعری پر**

**بے لاگ تبصرہ**

ہندوستان کے مشہور ادیب منشی محمد امیر احمد علوی بی اے کے قلم سے ملاحظہ کیجئے۔ قیمت عہ

**ملنے کا پتہ زمانہ بک ایجنسی کانپور**

## زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۰۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں "زمانہ" کے دیکھنے والے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین و مشہور رسالہ تیس سال سے اردو زبان و ادب کی کسقدر مسلسل خدمت کر رہا ہے اسکے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل کبھی بیکار نہیں ہوتے، وہ لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں ہم چاہتے ہیں کہ شایقین ان سے محروم نہ رہیں اسلئے پرانے فائلوں کے خریداروں سے حسب ذیل رعایت کیجائیگی
(۱) نو سال کے مکمل سیٹ کے خریدار سے ۲۰ روپیہ معہ محصول
(۲) چار سال کے یکجائی خریدار سے علاوہ محصول ۲ فی سال،
(۳) ایکسال کے فائل خریدنے والے سے صرف للعہ لئے جائینگے
چند فائل باقی ہیں شایقین جلد منگا لیں۔ منیجر زمانہ کانپور

# حلق کی سوزش اور دُکھن نیز پھیپھڑوں کی تمام خستگیوں کو دور کیجئے۔

## پیپس استعمال کیجئے



حلق کی سوزش یا سینہ اور پھیپھڑوں کی دیگر شکایتوں کے مریض پیپس کی ٹکیوں کو ایک عجیب وغریب دوا پائیں گے، یہ سانس کے ذریعہ آرام پہونچانیوالی جراثیم کش ٹکیاں، اپنی چھوٹی اور ٹھوس صورت میں کوہستانی ہوا کی تمام صحت بخش خاصیتیں رکھتی ہیں۔ جن سے مریضوں کو بہت فائدہ پہونچتا ہے، منہ میں گھلتے ہی پیپس کی ٹکیہ سے بیش قیمت صحت بخش ابخرے خارج ہونے لگتے ہیں، جو سانس کی ہوا کے ساتھ براہ راست پھیپھڑوں میں پہونچتے ہیں، اگر سینہ جکڑا ہوا ہو اور سانس لیتے ہوئے دم گھٹتا ہو پیپس ان شکایتوں کو دور کرکے تنفس کو آسان کردیتی ہے وہ مضر جراثیم کو ہلاک کرتی ہیں، حلق کو تسکین دیتی ہیں۔ دم گھونٹنے والا بلغم اکھاڑ کر نکال دیتی ہیں۔ اور سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہیں۔




تمام دوا فروشوں سے ایک روپیہ فی شیشی ملتی ہے۔

ایجنٹ۔ مسرز اسمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کو لمیٹڈ کلکتہ۔

**سانس کے ذریعہ شفا دینے والی جراثیم کش عجیب وغریب ٹکیاں۔**

# پیپس

PEPS